آج

٦٩

طاہر بن جلون — مارگریٹ ایٹ وُڈ

ہالینا پوزوِیاتوسکا — عبداللہ صالحی

نیر مسعود — چودھری محمد نعیم

سعید الدین — احمد آزاد

ترتیب:

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 69

جنوری 2011

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

سلمان تاثیر

کی یاد میں

جنھوں نے اپنی جان دے کر

مکالمے کا بند دروازہ کھول دیا

Scanned with CamScanner

ترتیب

طاہر بن جلون

7

کرپشن

(ناول)

❁

مارگریٹ ایٹوڈ

153

عورت جسے کھایا جاسکتا ہے

(ناول کی تلخیص)

❁

Scanned with CamScanner

ہالینا پوزوِیاتوسکا

223

ہمیں بہت سے آسان لفظ چاہییں   بلاعنوان

ایک رزمیہ داستان   بلاعنوان

❉

عبداللہ صالحی

232

جل وولوز   تمھارا شکریہ   المقامر

❉

نیر مسعود

237

ڈھول بن

❉

چودھری محمد نعیم

259

اردو شاعری کی سرپرستی

289

شرر کا گذشتہ لکھنؤ

Scanned with CamScanner

311

آداب کی پابندی بمقابلہ انفرادیت

❁

سعید الدین

341

یہ سب تو　　کئی پہاڑی　　درباری مغنی　　خوبصورت موزے

جب تیز بھوک لگی ہو　　کہانیاں　　تنکا　　اجازت

ٹریپ　　نظم　　معصومیت　　چاقو کا دستہ

❁

احمد آزاد

360

جو میرے مرنے کا تماشا نہیں دیکھنا چاہتی

خزاں کے آتے آتے　　یہاں لکھنا منع ہے

وہی درندہ　　تنہائی

❁

Scanned with CamScanner

طاہر بن جلّون

کرپشن

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

اہر بن جلون (Tahar Ben Jalloun) مراکش سے تعلق رکھتے ہیں اور شمالی افریقہ کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو فرانسیسی میں لکھتے ہیں اور فرانسیسی ادب کے بڑے دھارے میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ مراکش کے شہر فاس میں 1944 میں پیدا ہوے۔ اٹھارہ برس کی عمر تک طنجہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رباط کی محمد خامس یونیورسٹی میں فلسفے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ طالب علمی کے دنوں میں وہ نظمیں لکھنے لگے تھے۔ 1971 میں انھوں نے اس بنا پر مراکش چھوڑ دیا کہ فلسفے کا ذریعہ تعلیم عربی کو بنا دیا گیا تھا جبکہ انھیں فرانسیسی ہی میں پڑھانے کی خواہش تھی۔ پیرس جا کر انھوں نے نفسیات میں مزید تعلیم حاصل کی اور زیادہ سرگرمی سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے متعدد ناول اور دیگر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

1994 میں شائع ہونے والے ناول کرپشن کا محل وقوع کاسابلانکا (دارالبیضا) اور طنجہ کے مراکشی شہر ہیں۔ اس میں جدید دور کی اخلاقیات کی جو اندرونی تصویرکشی کی گئی ہے اس کا موازنہ البیر کامیو کے ناول اجنبی (*The Stranger*) سے کیا گیا ہے۔ اس ناول میں، جو فرانسیسی میں *L'Homme Rompu* کے نام سے چھپا اور جس کا عربی ترجمہ **المرتشی** کے عنوان سے شائع ہوا، مرکزی کردار مراد کو، جو ایک دیانتدار شخص ہے، سماجی دباؤ کے زیر اثر اپنے اندر رفتہ رفتہ لچک پیدا کرتے اور یوں کرپشن کی ترغیب میں مبتلا ہوتے ہوے دکھایا گیا ہے۔ ناول کا قصہ چند ایسے واقعات کے سلسلے پر مشتمل ہے جو تیسری دنیا کے کسی بھی ملک، خصوصاً مسلمان آبادی والے ملک کے لیے قطعی نامانوس نہیں۔ تاہم، طاہر بن جلون کی فنی چابکدستی اور تخلیقی گہرائی کے باعث یہ ناول اپنے مرکزی کردار کی شخصیت میں آنے والی بنیادی تبدیلی کی نہایت پراثر عکاسی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں مراد ایک ایسا کردار بن کر ابھرتا ہے جو عام ہونے کے باوصف کئی اعتبار سے منفرد ہے، اور اس کی اندرونی کشمکش اس قسم کے ہر سماج کے بنیادی بگاڑ کا عکس بن کر سامنے آتی ہے۔

Scanned with CamScanner

میں اس کتاب کے لیے ایک عظیم انڈونیشی قلم کار پرمودیا اننتا تور(PramoedyaAnanta Toer) کا رہین منت ہوں جو فی الوقت جکارتا میں پولیس کی کڑی نگرانی میں زندگی گزار رہے ہیں اور جنھیں اپنی نگارشات کی اشاعت سے روک دیا گیا ہے۔

انڈونیشیا وارد ہونے کے بعد میں نے ان سے ملاقات، ان کے لیے اپنی حمایت اور تحسین کے اظہار کی کوشش کی۔ مجھے ان سے نہ ملنے کی صلاح دی گئی؛ میری ملاقات سے ان کے لیے پریشانیاں کھڑی ہونے کا احتمال تھا۔

دورانِ قیام، میں نے ان کا ناول، *Corruption* (جس کا فرانسیسی ترجمہ Denys Lombard نے کیا ہے اور جو Editions Philippe Picquier سے شائع ہوا ہے) پڑھا۔ یہ انڈونیشیا میں 1954 میں طبع ہوا تھا۔ ایک لکھنے والے کی دوسرے لکھنے والے سے حمایت اور اس کے خراج عقیدت کے طور پر میں نے اپنا یہ ناول لکھا (جس کا عنوان میں نے شروع میں *L'Homme Rompu* رکھا تھا)، جو 'کرپشن' کے بارے میں ہے، ایک مرض جو آج جنوب میں بھی اتنا ہی عام ہے جتنا شمال میں۔

کہانی کا محلِ وقوع حاضرہ مراکش ہے۔ دوسرے آسمانوں کے نیچے، ہزاروں میل دور، ایک جیسی مصیبتوں سے مضمحل انسانی روح ایک جیسے ہی بلاؤں کے سامنے سپر انداز ہوجاتی ہے۔

طاہر بن جلون

Scanned with CamScanner

حسب معمول بس کے آنے میں دیر ہوگئی ہے، اور جب پہنچتی ہے تو ٹھسا ٹھس بھری ہوئی۔ مراد اپنی گھڑی پر نظر ڈالتا ہے۔ یا تو دھکم دھکا کر کے بس میں سوار ہو جائے، اور اس عمل میں چند لوگوں کے پیر کچل دے، یا دوسری بس کے آنے کا انتظار کرے اور دفتر دیر سے پہنچنے کا خطرہ مول لے۔ مراد، بہر حال، ہمیشہ ہی وقت پر پہنچ جاتا ہے، اعصاب زدگی سے زیادہ اصول پرستی کے باعث۔ دو صورتیں اختیار میں اور ہیں: کام پر جانے کے لیے ٹیکسی لینا — جس پر دس درہم لگیں گے، یعنی کا سا سپورٹس بلیو سگریٹ کے دو پیکٹوں کی قیمت — یا پیدل چل دینا اور ہانپتے ہوئے دفتر پہنچنا۔ ادھر وہ تمباکو نوشی تج دینے کی خواہش کرتا رہا ہے، اپنے پھیپھڑوں پر رحم کرنے سے زیادہ پیسے بچانے کی خاطر۔ آخری طبی معائنے کے موقعے پر دفتری ڈاکٹر نے کہا تھا، ''تمباکو نوش ہونے کے حساب سے تمھارے پھیپھڑے صاف ستھرے ہیں۔'' بس یہی تو وہ سننا چاہتا تھا۔ لیکن زیادہ تیز چلنے یا سیڑھیاں چڑھنے سے اس کا سانس پھول جاتا ہے؛ یہ وہ بات ہے جو ڈاکٹر کو دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ وہ ٹیکسی لینے کا فیصلہ کرتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اب کبھی سگریٹ نہیں خریدے گا۔

ڈرائیور خراب موڈ میں ہے۔ وہ بار بار اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے باہر سڑک پر تھوکتا ہے، صلواتیں سناتا ہے۔ مراد کی ہمت نہیں پڑتی کہ پوچھے، آخر کس بات پر اتنے طیش میں ہے۔ وہ اپنے سے باتیں کر رہا ہے، پھر مڑ کر مراد سے کہتا ہے، ''دس سال سے یہ ٹیکسی میرے پاس ہے، لیکن یقین کرو گے کہ ابھی تک اس آدمی کا دوزخ بھرے جا رہا ہوں جس نے اس کا لائسنس دلوایا تھا؟ حرامزادہ! قرضہ اتارنے کے لیے صبح شام جان گھس رہا ہوں۔ اس سے ملنا چھوڑ دیا، حرامزادے سے۔ اسے اپنے پیسے مل گئے، لیکن ابھی چچا کا قرضہ چکانا باقی ہے۔''

Scanned with CamScanner

راستے میں مراد اپنا یومیہ حساب کتاب کرتا ہے۔ ''ٹیکسی، دس درہم؛ دوپہر کا کھانا، تینتیس درہم؛ پانچ درہم قہوے کے لیے؛ پانچ سگریٹوں کے؛ بچپن واسط کی جغرافیے کی کتاب کے لیے؛ پھر کم از کم سو درہم ننھی کریمہ کو ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے، جس میں دوا کی قیمت شامل نہیں ہے۔ بنیادی بات ہے، میں ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ مجھے معلوم ہے، ہمیشہ کی طرح، اور بھول بھی جاؤں تو کیا، میری بیوی حلیمہ جو بیٹھی ہے یاد دلانے کے لیے۔''

دفتر میں، شاوش —— چپراسی —— بمشکل سلام کرتا ہے۔ یہاں سلام علیک کی گرمجوشی کا دارومدار آپ کے رتبے پر اتنا نہیں ہوتا جتنا اس پر کہ کام سے آپ کی اضافی آمدنی کتنی ہوتی ہے۔ مراد ایک انجینئر ہے۔ انتظامیہ میں اس کی ذمے داری تعمیری نقشوں کا معائنہ کرنا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر تعمیر کا اجازت نامہ نہیں ملتا۔ یہ اہم اور بڑی باعثِ رشک حیثیت ہے اور بڑا رعب دار لقب رکھتی ہے: ''ڈپٹی ڈائرکٹر برائے منصوبہ سازی، مستقبلی امکانات اور ترقی —— ظاہر ہے، اس کا انجینئر کا رتبہ، جس کے لیے اس نے اپنی سبق آموزی کا جزوی حصہ ایک فرانسیسی اسکول میں پورا کیا تھا، پھر اس کی معاشیات میں بی اے کی ڈگری، جو رباط میں دانش گاہِ محمد خامس سے حاصل کی، ان سب کا اعتراف، بہر حال، ضروری ہے۔ اپنی واجبی سی تنخواہ پر وہ اپنے خاندان کی کفالت کرتا ہے، مکان کا کرایہ اور بچوں کے اسکول کے اخراجات پورے کرتا ہے، اور اپنی ماں کی ضروریات کا انتظام بھی کرتا ہے۔ لیکن گزارہ پھر بھی نہیں ہو پاتا۔ زندگی قرض پر گزر رہی ہے، پرچون فروش کا احسان، اور وہ خوب جانتا ہے کہ تیسری اولاد کی گنجائش نہیں۔ لوگ جو چاہیں کہتے پھریں —— کہ ہر ولادت ایک منفعت ہے، کہ خدا اپنی مخلوق کی تمام حاجات پوری کرتا ہے —— مراد اس معاملے میں بالکل اٹل ہے، اور مزید بحثا بحثی کا خاتمہ کرنے کے لیے اس نے اصرار کیا کہ حلیمہ IUD استعمال کرنا شروع کر دے۔ بس تبھی حلیمہ نے پیچ و تاب کھا کر کہہ دیا؛ ''تمھارا اسسٹنٹ ہی مرد آدمی ہے۔ تم سے کم کماتا ہے لیکن شاندار گھر میں رہتا ہے اور پاس دو کاریں ہیں۔ اس کے بچے فرانسیسی مشن اسکول جاتے ہیں، اور وہ اپنی بیوی کو بھی چھٹیاں منانے روم لے جاتا ہے! اور تم مجھے کیا دیتے ہو؟ یہ IUD اور ہفتے میں صرف دو مرتبہ گوشت! یہ کوئی زندگی ہے؟ اور ہم چھٹیاں کہاں گزارتے ہیں؟ تمھاری ماں کے

Scanned with CamScanner

ساتھ، فاس کے پرانے شہر کے اُس بوسیدہ گھر میں! — تم اسے چھٹیاں گزارنا کہتے ہو؟ تمھیں کب پتا چلے گا کہ ہماری زندگی کتنی خستہ حال ہے؟''

''میری زندگی خستہ حال سے بھی بدتر ہے،'' وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے۔ ''کیا یہ میرا قصور ہے کہ ہر چیز ترقی کر رہی ہے، پیسے والے اور بھی زیادہ دولت مند ہوتے جا رہے ہیں، جبکہ مجھ جیسے غریب اپنی غربت میں جامد پڑے ہیں؟ کیا یہ میرا قصور ہے کہ خشک موسم نے ناداروں کو اور زیادہ نادار کر دیا ہے؟ میں کیا کروں؟ چوری چکاری؟ کیا لوگوں کو غچہ دے کر ان کی املاک ہتھیا لوں، انھیں یہ یقین دلا کر کہ عمارتوں میں سرمایہ لگانا گھاٹے کا سودا ہے؟''

وہ یہی سب سوچ رہا ہے کہ اس کا اسسٹنٹ، حاج حمید، سیٹی بجاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

''صبح بخیر، باس! رات اچھی گزری؟''

''ٹھیک ہوں، شکریہ۔''

اس آدمی کی جو بات اسے سب سے زیادہ نفرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ اس کا غرّہ اور مسکراہٹ ہے، جس میں سازباز کا دزدیدہ تاثر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ دونوں دفتر کے ایک ہی کمرے میں کام نہیں کرتے — ایک کھڑکی دار دروازہ دونوں کو الگ کرتا ہے — یہ آدمی اسے پھر بھی برافروختہ کر دیتا ہے۔ اسے اس کا میٹھی باس والا کولون ناپسند ہے۔ اس کی مہک سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے اپنی کھڑکی کھولنی پڑتی ہے۔ جب وہ کچھ لکھتا ہے تو اس وقت اس کی کلائی کی زنجیر کی جھنجھناہٹ بھی اسے ناگوار گزرتی ہے۔ حاج حمید مہذب اور شائستہ آدمی کی ضد ہے: غالباً اس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی، اگرچہ ہر صبح گھنٹہ بھر خبریں ضرور پڑھتا ہے۔ مراد کو تعجب ہوتا ہے کہ کوئی اس طرح خالی خولی اخبار پڑھنے میں بھی اتنا وقت برباد کر سکتا ہے۔ شاید وہ پڑھتا نہ ہو، صرف پڑھنے کا ڈھونگ رچاتا ہو۔ گاہے بگاہے وہ بلند آواز میں تبصرہ کرتا ہے، کچھ اس قسم کا: ''صدام، واہ صاحب، کیا آدمی ہے!'' مراد کا جی چاہتا ہے کہ جواب دے، مثلاً یہ کہے، ''جو اپنے لوگوں کو مسلسل آٹھ سال تک ذبح ہونے کے لیے ایران میں جھونک دیتا ہے، پھر اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ آدھے سیارے سے جنگ ہو جائے، یہی ہے نا تمھارا مثالی آدمی کا تصور؟'' لیکن نہیں، وہ خاموش رہنے کو

Scanned with CamScanner

ترجیح دیتا ہے، پھر یہ کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ اگر وہ حاج حمید سے بخشا شروع کر دے تو پھر انتہا تک جانا پڑ جائے گا، کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرنا ہوگا۔ بہت سی چیزیں اس کی توجہ میں آتی ہیں لیکن وہ ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے، مثلاً جیسے مسٹر حکیم کا ملاقات کے لیے آنا، جو ایک صاحبِ دولت زمیندار ہے، اور جو تشبیہوں اور اشاروں کنایوں میں بات کرنا پسند کرتا ہے۔ اکثر بڑے خطیبانہ انداز میں ضرب الامثال دہراتا ہے، جن میں سے بعضی دلآویز اور معمائی ہوتی ہیں، جیسے، ''مینار لڑھکا، حجام کو پھانسی''، یا، ''ہاتھ کاٹ نہ سکو تو چوم لو۔'' مراد جانتا ہے کہ دفتر کے باہر سودے طے ہو رہے ہیں۔ مسٹر حکیم یہاں صرف نمائش کے لیے ہی آتا ہے، دستاویزات لانے اور لے جانے کے لیے؛ یہ حکمت عملی مراد کی پژمردہ تاہم چوکنی نگاہ سے مخفی نہیں رہتی۔ اس پر تحفے تحائف مستزاد — گیہوں کی بوریاں، پھلوں کی پیٹیاں، بقرعید پر بھیڑیں۔ یہ سب کچھ گاؤں والوں کی فیاضی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حاج حمید اس قسم کے تحسینی اظہار کی بڑی قدر کرتا ہے، جو یوں چٹ پٹ کیے جاتے ہیں، کسی صلے کی پروا کیے بغیر۔ نہ کوئی مخبری ہوتی ہے، نہ الزامات لگائے جاتے ہیں، نہ خفیہ رپورٹیں کی جاتی ہیں۔ بہر حال، اس کا کوئی ثبوت تو ہوتا نہیں۔ کرپشن، اپنی اصل میں، فوری طور پر سامنے نہیں آتا، الاّ یہ کہ دام بچھایا جائے، لیکن مراد اس معاملے میں حسب ضرورت زیرک نہیں ہے۔ اس میں سپاہیانہ روح مفقود ہے، چاہے وہ ملک کو اس قسم کی حرکتوں سے کتنا ہی پاک وصاف کیوں نہ کرنا چاہتا ہو۔ ٹھیک ہے، وہ باس ہے، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس کی طاقت واختیار کو خطرہ لاحق ہے۔ ٹھیک ہے، وہ کاغذات پر دستخط کرتا ہے، لیکن کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ زبانی طور پر، پیٹھ پیچھے، دوسرے سودے نہیں ہو رہے ہیں؟ اس کے لیے حاج حمید کا دن رات پیچھا کرنا ہوگا، ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دینا ہوگا۔ نہیں، یہ ناممکن ہے۔ خوش قسمتی سے دونوں ایک ہی کمرے میں نہیں ہیں۔ حاج حمید بڑا بیزار کن، خود مطمئن، اور خود بین آدمی ہے۔

مراد کو اس مصری سپاہی کا قصہ یاد آتا ہے جس نے فیصلہ کیا کہ جس آدمی پر نگاہ رکھ رہا ہے اس کے ساتھ ہی جا کر رہنے لگے۔ ان کی ہم نشینی کا برا انجام ہوا۔ زیرِ نگرانی آدمی نے آخر میں پولیس افسر ہی کا کام تمام کر دیا۔ ظاہر ہے، مراد اس لیچڑ اسسٹنٹ کی خاطر مرنا نہیں چاہتا، یہ جو وزارتِ ترقیات کے پورے دفتر کا شاید واحد شخص ہے جو بالوں میں بریلیئنٹائن چپڑتا ہے۔ اور یہ بھی

ناقابل برداشت ہے، باسی روغن کی سڑاند۔ ہوسکتا ہے کسی دن مراد اس کا گلا گھونٹ دے۔ کچھ بھی سہی، اس کو ترقی تو نہیں ملے گی۔ ظاہر ہے، اسے اس کی ضرورت بھی نہیں، اس کی تنخواہ تو بس علامتی ہی ہے۔ چند ہزار درہم ماہانہ سے یورپ کے سفر کہاں کیے جاسکتے ہیں — اور پھر سال میں دو دو عمرے۔

شاؤش لوگ حاج حمید کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہاتھ کھول کر بخشش دیتا ہے، باتونی ہے، اور انھیں توجہ دیتا ہے۔ ان کے دلدّروں سے باخبر رہتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے، اپنے پرانے کپڑے دیتا ہے، اور تہواروں پر ان کی آل اولاد کا خیال رکھتا ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ جمعے کے دن دفتر سے گیارہ بجے نکل کر نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے۔ اُس دن وہ سرتاپا سفید لباس میں آتا ہے: جلّابہ، قمیص، پاجامہ، چپل۔ نماز کے بعد کھانا کھانے جاتا ہے اور آدھا گھنٹہ تاخیر سے دفتر لوٹتا ہے۔ مراد کوئی باز پرس نہیں کرتا، لیکن وہ ان تاخیروں کو تاریخ وار لکھ لیتا ہے — پتا نہیں کب ضرورت پڑ جائے۔ شاید کسی دن حاج حمید کے تادیبی کمیٹی میں پیش ہونے کا پروانہ آجائے اور معاملہ عدالت تک پہنچ جائے۔ لیکن ایسا تقریباً کبھی نہیں ہوتا۔ خیر، کچھ بھی سہی، اسے اپنا ایک عم زاد یاد آیا جس نے اپنی زندگی کا غالب حصہ مدرّسی کی تھی، یہاں تک کہ ایک دن انسپکٹر بن گیا اور تب اسے اپنی انسپکشن رپورٹوں سے اضافی آمدنی کے امکان کا خیال آیا۔ ابھی بمشکل ہی مال دولت بٹورنی شروع کی تھی کہ کسی نے مخبری کر دی، اور پکڑا گیا۔ اس نے مجسٹریٹ سے اپنے طرزِ عمل کے جواز میں کہا کہ لوگوں کی واجبی تنخواہیں انھیں رشوت لینے پر اکساتی ہیں۔ اس نے ایک خاصی مفصل رپورٹ تیار کی جس میں دکھایا کہ وہ رخنے جو حکومت چھوڑ دیتی ہے انھیں متوازی معیشت پُر کرتی ہے، اور مطالبہ کیا کہ ملک کی ترقی کو بڑھاوا دینے کے ایک ذریعے کے طور پر 'شخصی عطیات' کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جانا چاہیے۔ اس من موجی اظہارِ خیال نے اس کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔ پانچ سال کی جیل ہوگئی۔ تین سال بعد رہا ہوا۔ وہ سخت غیظ و غضب کے عالم میں تھا اور فی الفور غائب ہوگیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ منشیات کا غیرقانونی دھندا کرنے لگا ہے؛ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ کینیڈا مہاجرت کر گیا ہے، جہاں وہ نقلی ایرانی قالین بیچتا ہے۔

اور وہ پراسرار ملاقاتی بھی تو ہے، دراز قامت، گنجا آدمی، جو خود کو 'مراکشی' کہتا ہے۔ جیسے ہی مراکشی دفتر میں داخل ہوتا ہے، حاج حمید فوراً کھڑا ہوجاتا ہے اور اسے لے کر راہداری میں نکل جاتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ بظاہر وہ یہ ملاقاتیں ناپسند کرتا ہے؛ ان کے بعد اکثر اس کا موڈ ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ مراد کا خیال ہے کہ یہ آدمی حاج حمید کو بلیک میل کر رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اس راز کی تہہ کو پہنچ جائے، اس آدمی سے پوچھ تاچھ کرے اور، آخر میں، اسے حاج حمید کے خلاف گواہ کے طور پر استعمال کرے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ مراد پُرامن آدمی ہے۔ بس وہ صرف اتنا ہی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے مستقبل کی ضمانت ہو جائے اور اپنا وقار بھی قائم رہے۔ وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے، لیکن اپنے اصول توڑنے اور دوسروں کا سا طرزِ عمل اپنانے کے لیے نہیں۔ تاہم، مختصر ہی سہی، ایسے لمحے بھی ہیں جن میں اسے پچھتاوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے نوٹوں کی وہ گڈی یاد آتی ہے جو زمین کار (ڈویلپر) مسٹر فولان نے ایک مرتبہ قہوہ خانے کی میز پر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ کم سے کم دس ہزار درہم تو ہوں گے ہی۔ اس قسم کے مال سے وہ اپنے لیے ایک موپیڈ اسکوٹر خرید سکتا تھا، حلیمہ کے لیے لباس، ہر بچے کے لیے چھٹیوں کی پوشاک، سب کو مچھلی کھلانے ریستوران لے جا سکتا تھا، امریکی سگریٹ پی سکتا تھا اور شاید اپنے لیے اسی درہم کا — عام حالات میں پورے دو عدد کھانوں کی قیمت کا — 'مونٹی کرِسٹو نمبر 1' سگار بھی خرید سکتا تھا۔ بس اسے دستخط ہی تو کرنا تھے، صفحے کے نیچے مختصر سے دستخط۔ لیکن نہیں، وہ بکاؤ نہیں تھا۔ وہ طیش کے عالم میں کھڑا ہو گیا تھا اور قہوہ خانے سے نکل گیا تھا۔ مسٹر فولان نے لپک کر اسے آلیا تھا۔ ''مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ دس ہزار کافی ہوں گے... اگر زیادہ چاہییں تو اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ خیر، انھیں پیشگی رکھ لو، بقیہ دستخط کرنے کے بعد مل جائیں گے...'' مراد نے اسے گھور کر دیکھا تھا اور زمین پر تھوک دیا تھا۔ ''میں رشوت نہیں لیتا۔''

کیا وہ طیش میں اس لیے آ گیا تھا کہ کسی نے اس کی راست بازی پر شک کیا تھا؟ یا اس لیے کہ کہیں بہت دور اپنی گہرائیوں میں اپنی ذات سے اتنے زیادہ اخلاقی تقاضے رکھنے پر متاسف تھا؟ یہ سوال ابھی تک اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، اسے بیوی کو رشوت کا علم ہرگز نہ ہونے دینا چاہیے؛ ہو سکتا ہے وہ اسے کھڑکی سے باہر دھکا دے دے۔ اس کے غصے کی بھڑکیں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ وہ گزارے کے لیے گھر پر سلائی کا کام کرتی ہے، اور اپنی قسمت کو اکثر کوسنے دیتی ہے۔ اس کی دوسری تمام بہنوں نے مالدار آدمیوں سے شادیاں کیں اور پُرآسائش زندگی گزار رہی ہیں؛ اس نے محبت کی خاطر مراد سے شادی کی تھی، جس سے دانش گاہ میں ملاپ ہوا تھا۔ شادی

Scanned with CamScanner

کے فوراً بعد حلیمہ حاملہ ہوگئی اور اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکی، نہ کوئی کل وقتی ملازمت ہی کر سکی۔ رفتہ رفتہ حالت اور زیادہ خراب ہوتی گئی، خاص طور پر گھر والوں کے دباؤ سے۔

جہاں تک خود اس کا تعلق ہے، وہ واجبی وسائل والے شوہر کے ساتھ سکون سے رہ سکتی ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کا میکہ اس کے مفادات کے بارے میں چوکس رہتا ہے اور اسے احتجاج کرنے کے لیے بھڑکایا کرتا ہے۔ لیکن اس کا باپ کچھ نہیں کہتا؛ وہ مراد کی قدر کرتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ کتنا متین اور ایماندار ہے۔ اس کی ماں پکّی ریاکار ہے۔ مراد کے سامنے مسکراتی ہے لیکن پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ وہ اسے ادنیٰ، قلاش اور کند ذہن سمجھتی ہے، اور اس پر ایسے فقرے کسنے سے کبھی نہیں چوکتی جن میں اس کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو: ''سیدی لعربی نئی کار لے رہا ہے۔ کہو تو حلیمہ سے کہوں کہ اس سے اپنی پرانی کار تمھارے ہاتھ مناسب قیمت پر بیچ دینے کے لیے بات کرے۔ کتنے کی ہوگی؟ پچاس، ساٹھ ہزار — آج کے حساب سے تو یہ کچھ بھی نہیں!''

سیدی لعربی ٹھیک ویسا ہی آدمی ہے جس سے مراد کو نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ایک ذلیل وکیل جو کار کے حادثوں کا شکار ہونے والوں کے بل بوتے پر خوب پیسے والا ہوگیا ہے؛ وہ بیمہ کمپنی سے ساز باز کرتا ہے، حادثے میں ہلاک ہونے والے کے خاندان کو حصہ دے کر باقی رقم ایجنٹوں کے ایک چھوٹے سے حلقے میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اپنی دولت پر خوب اِتراتا ہے اور مزے کی نیند سوتا ہے۔ کوئی بھی جگہ ہو، کوئی بھی وقت ہو، اسے نیند کے جھونکے آنے لگتے ہیں۔ تیز تیز کھاتا ہے، ڈکاریں لیتا ہے، اور جھپکی مار جاتا ہے، خراٹے لینے لگتا ہے۔ جہاں تک اس کی رائے کا تعلق ہے، مراد ایک ناکام آدمی ہے، مفلس آدمی، جس میں جدید زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں۔

یہ درست ہے کہ میں، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، کبھی بھی دوسروں کی ڈگر سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکا ہوں۔ ہم آہنگ ہونا کیا ہے؟ یہی نا کہ جو سب کرتے ہیں وہی کرنے لگو، ضرورت پڑنے پر آنکھ پر پردہ ڈال لو، اپنے اصول اور آدرش ایک طرف ڈال دو، مشین کو گھومنے سے نہ روکو۔ مختصر یہ کہ چوری چکاری سیکھو اور جو ہاتھ آئے اس میں دوسروں کو شریک کرو۔ ذاتی طور پر، میں یہ نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ جھوٹ کیسے بولا جاتا ہے۔ میں زیرک نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ جسے 'مشین' کہتے

ہیں، وہ ہم جیسے لوگوں سے نہیں چل سکتی۔ میں ریت کا وہ ذرہ ہوں جو اس میں جا گھستا ہے اور یہ کھسکھسانے لگتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے یہ کام بھاتا ہے۔ یہ بڑا نادر اور باقیمت کام ہے۔ میں نے خود کو اس کے لیے وقف کر دیا ہے، خواہ میری بیوی بچے اتنے آرام سے نہ رہتے ہوں۔ یہ میرا فخر اور میری مسرت ہے، لیکن جانتا ہوں کہ اس سے ان کا بہت زیادہ بھلا نہیں ہوتا۔

بہر حال، میں کہوں بھی تو کیا؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری ساس نہ صرف ریاکار ہے، بلکہ، بصد عزت و احترام، وہ کسی چکلے کی نائیکہ ہوتی تو اچھی رہتی، اور حقیقت میں اس نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں ان کے امیدواروں کی اخلاقی یا ذہنی خوبیوں کے حساب سے نہیں کیں بلکہ مستقبل میں ان کے مالی امکانات کو مدنظر رکھ کر۔ آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی لڑکیاں سب سے اونچی بولی لگانے والوں کے ہاتھ بیچ دیں۔ ظاہر ہے یہ سب بڑے گول مول، پوشیدہ اور بالواسطہ انداز میں ہوا، کھرے کھرے صاف انداز میں نہیں۔ اس کے مسلسل تاؤ کھانے کے لیے اکیلا میں ہی ہوں، کیونکہ میں نے ہی سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا ہے، میں ہی وہ غلطی ہوں جو اس سے سرزد ہوئی ہے، میں وہ ہوں جسے اس کے خاندان میں داخل نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس نے یہ سب اپنی لڑکی سے کہا تھا، لیکن آخر میں ہتھیار ڈال دیے، اس توقع کے ساتھ کہ اول آخر میں اس مشین سے ہم آہنگ ہو ہی جاؤں گا۔ میں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں مجہول اور پرسکون رہتا ہوں، مشتعل نہیں ہوتا۔ لیکن میری بیوی کی چیخ پکار —— اس سے ضرور تکلیف ہوتی ہے۔ وہ مجھے نہیں سمجھتی۔ ہمارے درمیان یگانگت نہیں ہے، نہ ساجھے داری۔ ہم غریب لوگ ہیں، ہمیں اپنی چادر سے زیادہ پیر پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں، گویا مال والے ہوں۔ یہ بالکل سادہ سی بات ہے، لیکن وہ صداقت کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ وہ مجھے دق کرتی ہے، ہمیشہ ہمارا مقابلہ دوسروں سے کرتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے کہ لوگ ایسی چیزوں کا مقابلہ کریں جن کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ سیدی لعربی اور میرے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ ہمارے درمیان کچھ بھی تو مشترک نہیں۔

میں نے حلیمہ سے کیوں شادی کی؟ میں اس پر اکثر تعجب کرتا ہوں۔ میں اس قسمت ساز لمحے کی تلاش میں اپنی یادداشت کو کھنگالتا ہوں جس میں یہ فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے تو اس پر بھی یقین نہیں کہ میں نے ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔ یقیناً مجھ پر دباؤ ڈالا گیا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آدمی اکثر بڑی جلد بازی بلکہ

رواروی میں بڑا اہم اور سنگین فیصلہ کر ڈالتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ وہ اپنی سب سے قیمتی چیز رہن رکھے دے رہا ہے — اپنی آزادی، اور بعض اوقات تو اپنی پوری زندگی۔ حالانکہ یہی وہ آدمی ہے جو کوئی معمولی سی چیز خریدنے سے پہلے گھنٹوں غور و خوض کرتا ہے، دو قمیصوں یا دو ٹائیوں کے انتخاب میں تذبذب میں پڑ جاتا ہے، کار خریدنے سے پہلے کسی دوست یا مستری سے مشورے لیتا ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ اس معاملے میں مجھے تذبذب میں پڑنے یا اس کی بابت سوچنے تک کا حق نہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ حلیمہ بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور چھوٹی بہنوں کی شادی بیاہ کا راستہ صاف کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کو جلد از جلد نبٹا دیا جائے۔ ہماری ملاقات دانش گاہ میں ہوئی؛ مجھے اس کے رس بھرے ہونٹ اور بڑی بڑی چھاتیاں بھا گئیں، جن کی بابت میں نے ایک بچے کی طرح عجیب عجیب تصور باندھے۔ میں اس کا خواہش مند تھا۔ میں اپنی جنسی تحریک کو آسودہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی لیکن اس نے خود کو میرے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ قیمت بالکل واضح تھی: شادی، کیونکہ اس کے خاندان میں شادی کیے بغیر مرد کو چھونا ممنوع تھا۔ یہ بتاتے وقت وہ آگے کو جھکی، لمحے بھر کے لیے اس کی معجزاتی چھاتیاں جزوی طور پر جھلکیں، پھر وہ سیدھی ہو گئی اور آنکھ مارتے ہوئے بولی کہ اسے میری ناک اچھی لگتی ہے۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ کسی نے میری بالکل معمولی سی ناک کی بابت کچھ کہا تھا۔ مجھے یہ بات دلچسپ لگی۔ اعصابی تناؤ ختم ہوا اور میں اس کا ہاتھ تھام کر اس طرح اپنے لبوں تک لایا جس طرح کیری گرانٹ کو انگرڈ برگمین کا ہاتھ لاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سو یہ تھا میرا پندرہ منٹ رومانس۔ میں نے سوچا، زندگی ایک فلم ہے۔ میں اسے دیکھ سکتا ہوں، اپنی فلم کو، بڑے سے پردے پر، بلیک اینڈ وائٹ میں، جاز موسیقی کے ساتھ، ڈیوک ایلنگٹن پیانو پر؛ میں، قریب آتے ہوئے، دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ؛ حلیمہ سینمائی کلوز اَپ میں، اس کے ہونٹ لرزتے ہوئے، اپنا پہلا بوسہ قبول کرنے کے لیے آنکھیں موندتی ہوئی، میری آغوش میں سماتی ہوئی، جبکہ میں گوشۂ چشم سے گھڑی دیکھ رہا ہوں، کیونکہ اسے اپنے والد کی آمد سے قبل گھر پہنچ جانا ہے۔

ہماری فلم چند ہفتے چلتی رہی۔ کوئی جگہ نہیں تھی جہاں ہم جا سکتے ہوں۔ ہم نے اپنی عشق بازی کے لیے سینماؤں میں پناہ لی، یہاں تک کہ ایک دن اس کے بھائی نے ہمیں آ پکڑا۔ بس وہیں کھڑے کھڑے میں سمجھ گیا کہ امن و امان کی خاطر اس رشتے کو رسمی بنانا ہی ہوگا۔ ایک بار، صرف ایک

ہی بار، ہم ایک دوست کے کمرے میں برہنہ ہوئے، جو ویک اینڈ پر جاتے وقت مجھے چابیاں دے گیا تھا۔ حلیمہ نے مجھے تھکا مارا۔ اس کے کپڑے اتروانے کے لیے مجھے با قاعدہ کشتی لڑنی پڑی۔ میں اس کی انگیا اتارنے میں تو کامیاب ہو گیا، لیکن وہ چڈی جوں کی توں چڑھائے رہی۔ شروع ہی سے وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھی۔ وہ اپنا جسم میرے سپرد کرنے والی نہیں تھی؛ مجھے باقاعدہ اسے فتح کرنا پڑے گا، جس کا واحد راستہ قانونی تھا، وہی جو تاحیات مجھے زنجیر سے باندھ دینے والا تھا۔

جب اس کا بھائی مجھ سے ملنے دانش گاہ کے صدر دروازے پر آیا، تو میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے پہلے سے سارا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ سنیمائی مہلت، حتیٰ کہ وہ کمرہ جو میرے دوست نے مستعار دیا تھا، یہ سب کا سب ایک جال تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے بھائی کو ہمیں انجانے میں آلینا تھا، لیکن، اتفاق سے، وہ مقام کی بابت گڑبڑا گیا۔ لیکن ان سب باتوں سے یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ میں نے اس سے شادی کیوں کی۔ ٹھیک ہے، مجھے اس کی خواہش تھی، لیکن میں اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

کیا یہ محبت تھی؟ میری کم آمیزی اور جھجک، جذباتی الجھنیں، اور میری گمبھیرتا جو صداقت کے عرفان کی راہ کی رکاوٹیں بن گئی تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے اس کی جسمانی خواہش تھی۔ شادی کے شروع میں ہم نے زیادہ وقت جفتی کرنے میں گزارا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بستر میں بالکل آپے سے باہر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے جسم کے پور پور سے کام لیتی تھی۔ ایک دن اس نے پلنگ کے نیچے سے شیخ نفزاوی کی کتاب الروض العاطر[1] نکالی، جو مسلمانوں کے لیے جنسی لذت اندوزی کا ہدایت نامہ ہے، اور فیصلہ کیا کہ ہم شیخ کے بتائے ہوئے کل انتیس آسنوں میں سے ہر آسن کو لگاتار ایک ماہ تک آزمائیں گے۔ یہ خاصی مضحکہ خیز بات ہے کہ ہم ہدایت نامہ سامنے رکھ کر جفتی کرتے تھے۔ اسے پوری کتاب ازبر تھی اور وہ پورے پورے قطعے مجھے سنایا کرتی۔ میں نے دو ایک ایسے آسنوں کے نام یاد کر لیے جو مجھے مزاحیہ نظر آئے، جیسے 'لوہار کا آسن'، 'اونٹ کا کوہان'، 'ارشمیدس کا شکنجہ'، وغیرہ۔ لوہار ہی کیوں؟ ایک خاص لمحے میں، جب عورت چت پڑی ہو، '' گھٹنے سینے کی طرف مڑے

---

[1] عربوں کا کوک شاستر؛ اس کا نام رچرڈ برٹن کے انگریزی ترجمے میں The Perfumed Garden ہے۔

ہوے ہوں، فرج کھل کر سامنے آ گئی ہو، مرد جفتی کی رگڑیں مارتا ہے، پھر اپنا ذکر نکال کر عورت کی رانوں کے بیچ پھسلا دیتا ہے، لوہار کی طرح جو اپنا گرم، سرخ لوہا بھٹی سے نکال رہا ہو۔۔۔'' ہمیں اسے پڑھنے میں بھی اتنا ہی لطف آتا جتنا شیخ نفزاوی کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے میں۔

انتیس طریقے۔ روز ایک۔ لیکن مجموعی طور پر سبھی ایک جیسے ہیں: مرد ہمیشہ عورت کے اوپر ہی ہوتا ہے۔

ایامِ حیض کے دوران وہ اپنے کولھوں کو اوپر لانے کے لیے ایک تکیہ نیچے رکھ لیتی، میں سمجھ لیتا کہ وہ چاہتی ہے کہ میں اس میں پیچھے سے داخل ہوں، ایک ایسا آسن جو کتاب میں نہیں تھا۔ میرا خیال ہے، شیخ صاحب ایامِ حیض میں جفتی سے یکسر پرہیز کرنے کے حق میں تھے۔

میں جفتی سے انکار کر دیتا۔ مجھے لوطیت ناپسند ہے۔ سو یہ وہ دن تھا جب مجھ پر پہلا وار ہوا۔ ''تم مرد نہیں ہو!'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں بستر کی نگر سے سٹا ہوا تھا، میرا عضو سکڑ چکا تھا، میں نے خود کو مضحکہ خیز محسوس کیا، اور سمجھ لیا کہ اس تضحیک، اور اس پر ردعمل ظاہر کرنے سے قاصر رہنے کے بعد، کوئی دن جاتا ہے کہ میری زندگی جہنم زار بن جائے گی۔

اگلے دن میں نے گزشتہ رات والے واقعے کی بابت اس سے گفتگو کرنی چاہی۔ مگر یہ وقت کی بربادی ہی تھی۔ 'مردانگی' کی اس کی اپنی تعریف تھی، اور میں یہ جان کر ہکا بکا رہ گیا کہ جسمانی تشدد اور زدوکوب اس کی علامتوں میں سے تھے۔ وہ کہتی کہ دورانِ جفتی میں اس کا کچومر نکال دوں — جو کیری گرانٹ اور انگرڈ برگمین کے نرم و گداز، محبت آگیں بوسے سے بہت دور کی چیز تھی۔ ہم روزمرہ کے گھسے پٹے وظیفے میں آ گرے تھے۔ پھر اس نے مجھے اطلاع دی کہ اسے حمل ٹھہر گیا ہے، اور اس تمام مدت میں اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ ممانعت میرے عین حسبِ حال تھی۔ میں لونگ روم میں اکیلا سوتا، اور اپنی عم زادی نجیّہ کی بابت سوچتا، جس کے شوہر کی حال ہی میں وفات ہوئی تھی۔

نجیہ کے ساتھ جو کچھ تھا وہ خالص محبت تھی۔ میں اس کی آواز کا شیدائی تھا، اس کی حرکات و سکنات کی گدازی کا، اس لطف کا جو وہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کا ذکر کرنے میں لیتی، شائستگی کے اس احساس کا جو ہماری رفاقت کی گھڑیوں میں عود کر آتا۔ میں اسے تقریباً چوری چھپے دیکھا کرتا، جب وہ

میری والدہ سے، جو اس کی خالہ تھیں، فاس ملنے آتی۔ وہ اپنی ماں کے ہمراہ آتی، اور جب دونوں بہنیں باتیں کر رہی ہوتیں، ہم ٹیرس پر بچوں کی طرح ساتھ ساتھ بیٹھ کر گپیں مارتے۔ اس زمانے میں اس کی ایک نوجوان ڈاکٹر سے منگنی ہو چکی تھی۔ اسے اپنے ڈاکٹر سے محبت تھی۔ مجھے یہ معلوم تھا، اس لیے کبھی اپنے جذبات کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ جب وہ مجھ سے حلیمہ کا پوچھتی تو میں آئیں بائیں شائیں ہانک دیتا۔ میں اسے اپنی مصیبتوں میں ملوّث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کر سکتا تھا، اور ہو سکتا ہے اس سے میری شادی بھی ہو جاتی، لیکن میری والدہ کہتی تھیں کہ وہ میری 'رضاعی بہن' ہے؛ جب نجیبہ کی ماں بیمار تھی تو قیاساً انھوں نے اسے اپنا دودھ پلایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ سچ ہے؛ بہر کیف، خاص طور پر یہی وجہ بتائی گئی؛ ہو سکتا ہے دونوں بہنیں یہ نہ چاہتی ہوں کہ خالہ زادوں میں شادی ہو، اور ملاپ کی میری کوششوں کی پسپائی کے لیے یہ حربہ استعمال کیا ہو۔

نجیبہ بس کبھی کبھار ہی اپنے والد سے ملتی ہے، جنھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔

اب، جب کبھی میں نجیبہ کے بارے میں پھر سے سوچتا ہوں تو مجھے حلیمہ سے شادی کرنے کی غلطی کے بھاری پن کا احساس ہوتا ہے، حلیمہ جو کسی وحشی، سفاک یا اخلاقی طور پر آسانی سے بگڑ جانے والے آدمی کے ساتھ زیادہ خوش و خرم رہتی۔

وزارتِ ترقیات کے دفتر میں ملازمت کے اپنے اولین سال یاد آتے ہیں۔ ہر اجازت نامے پر دستخط کرتے وقت مجھے 'کمیشن' کا مطالبہ کرنا چاہیے، یہ مشورہ دینے والوں میں حلیمہ سب سے پہلی تھی۔ اس پر ہماری شدید ترین تو تو میں میں ہوئی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ کرپشن [2] ایک سرطان ہے جو ملک کو ہضم کیے جا رہا ہے، اور میری تربیت، میرا اخلاقی شعور، اور میرا ضمیر سب اس عمل کے شدید مخالف ہیں۔ اس نے پھر وہی بات دہرائی، کہ میں مرد نہیں ہوں! اس مرتبہ میں ہنس پڑا؛ وہ یہ برداشت نہیں کر سکی اور مجھ پر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی۔ اس کے ہذیان کو فرو اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے — میں نے اس کا تصور 'آگ' کے طور پر کیا — میں بھاگا بھاگا غسل خانے گیا، بالٹی پانی سے بھری، اور لا کر اس پر انڈیل دی۔ یہ انتہا تھی۔ وہ پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گئی اور ہولے ہولے سسکیاں لینے لگی۔ بڑبڑا کر ایسے جملے کہنے لگی، ''میں یہ سب تمھارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں، اور

---

[2] یہاں بمعنی 'رشوت'۔ ناول میں 'کرپشن' کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ 'فساد'، 'اخلاقی بے اصولی'، وغیرہ۔

تمھارے ہونے والے بچے کے بھلے کے لیے: تم قلاش رہنا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی، لیکن میں قلاش لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔"

اس زمانے میں ہم قلاش نہیں تھے؛ بس کفایت شعاری کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی کبھار مجھے ملازمت بدل لینے کا خیال آتا۔ انجینئرنگ کی سند پاس ہونے کی وجہ سے مجھے کسی نجی فرم میں کام مل جاتا۔ مگر اس کے لیے تعلقات، بارسوخ لوگوں سے واقفیت رکھنا، ان کی دنیا کا باسی اور ان کے طبقے کا رکن ہونا ضروری تھا۔ سو میں نے کوشش ہی نہ کی۔ یہ نہیں کہ عزم کی کمی رہی ہو، بلکہ بڑی وجہ میری ہچکچاہٹ تھی۔ یہ اپنی جگہ، لیکن میں ان لوگوں کے سامنے کبھی نہیں ہچکچایا جو مجھے رشوت دینے کی کوشش کرتے ہیں — اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میری مزاحمت میں کبھی ایک باریک سی دراڑ بھی نہیں پڑی۔ ایسے آدمی کے سامنے جو مجھے خریدنا چاہتا ہو، مجھ میں طاقت اور جرأت آ جاتی ہے۔ میں وعظ نہیں کرتا: بس کھڑا ہو جاتا ہوں اور ایک لفظ کہے بغیر اسے اپنے دفتر سے باہر کر دیتا ہوں۔ آدمی الٹے قدموں دروازے سے نکل جاتا ہے جبکہ میں بڑے اطمینان سے ڈیسک پر لوٹ کر اپنا کام جاری رکھتا ہوں۔ انھیں باتوں سے میں 'مردِ آہن' مشہور ہوں۔ لیکن دوسروں کے نزدیک میں 'ریت کا ذرہ' ہوں۔

ایک دن میں نے تفریحاً ان مختلف طریقوں کا اندراج شروع کیا جن سے لوگوں نے مجھے بگاڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ آدمی جس نے شہر کے کنارے ایک قطعۂ زمین کا ملکیت نامہ میری ڈیسک پر سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ دوسرا، قدرے سادہ لوح، جس نے عید کے موقعے پر دو نفیس بھیڑیں میرے گھر پہنچا دی تھیں۔ 'جونی واکر' کی دو بیٹیاں — آج تک پتا نہیں چلا کس نے بھجوائی تھیں۔ ایک بار ایک مشہور ریستوران میں ڈنر کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا، ایک پیشکش جو میں نے اپنی کمزوری کے باعث قبول کر لی۔ میزبان کی جگہ ایک عورت نمودار ہوئی؛ وہ غضب کی حسین تھی، اور اپنے کاروبار میں منجھی ہوئی۔ مجھے عمرہ کرنے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی ملا تھا، جو میں نے بھیجنے والے کو بغیر کسی رقعے کے لوٹا دیا تھا۔ بیوی اور بچوں کے لیے متعدد تحائف: زیور، لباس، کھیل، ایک کتا، ایک بلی، ایک گھوڑا، حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا طوطا۔ یہ سب نوسکھیے لوگوں کی سوغاتیں تھیں۔ جو زیادہ ہوشیار تھے وہ حاج حمید کا وسیلہ استعمال کرتے تھے۔ اِدھر میں باضمیری سے کام کر رہا تھا، صرف انھیں

Scanned with CamScanner

عرضیوں پر دستخط کرتا تھا جو ضوابط پر پوری اترتی تھیں؛ اُدھر حاج حمید میرے پیٹھ پیچھے سودے طے کیے جاتا۔ میں کسی فائل کو رد کر دیتا تو وہی آنے والے دنوں میں تمام ضروری دستاویزات کے ساتھ انھیں لے کر واپس آتا، اور مجھ سے دستخط کرنے کے لیے کہتا۔ میں بغیر کسی شک و شبہے کے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، نہ اس پر شبہ کیے کہ میرا اسسٹنٹ میرے اعتماد کا غلط استعمال کر رہا ہے، نہ اس پر کہ خود اس کا اپنا مختصر سا دائرۂ رسوخ ہے۔

نہ میں مردِ آہن تھا نہ ذرۂ ریت، بس ایک ایماندار آدمی ہی تھا۔

لیکن بے بضاعت لوگوں کے لیے نہ میں آہن تھا نہ ریت؛ ان کے نزدیک میں ایک ولی تھا۔ یہی ایک نوجوان ڈاکٹر نے، جس کا ابھی حال ہی میں شہر کے بڑے عوامی اسپتال میں تقرر ہوا تھا، ایک دن مجھ سے کہا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ سادہ لوح تھا۔ اس سے میری ملاقات اس دن ہوئی تھی جس دن میں واسط کو، جس نے کوئی زہریلی چیز نگل لی تھی، ایمرجنسی روم لے کر پہنچا تھا۔ میری توجہ میں آیا کہ اسپتال میں داخلے کا اندراج کرنے والا اردلی جان بوجھ کر میرے بیٹے کا کیس نظر انداز کر رہا ہے، اور وجہ بتائے بغیر ہم سے انتظار کروا رہا ہے۔ وہ ہٹا کٹا اور قدرے ڈینگ باز آدمی تھا۔ اس میں اتنا دم خم تھا کہ خود ہی مریضوں کی تشخیص کر کے جس سمت میں چاہتا ہنکا دیتا۔ میں نے دیکھا کہ بعض لوگوں کے ہاتھ اس نے ایک سے زائد بار مصافحے کے لیے ملائے۔ وہ اس کی 'مٹھی گرم' کر رہے تھے، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اس اثنا میں، مجھ جیسے لوگ، جو 'نظام' سے ناواقف تھے، ایک غلیظ راہداری میں ہوا کے جھونکوں میں کھڑے انتظار کھینچ رہے تھے۔ سو میں نے زبان کھولی۔ اس نے پروا نہ کی۔ میں نے بڑے ڈاکٹر سے ملنے کا مطالبہ کیا۔ اس نے میری طرف یوں پیٹھ کر لی جیسے بہت مصروف ہو۔ ایک ڈاکٹر وہاں سے گزر رہا تھا، وہی جو بعد میں میرا دوست بن گیا اور جس نے واسط کو بچا لیا۔ وہ ٹھہر گیا اور نرس سے وضاحت طلب کی؛ اس نے وضاحت نہیں دی، بس شانے اچکا دیے، بازو اوپر اٹھایا اور کہا، ''خدا کی مرضی۔''

بعد میں کہیں جا کر مجھے پتا چلا کہ یہ اردلی بڑا زور والا آدمی تھا۔ اس نے مریضوں پر 'محصول' لگا کر بہت دولت کما لی تھی؛ یہ ان کے ہاتھ دوائیں بھی بیچتا تھا اور بعضوں کو نجی کلینکوں کا راستہ دکھاتا تھا، جو اسے باقاعدہ کمیشن دیتے تھے۔

Scanned with CamScanner

میں نے بڑے ڈاکٹر کے پاس تشویشناک حالت کے مریض کی عدم اعانت کا شکایت نامہ داخل کیا۔ مجھے جواب ملا، جس میں میری تحریری شہادت کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اردلی بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہے اور اس پر انگلی بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔

اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ صحت کے ادارے کا ایک چوٹی کا افسر، جو خود بھی ڈاکٹر تھا، سرکاری خرچ پر اسپتال کے لیے خریدی گئی طبی اشیا کا رخ اپنے کلینک کی طرف پھیر رہا تھا۔ اسی زمانے میں یہ بھی علم میں آیا کہ یہی شخص بعض ادویہ کو سرحد پار کر کے آنے سے روکے ہوئے تھا، کیونکہ ان کا سوئس جرمن بنانے والا اس کو کمیشن دینے سے انکار کر رہا تھا۔ یہ شخص، جسے بعد میں ملازمت سے نکال دیا گیا، اب اپنے کلینک کی اور اپنی نجی آمدنی پر بڑی آرام دہ اور پُرآسائش زندگی گزار رہا ہے، اس کے باوجود کہ وہ سینکڑوں مریضوں کی موت کا ذمے دار ہے۔

میں نے انتقامِ الٰہی کا خواب دیکھا۔ اپنے رتجگوں کے دوران اس آدمی کو روکنے اور کسی باضمیر اور خودمختار عدالت سے اس کا فیصلہ کروانے کا منصوبہ باندھا۔ میں نے اس کے لیے کورٹ مارشل اور لوگوں کے ساتھ انصاف کیے جانے کا خواب دیکھا۔ میں نے قومی صفائی کا خواب دیکھا: ایک طلسمی ہاتھ جو لوگوں پر سے گزرے گا، معاشرے میں نظام لائے گا، اس معاشرے میں جہاں، انجام کار، سب کچھ روا ہے۔ میں خیالوں میں اپنے خوابوں کی یہاں تک ادھیڑ بن کرتا کہ ہنسی پھوٹ پڑتی یا بخار لاحق ہو جاتا۔

•

ڈائریکٹر نے مجھے بلوایا ہے۔ میں ایک رپورٹ مکمل کرتا ہوں، اپنی فائلوں کو قرینے سے جماتا ہوں، اپنی بوسیدہ ٹائی درست کرتا ہوں، اور حاج حمید سے کہتا ہوں کہ باس کے دفتر میں ہوں گا۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ باس شاذونادر ہی دفتر میں ہوتا ہے۔ اس کے ذمے اتنے زیادہ کام ہیں کہ وہ ہمیں تھوڑا سا ہی وقت دیتا ہے۔ وہ شائستہ اور خودآموز آدمی ہے، جو ہر چیز کے بارے میں متجسس رہتا ہے۔ اسے میرے ساتھ ادب پر گفتگو کرنا پسند ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میرا ذاتی کتب خانہ ہے اور میں کتابیں پڑھنے کو ٹیلیوژن دیکھنے پر فوقیت دیتا ہوں۔ اسے میری افتادِ طبع کا علم بھی ہے؛ لیکن وہ ہر بار مجھے، بقولِ خود، 'لچکداری کا سبق' دیتا ہے۔ ''تمھیں کٹر اور سخت گیر ہونا چاہیے، خاص طور پر ہمارے

Scanned with CamScanner

ملک میں، لیکن تھوڑی سی لچک رکھنے میں حرج نہیں،'' وہ اکثر کہتا ہے۔ ''سارا انحصار اس پر ہے کہ کہاں تک جھکا جائے!'' پھر ہم دونوں ہنستے ہیں اور دوسرے معاملات میں لگ جاتے ہیں۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے مقابل بٹھایا، اپنے لیے چائے اور میرے لیے قہوہ منگوایا، اور مجھ سے بلا رخنہ اندازی کیے غور سے سننے کے لیے کہا۔ ''یہ گفتگو دو مردوں، دو دوستوں کے درمیان ہے۔ میں تمھاری قدر اور عزت کرتا ہوں۔ تم بہت محنت کرتے ہو اور تمھاری تنخواہ بہت کم ہے۔ ریاست تمھیں جو دیتی ہے تم اس سے دگنے، بلکہ تگنے کے مستحق ہو۔ تمھیں واقعی کم تنخواہ مل رہی ہے۔ تمھاری تنخواہ کا دارومدار تنخواہ کی مقررہ شرح پر ہے، اور، جیسا کہ تمھیں معلوم ہے، ریاست اپنے کارکنان کی تنخواہیں بڑھا نہیں سکتی۔''

آنے والی طویل خاموشی میں وہ مجھے تکتا رہا۔ پھر جیسے، کوئی تقریر ریکارڈ کی ہوئی ہو، میں نے درج ذیل کلمات سنے، یا خیال کیا کہ سنے۔ حقیقت میں اس کی آنکھیں مجھ سے بزبانِ خاموشی کہہ رہی تھیں:

''بنیادی ضرورت کی اشیا کے دام بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کا تدارک ہماری بساط سے باہر ہے۔ تمھارے لیے مطابقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زیادہ تر تنخواہیں محض علامتی ہیں۔ ریاست بھی یہ جانتی ہے، اور بالکل اسی طرح یہ بھی جانتی ہے کہ لوگ اپنے اپنے طریقے پر اپنی کمیوں کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں پر غلاف چڑھا لیتی ہے۔ یہ اس کے لیے بالکل ضروری ہے، ورنہ شورش برپا ہو جائے۔ رخنے پُر کرنے کے لیے جو ذرائع بھی مہیا ہوں، شہری ان میں شریک ہوتے ہیں۔ اس پر پوری قوم کا اتفاق ہے۔ یہ توازن برقرار رکھنے کی عملیت ہے۔ سارا گر یہ ہے کہ کام ذرا احتیاط سے کیا جائے، بلکہ اگر ممکن ہو تو دیدہ زیب طریقے سے۔ 'لچک' سے میری مراد بس یہی ہے۔ ریاست کو ان تمام شہریوں کا شکر بجالانا چاہیے جو اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اور یہ تم جیسے لوگ ہیں جو ملک کے استحکام، حتیٰ کہ اس کی آسودہ حالی کے ضامن ہیں۔ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ اس عمل سے بعض اقتصادی شعبوں کو نقصان پہنچتا ہے؛ میرا اشارہ کسٹم اور ٹیکس کے دفتروں کی طرف ہے...

''تم جسے اخلاقیات کے خانے میں رکھتے ہو اور جسے کرپشن کہتے ہو، میں اسے متوازی

Scanned with CamScanner

معیشت کہنا پسند کرتا ہوں —— اور یہ تو کوئی ڈھکی چھپی چیز بھی نہیں، یہ ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ اچھی چیز ہے، میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں اس کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا اور 'مکافات' کو 'چوری چکاری' سے خلط ملط کرنے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ اور یہ مت سوچنا کہ صرف ترقی پذیر ملکوں ہی کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذرا فرانس، اٹلی، حتیٰ کہ جاپان کے اسکینڈلوں کا جائزہ لو۔ یہاں یہ انسانی، انفرادی سطح پر واقع ہوتا ہے۔ اُن ملکوں میں یہ انفرادی تلافی کا معاملہ نہیں رہا ہے، یہ تو بڑی بڑی رقموں کی خورد برد، غبن، اور منظم جرائم کا معاملہ ہے۔ تم نے اس پر غور کیا ہے کہ جب سے اٹلی نے بڑے پیمانے کے کرپشن کا مقابلہ کرنا شروع کیا ہے، اس کی معیشت کا پٹرا ہو گیا ہے؟ وقت بچانے اور اسامیاں پیدا کرنے کے لیے ایک فائل کو نبٹانے کے ہمارے بالکل چھوٹے پیمانے کے اور پسماندہ طریقے کا مقابلہ ان ہوشربا رقموں سے ہو ہی نہیں سکتا جو یورپی سیاست دان صنعت کار گروہوں حتیٰ کہ مافیاؤں کے سرغنوں سے اپنی رعایتوں کے عوض اینٹھتے ہیں اور انھیں جمع کرانے کے لیے سوئس بینکوں میں نمبروں والے اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ ان کے سامنے ہماری حیثیت زبوں حال، کم تنخواہ دار عہدیداروں کی سی ہے جو دن رات چکی میں پس رہے ہیں کہ کسی طرح بچوں کی معمولی سی تعلیم اور چھٹیاں منانے کا بندوبست ہو جائے، ایسی زندگی گزر سکے جس میں نہ محرومیاں ہوں اور نہ غمگینی۔ ہم تو خوش خور یا پیٹو بھی نہیں، بس صرف یہ چاہتے ہیں کہ کھانے کو پیٹ بھر مل جائے۔ یہ جائز ہے، سو فیصد جائز ہے، جنابِ اخلاقیات! امید ہے آپ نے میری بات سمجھ لی ہوگی!''

خاموشی اچھی خاصی پانچ منٹ تک طاری رہی۔ میں نے اپنے سے کہا: کہیں کوئی باس بھی اس طرح بات کرتا ہے؟ ناممکن! یہ اس کا کام نہیں۔ یہ میں ہی ہوں یا میرا سادہ لوح ضمیر جو بول رہا ہے۔ اسے لن ترانی کا مرض ہے۔ وافر خاموشیاں تھیں جن کی تعبیر کرنی تھی۔ بہت سی اکساہٹیں تھیں جن کو معنی پہنانے تھے۔ میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا، یہ بڑبڑاتے ہوئے کہ ''چیزوں کے بارے میں ہمارا تصور ایک جیسا نہیں ہے۔''

اس بار اس کا مزاج شگفتہ نہیں ہے اور بمشکل ہی سلام علیک کرتا ہے۔ عام طور پر وہ اصرار کے ساتھ مجھ سے بچوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ایک فائل اس کی ڈیسک پر رکھی ہے، الٹی ہوئی۔ میں

Scanned with CamScanner

پڑھتا ہوں: بصبان۔ وہ پوچھتا ہے کہ مسٹر صبان کا کیا ہوا۔ مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ عربی میں 'صبان' اس آدمی کو کہتے ہیں جو میلے کپڑے دھوتا ہے۔ یہ نام اس شخص پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ میں لمحہ بھر سوچ کر کہتا ہوں:

''میرے خیال میں یہ وہی ذاتِ شریف ہے جو مجھے خریدنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے، مجھے انکار کرنا پڑا، اور وہ سمجھا کہ جو دے رہا ہے وہ میرے نزدیک ناکافی ہے۔ مجھے یہ بات سخت گراں گزری۔''

''اور تمھاری 'لچکداری' کہاں ہے؟''

''وہ مجھے سیکھنی پڑے گی، جناب۔''

دفتر لوٹنے پر مجھے یاد آتا ہے کہ مجھے اپنے بڑے لڑکے واسطے کو اس کے ہائی اسکول میں بورڈر کی حیثیت سے وظیفہ دیے جانے کی عرضی لکھنی ہے، تاکہ وہ وہاں رہ کر امتحان کی تیاری کر سکے۔ گھر میں اتنی جگہ کہاں ہے کہ وہ یکسوئی سے اپنا ہوم ورک اور پڑھائی کر سکے۔ دوسرے لکھو کھا مراکشیوں ہی کی طرح، وہ بھی سڑک پر بجلی کے کھمبے کی روشنی میں پڑھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ عرضی بھر کر ڈاک سے بھیجتا ہوں تو اسے وظیفہ ملنے سے رہا۔ اس کی فائل تو کھولی بھی نہ جائے گی۔ اسے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، 'تعلقات' کی ضرورت ہے۔ وزارت میں میری کسی سے جان پہچان نہیں۔ آپ کے لیے تعلقات تلاش کرنا ضروری ہے؛ یہ جو کوئی بھی ہو، بظاہر اس سے ذاتی واقفیت ضروری نہیں۔ بس آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس سے رابطہ قائم کریں اور چپکے سے اس کے ہاتھ میں وہ رسوائے زمانہ لفافہ سرکا دیں۔

ہرگز نہیں! اگر میں خود دوسروں کو رشوت دینا شروع کر دوں تو پھر اس قسم کے لفافوں کو ہٹ دھرمی سے رد کر دینے کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ اگر میری بیوی کو میرے خیالات کی سن گن ہو جائے تو کہے گی، ''تم اپنے کو کوئی اَلی وَلی سمجھتے ہو، یا ہیرو ویرو۔ بس تو، جناب، آپ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہیں، اور، یہی نہیں، ہمیں بھی اپنی خلوت میں گھسیٹ رہے ہیں، جس میں محرومیاں اور حاجتیں ہیں۔ تمھارے اوپر والے سچ مچ کے آدمی ہیں، وہ اپنے بچوں کے مستقبل کی پروا کرتے ہیں اور ان کی حاجت روائی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیتے ہیں۔ جبکہ تم... تم اپنے اخلاقی اصول جمع کیے جاتے ہو، جیسے انھی سے پیٹ بھر لو گے! خیر، کچھ بھی ہو جائے، ہمارا بیٹا تمھارے بے لچک

Scanned with CamScanner

رویے کا شکار نہیں ہوگا۔ میں سب کچھ کروں گی تا کہ اسے وظیفہ مل جائے۔''

یہ 'سب کچھ' کیا ہو سکتا ہے؟ اپنے زیور بیچ دے گی؟ سیدی العربی سے قرض مانگے گی؟ وزارت کے کسی عہدیدار سے عشق بازی کرے گی؟ اس خیال سے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ حلیمہ میں اس قسم کے فعل کی صلاحیت ہی نہیں۔ نہیں، شیطان ایسے خیال میرے دل میں لا رہا ہے — مجھے ان کو باہر نکال دینا چاہیے۔ ہاں، وہ اب بھی جوان اور حسین ہے۔ ہو سکتا ہے مجھ سے جنسی بے وفائی کرتی ہو۔ عجیب بات ہے، ایسا خیال مجھے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے بڑ ہانک رہی ہو، کیونکہ ہانک سکتی ہے، لیکن اس کی تربیت اور پرورش اس کے خلاف جاتی ہے۔ خیر، کچھ بھی سہی، پریشانی تو مجھے اس روز شروع ہوگی جب وہ مجھے دق کرنا چھوڑ دے گی: اسے اپنی ضرورتیں پوری کرنے والا کوئی اور مل چکا ہوگا۔ میرے آس پاس جو لوگ ہیں ان کے مشاہدے سے میری توجہ میں آیا ہے کہ مرد مستقل داشتائیں نہیں رکھتے؛ وہ نئے نئے جسم پسند کرتے ہیں اور کسی بندھن میں بھی نہیں پڑنا چاہتے۔ مجھے نجیہ یاد آتی ہے، میری محرمہ خالہ زاد، جو شوہر کی وفات کے بعد سے تن تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا شوہر رباط اور دار البیضا کے درمیان کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ ایک ٹرک سے ٹکر لگ گئی تھی جو رات کے وقت بتیاں بجھائے ہائی وے میں رکا کھڑا تھا۔ سیدی العربی نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا؛ میں نے ہوشیاری سے مداخلت کی کہ بیمے کی رقم کا نصف حضرت کہیں خود نہ ہضم کر جائیں۔ صرف اُس ایک بار، مجھے جتانے کے لیے کہ وہ ایماندار ہے، اس نے بدعنوانی نہیں کی۔

نجیہ بڑی خوبصورت ہے۔ مجھے اسی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔ اگر ہم نے کسی ماہرِ شریعت سے مشورہ کیا ہوتا تو وہ شادی کی اجازت دے دیتا، اس کے باوجود کہ ہم دودھ شریک تھے۔ وہ مجھ سے ایک یا دو سال ہی چھوٹی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں میری کشش کی وجہ اس کا مجھ پر حرام ہونا ہو۔ اس کے بال کالے سیاہ ہیں اور آنکھیں نیلگوں جو، بیوگی کے باعث، غم واندوہ اور توقع سے بھر گئی ہیں۔ وہ ایک منتظر عورت ہے۔ وہ اپنی تیرہ سالہ بیٹی کی پرورش کر رہی ہے اور ایک پرائمری اسکول میں پڑھا بھی رہی ہے۔ وہ میرے قبیل کی ہے۔ جب بھی اسے دیکھتا ہوں، وہ سلام علیک کرتے ہوئے نظریں نیچی کر لیتی ہے، مبہم سا مسکراتی ہے۔ میں بھی اس کی طرح ہوں گا۔ لیکن میں اس کے بارے میں اسی طرح سوچنے کو ترجیح دیتا ہوں جیسی وہ ہے، اس کے بجائے کہ کوئی ناقابلِ تلافی حرکت

Scanned with CamScanner

کر بیٹھوں۔ میں اپنی بیوی سے بھی باوفا ہوں؛ میں اس کے ساتھ جنسی بے وفائی کرنے کا نااہل ہوں۔ یہ نہیں کہ ایسا کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا، لیکن میرے اصول ہیں اور میں ان کی پابندی سختی سے کرتا ہوں۔ نجیہ ایک خیالی پیکر ہے، میری یادوں کے گوشے میں سمٹا ہوا ایک خواب۔ جس وقت حلیمہ کی چیخ پکار مجھے ایک اندھے کنویں میں غرق کر دیتی ہے، جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو، میں نجیہ کو مٹھاس سے یاد کرتا ہوں۔ میں اس کنویں کی گہرائی میں کافی وقت گزارتا ہوں، یہاں میری زندگی ایک جانور کے قالب میں سمٹ جاتی ہے۔ ایسے وقتوں میں ذہن میں ایک روشنی سی جل اٹھتی ہے اور مجھے نجیہ کا ضوفشاں چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں چلا جاؤں، کہیں بہت دور، کسی غیر ملک، کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے، کسی ویران ساحل پر نوجوانوں کی طرح دوڑوں بھاگوں، وِوالڈی (Vivaldi) کی موسیقی کی سنگت پر؛ موسم سرد ہوگا اور میں اسے اپنے بڑے سے اسکاٹش اونی سویٹر سے ڈھانپ دوں گا؛ وہ مجھ سے سٹ کر بیٹھ جائے گی، اپنے کو گرمی پہنچائے گی، اور اپنی حسین زلفوں کو میرے شانوں پر پریشان ہونے دے گی... آہ! لیکن یہ سب تو احمق بچیوں کے لیے بنائی گئی کسی فلم جیسا معلوم ہوتا ہے، یا کسی خوشبو یا نئی کار کے اشتہار کی طرح۔

حاج حمید جانتا ہے کہ سنگدل کیسے بنا جاتا ہے؛ یوں جیسے وہ تقریباً میرے خیالات پڑھ رہا ہو۔ ابھی میں نے وِوالڈی سننا شروع ہی کیا ہوتا ہے کہ اس کی کرخت آواز مجھے حال میں واپس کھینچ لاتی ہے۔ وہ شیشے کے دروازے کے پار سے کہتا ہے کہ مسٹر صبان نے اپنی درخواست دوبارہ دی ہے۔ وہ اس نام پر اس طرح زور دیتا ہے گویا اس بار مجھ سے دستخط کرا کے ہی چھوڑے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم جلدی میں نہیں ہیں؛ ہمارے پاس اسے دوبارہ جانچنے اور دوسرے تعمیراتی ٹھیکیداروں کی درخواستوں سے اس کا موازنہ کرنے کے لیے پورا ہفتہ پڑا ہے۔ اور حقیقت میں مَیں نے اس پر غور کرنے کے لیے وقت مقرر کر رکھا ہے: فیصلے کے لیے ایک ہفتہ اور دو ویک اینڈ۔

دفتر سے واپسی پر میں پیدل چلنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ گھر جانے کی جلدی نہیں۔ میں الحمرا بار میں ٹھہر جاتا ہوں اور ایک بیئر پیتا ہوں، پندرہ درہم کی، اور پیتے ہوئے اپنے جوتے چمکواتا ہوں، ایک ادنیٰ سا تعیش جس کے پانچ درہم دینے پڑتے ہیں، دو سگریٹیں پھونکتا ہوں، جس میں سے ایک مارلبرو ہے؛ یہ میں ان لڑکوں میں سے ایک سے خریدتا ہوں جو قہوہ خانوں کے آس پاس منڈلاتے

رہتے ہیں۔ آج رات کھانے کو کیا ملے گا؟ سبزی کا سوپ اور قلیل سا ولندیزی پنیر۔ ہلکی پھلکی غذا، جس کی قیمت بھی زیادہ نہیں۔

گھر کے راستے میں مَیں پرچون فروش کی دکان پر رک جاتا ہوں۔ وہ مجھے فروری کے مہینے کا بل پیش کرتا ہے: ایک ہزار آٹھ سو باون درہم۔ کیا اندراجات کو فرداً فرداً دیکھنا ضروری ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ یہاں عام بازار کے مقابلے میں اشیا دگنی قیمت پر ملتی ہیں۔ وہ زیادہ قیمت لیتا ہے اور اس طرح مجھے ادھار سودا لینے کی سزا دیتا ہے۔ میں اس پر نظر ڈالتا ہوں اور وہ مسکرا دیتا ہے۔ مجھے اس کی قمیص کا کالر میلا نظر آتا ہے۔ تمام پرچون فروشوں کی طرح وہ بھی جنوب کا رہنے والا بربر ہے، اپنا سارا وقت کیش رجسٹر کے پیچھے گزارتا ہے، وہیں کھاتا اور سوتا ہے۔ پیسے جوڑنے کا ماہر ہے۔ لیکن یہ کوئی زندگی ہوئی؟ میں اسے ہزار درہم دیتا ہوں اور بقیہ جلد ہی ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ رخصت ہوتے ہوئے مجھے تعجب ہوتا ہے: کیا یہ جفتی کرتا ہوگا؟ کبھی دکان سے جدا ہی نہیں ہوتا جو کسی سے ملاقات ہو۔ اس کے بیوی بچے پیچھے گاؤں میں ہیں۔ سال کے ختم پر، وہ ان کے ساتھ دو مہینے گزارتا ہے اور تب ساری کسر پوری کر لیتا ہوگا۔ یہاں، دوسرے وقتوں میں، دکان کے عقبی غلیظ پاخانوں میں جلق لگاتا ہوگا۔

میری بیوی اچھے موڈ میں ہے۔ زہے نصیب! بال اور کپڑے صاف ستھرے ہیں اور مجھ سے لطف و عنایت سے بول رہی ہے۔ یقیناً کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ ہمسائی کے بارے میں بتاتی ہے، جس نے اسے اپنے بھائی کی شادی پر پہننے کے لیے کپڑے بنانے کا آڈر دیا ہے اور اجرت کا کچھ حصہ پیشگی ہی دے دیا ہے۔ بس، یہی بات ہے۔ روپے پیسے سے اسے خوشی پہنچتی ہے۔ اور اس کا خوشی محسوس کرنا بالکل جائز ہے۔ میں مسکراتا ہوں اور اس کی گردن چوم لیتا ہوں۔ آج رات جفتی ہوگی۔ واسط گھر کے باہر اپنی پڑھائی کر رہا ہے اور کریمہ سو رہی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ جاتی ہے اور کہتی ہے، ''میری جھونجھل معاف کر دینا۔ بس ضبط نہیں ہوتا۔ میں صرف بچوں کی خوشی ہی چاہتی ہوں۔ ایماندار لوگوں کے واسطے زندگی بڑی دشوار ہوتی ہے۔'' اب میری مجال نہیں کہ نجیہ کے بارے میں مزید کچھ سوچوں۔ اور اگر اپنی اصول پرستی کو ایک طرف ڈال بھی دوں، تو بھی اسے دینے کے لیے

Scanned with CamScanner

میرے پاس ہے ہی کیا۔ وہ ایک حسین عورت ہے جسے مہر و عنایت کے گرم و گداز جذبات کی ضرورت ہے، لیکن اسے اپنی استانی کی چھوٹی سی زندگی سے نجات پانے کی بھی ضرورت ہے، بسر اوقات کے لیے صبح شام کی مشقت سے نجات پانے کی۔ مجھے معلوم ہے کہ بیمے کی جو رقم ملی تھی وہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے فکسڈ اکاؤنٹ میں رکھ دی ہے۔

میں حلیمہ سے محبت کرتا ہوں، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ہر بار جب وہ ہماری زندگی کی دشواریاں مجھے یاد دلاتی ہے، میری شفقت کا کچھ حصہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ یوں تو نجیہ اچھی ہے، لیکن میں نے تجربے سے سیکھا ہے کہ غیر متوقع لمحات ہی میں دوسرے کو ٹھیک سے پہچانا جاتا ہے، مثلاً، جیسے خاموشیوں میں یا چھوٹی چھوٹی جزئیات کے سہارے جن میں آدمی غیر اہم واقعات پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، حلیمہ کو نیم گرم قہوے سے نفرت ہے۔ کبھی میں اس سے پہلے بیدار ہو جاتا ہوں اور اس کا ناشتہ تیار کرتا ہوں۔ اگر وہ دیر سے سو کر اٹھتی ہے تو اس وقت تک قہوہ گرم نہیں رہتا۔ اس وقت میں اسے چیختے چلاتے اور یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ میں نے قہوہ جان بوجھ کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔

حلیمہ اچھی ماں ہے۔ باپ کی حیثیت سے میں موجود تو ہوں، لیکن میں بچوں کو بہت زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ لیکن وہ ان کے ساتھ بڑے صبر و تحمل سے پیش آتی ہے۔ اسے ان سے باتیں کرنا آتا ہے، اور وہ انھیں نیند لانے کے لیے کہانیاں سناتی ہے۔ اس اثنا میں مَیں بیٹھا حساب کتاب کرتا ہوں، جمع تفریق میں لگا رہتا ہوں۔ مہینے کی بیسویں تاریخ سے مجھے پرچون فروش کا آسرا لینا پڑتا ہے۔ بظاہر اسلام میں قرض کی رقم پر سود لینا حرام ہے، لیکن وہ نماز بھی پڑھتا ہے اور چیزوں کی قیمت میں سود کے حساب سے اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ وہ شخص جو مہینے کی بیس تاریخ پر قلاش ہو جاتا ہو، اسے دوسری عورت کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ مجھے اپنی یاد سے نجیہ کا پیکر محو کر دینا ہوگا۔ میں نے نہ حقیقی زندگی اور نہ فلموں میں کبھی یہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ ایک غریب، خالی جیب شخص کسی حسین عورت کو اپنی رغبت دلانے میں کامیاب رہا ہو؛ ایسا آدمی جو بینک میں اپنے حساب میں جمع رقم سے زیادہ نکلوا چکا ہو اور پرچون فروش سے ادھار سودا لیتا ہو۔ لیکن تخیل کی پرواز پر تو گانٹھ سے کچھ نہیں جاتا۔ میں ان باتوں کا تصور کرتا ہوں تو بس اپنے دماغ کو تھوڑی سی تازہ ہوا پہنچانے کے لیے۔ میں

Scanned with CamScanner

بھلا کہاں چاہتا ہوں کہ اس کے دروازے کی گھنٹی بجاؤں اور ساحلی سڑک پر سیر کے لیے چلنے کی دعوت دوں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ خیال ہے دلپذیر۔ عباس مجھے اپنی کار اور دو سو تین سو درہم عاریتاً دے ہی دے گا، اور ہم، عاشقوں کی طرح، ساحل کے سہارے سہارے موجوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کا نظارہ کرنے چل پڑیں گے۔ کباب اور ونیلا آئس کریم کھائیں گے۔ سمندر کو دیکھتے ہوے میں اسے اپنے سے لپٹا لوں گا، یہاں تک کہ اسے میرے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں گی۔ حقیقت میں میرا دل بڑے زور شور سے دھڑک رہا ہوگا، نجیہ کے لیے کم، حلیمہ کے گھر والوں میں سے کسی سے اچانک مڈبھیڑ ہو جانے کے خوف سے زیادہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں جب اس تصور سے جان چھڑاتا ہوں تو بہتر محسوس کرتا ہوں۔ یہ کتنی غیر معمولی بات ہے کہ لوگ اتنی آسانی سے بدل جاتے ہیں۔ لمحہ بھر پہلے میں اس قدر مضطرب اور ہراساں تھا؛ مطمئن، بلکہ خوش محسوس کرنے کے لیے بس اتنا ہی تو کرنا تھا کہ اس تصور کو ذہن سے دور بھگا دوں۔

مجھے ہمہ وقت سوچنے کی لت پڑ گئی ہے۔ چیزیں بناتا ہوں اور پھر چکنا چور کر دیتا ہوں۔ مجھے چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور خوف آتا ہے۔ دوسرے یہ کیسے کر لیتے ہیں؟ سیدی لعربی کیسے کرتا ہے؟ اس قسم کی الجھن اسے کبھی لاحق ہی نہیں ہوئی۔ وہ چوری کر سکتا ہے، دوسروں کو بگاڑ سکتا ہے، لوگوں سے ٹھگی کر سکتا ہے، اور مزہ یہ کہ اس پر بھی بالکل ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ آنکھ بند کر کے عافیت کی نیند سوتا ہے، بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ حسین خواب بھی دیکھتا ہوگا جو نیند کا لطف دوبالا کر دیتے ہوں گے۔ رہا میں، میری تو نیند اس خیال ہی سے اُڑ جاتی ہے کہ اپنے بہترین دوست عباس، اور اپنے دوسرے بینکر، یعنی پرچون فروش کا مقروض ہوں۔ اگر میں دوسری طرف چلا جاؤں، ان تخم حرام لوگوں کی صف میں شامل ہو جاؤں، تو ہو سکتا ہے کہ میری اخلاقی پاسداری رفو چکر ہو جائے اور میں بھی گھوڑے بیچ کر سو سکوں۔ مجھے آزما دیکھنا چاہیے۔ یہ سب ان سے بڑے فطری انداز میں سرزد ہوتا ہے، جبکہ مجھے ایسا کرنے کے لیے اپنے پر جبر کرنا پڑتا ہے، اپنے ضمیر کے ایک ٹکڑے کو کاٹ پھینکنا پڑتا ہے۔ میں کسی ٹھیکیدار سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا کمیشن دس فیصد ہے۔ ہو سکتا ہے وہ میرے خلاف رشوت ستانی کی شکایت داخل کر دے۔ دوسرے یہ کیسے کر لیتے ہیں؟ ایک ایسی بات کے خیال ہی سے، جو بنیادی طور پر روزمرہ کا عام معاملہ ہے، میں کیوں لرز اٹھتا ہوں اور کیوں ٹھنڈے پسینے

Scanned with CamScanner

آ جاتے ہیں؟ مجھے چاہیے کہ شبانہ جماعتوں میں داخلہ لے لوں۔ میں اس خیال پر مسکرا دیتا ہوں، کیونکہ ان شبانہ کلاسوں کی فیس ادا کرنے کے لیے کیا دوں گا، اگر واقعی شبانہ کلاسوں کا وجود بھی ہو۔

عباس اچھا ہے کہ ان چیزوں سے الگ تھلگ ہے۔ وہ مالدار اور منکسر مزاج ہے۔ اس کا باپ ورثے میں مال دولت اور املاک چھوڑ گیا ہے، اور وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ورثے کو سنبھالتا ہے۔ وہ سخی بھی ہے اور محتاط بھی۔ ہماری بس ایک ہی بار تو تو میں میں ہوئی ہے، خلیج کی جنگ کے دوران۔ وہ صدام کے حمایتی اجتماع میں شامل ہوا تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ عراقی عوام کی حمایت کر رہا ہے، اور صدام، بہر کیف، مغرب کی روز افزوں عرب دشمنی اور اسلام دشمنی کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے۔ اگرچہ عباس برا آدمی نہیں ہے، لیکن وہ عرب صحافت کے ایک حصے کے انتقامی نعروں کا بڑی آسانی سے قائل ہو جاتا ہے۔

ہماری ملاقات ہائی اسکول کے دنوں میں ہوئی تھی۔ اس نے عربی میں قانون کی تعلیم شروع کی اور میں انجینئرنگ پڑھنے فرانس چلا گیا۔ ہم مختلف تھے، اور ابھی تک ہیں، لیکن یہ بات ہماری دوستی کے استحکام میں رکاوٹ نہیں بنی۔ خلیج کی جنگ والی شکر رنجی کے بعد ہم نے بن کہے یہ فیصلہ کر لیا کہ سیاست پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ کل پرسوں ہی وہ مجھ سے ملنے آیا اور بولا کہ صدام کی بابت میری رائے درست تھی۔ اس نے حال ہی میں اقوام متحدہ کی ایک دستاویز پڑھی ہے جس میں عراقی خفیہ سروس کے ہاتھوں ہلبجہ پر زہریلی گیسیں چھوڑنے کی تفصیل دی گئی تھی، جس سے اس گاؤں کے سارے گرد باشندے سوتے میں مر گئے۔[3] میں نے اسے وہ قتل عام یاد دلایا جو صدام کے دشمن، شامی حافظ الاسد نے، جو صدام سے کہیں زیادہ ذہین تھا، حماہ میں کیا تھا۔[4]

3 جمعہ 16 مارچ 1988 کو عراقی کردستان کے قصبے ہلبجہ (Halabja) پر صدام حسین کی عراقی فوجوں نے کیمیائی ہتھیار استعمال کیے۔ زہریلی گیس سے کیے گئے اس حملے نے تین ہزار سے پانچ ہزار کے درمیان افراد کو ہلاک اور اس سے دگنے لوگوں کو زخمی کر دیا۔ اس واقعے کو "خونی جمعہ" (Bloody Friday) بھی کہا جاتا ہے۔

4 فروری 1982 میں شامی فوجوں نے مخالفوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے ہی ملک کے حماہ (Hamah) نامی قصبے پر بمباری کی جس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد مختلف اطلاعات کے مطابق سترہ ہزار سے چالیس ہزار تک تھی۔

Scanned with CamScanner

ایک نکتے پر ہمارا اتفاق ہے: عرب لوگ، خاص طور پر شرقِ اوسط کے رہنے والے، بدقسمت ہیں۔ مستزاد یہ کہ مغرب انھیں اس لیے عذاب میں ڈالتا ہے کیونکہ ان کے سربراہ مطلق العنان ہیں۔

''سیاست نکموں اور طفیلیوں کے لیے بنی ہے،'' میرا پرچون فروش کہتا ہے۔ جس واحد سیاست پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ادھار اور غلو آمیز قیمتوں کی سیاست ہے؛ اس پر دکان کے عقب میں بے وضو کیے نمازیں پڑھنے کے جنون کا اضافہ اور کر لیجیے۔

اکثر عباس بعضے حکومتی عناصر کو رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کام وہ براہ راست نہیں کرتا؛ اس کا شوفر، جو ایک چالاک اور وفادار شخص ہے، یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ وہ فطری ذہانت کا مالک ہے: ''اگر آپ کا کوئی کرایہ دار کرایہ نہیں دیتا تو آپ اس پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ اگر عام ذرائع استعمال کریں گے تو معاملہ چار یا پانچ سال تک گھسٹے گا۔ لیکن اگر آپ متوازی راستہ اختیار کریں تو معاملہ چند ماہ میں نبٹ جائے گا۔ اور صرف یہی طریقہ ہے جو کارگر رہتا ہے۔ مجھ پر اعتماد کیجیے، یہ نہ غیر اخلاقی فعل ہے اور نہ بد دیانتی۔ یہ معقول اور حقیقت پسندانہ طرزِ عمل ہے۔ آپ حکومتی رخنوں کو پاٹ رہے ہوتے ہیں، کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہوتے۔ میں پوری طرح قانون اور نظم و نسق کے حق میں ہوں۔ لیکن جب ہر فرد و بشر خفیہ دروازے سے گزر رہا ہو اور ہر معاملہ راہداریوں میں طے پا رہا ہو، تو اس کے برخلاف کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ملک اس طرح بہتر طور پر چلتا ہے۔ کیا ہمارے بس میں ایسے وسائل ہیں کہ اس نظام کو لات مار دیں؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ پھر یہ کہ لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ عام راستہ اختیار کرنے سے پہلے ہی، مثلاً، جا کر کوئی سرکاری کاغذ حاصل کرنا ہو — جو بہت آسان ہے — لوگ کسی بچولیے کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔'' عباس حقیقت پسند ہونے کا مدعی بھی ہے۔ وہ اسے قومی یکجہتی کے لیے اپنا نذرانہ قرار دیتا ہے۔ رشوت، در پردہ، ایک ضمنی ٹیکس ہے۔ ہر شخص اسے روا رکھتا ہے، اور مجھ جیسے لوگ، جو اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، انھیں جلد ہی جانداروں کی معدوم ہوتی ہوئی نسلوں کی طرح سینت کر رکھنا پڑے گا۔ ذاتی طور پر، اس طرح سینت کر رکھے جانے پر مجھے فخر ہوگا۔

میرا یہ فخر کب تک سلامت رہے گا؟ کیا یہ فخر وہ وسائل مہیا کر دے گا جن سے میرا بیٹا اپنی تعلیم جاری رکھ سکے، دمے کی مریض بیٹی کی دواؤں کی قیمت ادا ہو جائے اور کیا اس کے بل بوتے پر

میں اپنے مختصر سے گھرانے کو چھٹیاں منانے لے جا سکوں گا؟

کبھی کبھی مجھے اضافی ملازمت ڈھونڈنے کا خیال آتا ہے۔ میں کسی کمپنی کی حساب نویسی تو کر ہی سکتا ہوں، رات کے وقت اس کے دفتر یا اپنے گھر پر یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ عباس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اسے حساب نویس کی ضرورت نہیں، کہ وہ خود ہی یہ کام کر لیتا ہے، لیکن وہ کم از کم مجھے اپنے دوستوں سے متعارف تو کرا سکتا ہے۔ اسے مدد کرنا پسند ہے۔ اسے مدد کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے، لیکن معاملہ ایسی کمپنی کو ڈھونڈ نکالنے کا ہے جس کے پاس پہلے سے اپنا حساب نویس نہ ہو۔

معلوم نہیں کیوں، لیکن مجھ جیسے لوگوں کو کسی سرنگ میں سرگرداں رہنے کی سزا دی گئی ہے۔ اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ میں جب بھی کوئی راستہ اختیار کرتا ہوں تو وہ کھوکھلا نکلتا ہے اور سرنگ بن جاتا ہے، جس کے ختم پر اکثر ایک گڑھا ہوتا ہے۔ یہ ایسا ڈراؤنا خواب ہے جو مجھے اکثر دکھائی دیتا ہے۔ میں سڑک پر چلا جا رہا ہوں، تنہا، دن کی کھلی روشنی میں۔ ناگہانی روپوں سے بھرا ہوا بٹوا زمین پر پڑا نظر آتا ہے۔ میں اس کو اٹھانے کے لیے جھکتا ہوں، سڑک بھی جھک جاتی ہے، ایک ڈھلان بن جاتی ہے، بٹوا پھسل کر گرفت سے دور چلا جاتا ہے۔ پھر آسمان تاریک ہو جاتا ہے۔ میں جتنا آگے چلتا ہوں، ڈھلان اور طویل ہو جاتا ہے، اب میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا، پھسل جاتا ہوں اور کئی گز گہرائی میں زمین کے نیچے جا گرتا ہوں، گدلے پانی سے لبریز گلیارے میں۔ میں کسی نابینا کی طرح ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتا ہوں اور اسی طرح ساری عمر ٹامک ٹوئیے مارتا رہتا ہوں، یہاں تک کہ حلیمہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے، کیونکہ میرے بدن پر چڑھا ہوا لرزہ اس کی نیند میں مخل ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں میری نیند خراب ہونے میں سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھے سوچنے کا مرض ہے۔ جزئیات پر بہت زیادہ زور دیتا ہوں۔ اس پر اصرار کرتا ہوں کہ ہر شے کو اپنی جگہ پر ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سوچتا ہوں، بہت زیادہ سوچتا ہوں۔ یہ نہیں کہ میری فکر فلسفیانہ ہے۔ میں ایک پتھر پر دوسرا پتھر قرینے سے جمانے کا تصور کرتا ہوں۔ ہر چیز کا معائنہ کرتا ہوں، ہر عمل، ہر امرِ واقع کے عواقب کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری بیوی اسی کا الزام مجھ پر رکھتی ہے۔ میں مستقبل کو پڑھتا ہوں۔ ایسا نہیں کہ مجھ میں غیب بینی کی صلاحیت ہے، لیکن میں یہ پیش بینی ضرور کرتا ہوں کہ میرے اس یا اُس فعل کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ میں حساب شمار کرتا ہوں۔ اپنی سرنگ کی گہرائیوں میں، میں کبھی

Scanned with CamScanner

حساب کتاب کرنا بند نہیں کرتا۔ میرا باپ بالکل میری طرح تھا: ضرورت کے باعث کفایت شعار، احتیاط کرنے پر مجبور۔ کھانے پینے کے لیے ہمارے پاس کافی تھا، لیکن بس بمشکل ہی کافی۔ کسی قسم کا تعیش ناپید، فضول خرچی بالکل نہیں، ہر چیز اعتدال کے اندر۔ زیادہ تر لوگوں کے برخلاف وہ ادھار پر زندہ رہنے کا انکاری تھا۔ جب وہ مرا، میں اس کا اکاؤنٹ بند کرنے اپنے بھائی کے ساتھ بینک گیا۔ ہم یہ جان کر ہکا بکا رہ گئے کہ اس آدمی کی ساری جمع پونجی، جس نے چودہ سال کی عمر سے کام کرنا شروع کیا تھا، چند ہزار درہم سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں اس پر بڑی ہی محسوس ہوئی کہ اتنی مضحکہ خیز رقم جمع کرنے کے لیے اس نے ستر برس کی کڑی مشقت اٹھائی۔ اس وقت جا کر مجھے احساس ہوا کہ اس نے وہی کیا تھا جو اسے کرنا تھا: میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ بہت پست اور کنجوس ہے، جب دیکھو بھاؤ تاؤ کر رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کفایت شعاری کرنے پر مجبور تھا۔ اب مجھے اپنی بے ادبی پر، اس پر خست کا الزام دھرنے پر افسوس ہونے لگا۔ غربت ہمیشہ اچھی صلاح کار نہیں ہوتی۔ وہ آدمی کو قانون توڑنے پر، چوری کرنے پر، چکمادینے پر اور جھوٹ بولنے پر مائل کرتی ہے۔ لیکن وہ مائل ہونے والا نہیں تھا۔ اسے اپنے وقار پر فخر تھا؛ وہ ایک غریب آدمی تھا، لیکن ایک اچھا اور پوری تندہی سے کام کرنے والا آدمی۔ اسے کاہل الوجود اور غیر ذمے دار لوگ ناپسند تھے۔ وہ کہتا تھا کہ زندگی بڑی سفاک ہے، بے رحم اور ظالم ہے، لیکن حسین اور شاندار بھی۔ ''میں اس کے اول الذکر پہلو سے زیادہ واقف ہوں،'' وہ مسکرا کر اضافہ کرتا۔ مجھ میں اس کی شباہت ہے، لیکن کیا مجھ میں اس کی سی طاقت اور ہمت بھی ہے؟ ایک دن، ہمارے جھگڑے کے دوران، حلیمہ مجھ پر چلائی: ''تم بالکل اپنے باپ پر پڑے ہو!'' چونکہ وہ کہہ رہی تھی، یہ تضحیک تھی۔ وہ میرے باپ کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اور نہ وہ اسے۔ وہ حلیمہ کے گھر والوں کے فریب کارانہ طریقوں کی بابت اپنے محسوسات کھل کر ظاہر کر دیتا تھا جو لوگوں کی اندرونی خوبیوں سے زیادہ دکھاوے، عیش وعشرت اور روپے پیسے کی فکر میں رہتے تھے۔ وہ انھیں بخشنے والا نہیں تھا، اور اس سے بھی زیادہ — جو ہمارے لیے خاصی پریشانی کی بات تھی — وہ ان کی ریاکاری کو کھل کر بیان کر دیتا تھا۔ اسے خاموش کرنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ اسے ہر چیز کی قیمت معلوم تھی اور اپنی ایک ایک دمڑی کا حساب رکھتا تھا۔ اس پر اسے کوئی ندامت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ پیسے کے معاملے میں وہ سہل انگار نہیں تھا۔ میں بھی اس کی طرح ہوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر ایماندار

رہنا چاہتے ہو تو مالدار ہونا مشکل ہے۔ وہ اپنے ٹیکس ادا کرنے پر احتجاج کرتا تھا، کیونکہ اسے نظر نہیں آتا تھا کہ یہ رقم جاتی کہاں ہے۔ اس پر یہ کہ قرآنی قانون کے مطابق وہ اپنی آمدنی کا دس فیصد غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ زکوٰۃ کو مقدس سمجھتا تھا۔ لیکن جب کوئی ہٹا کٹا فقیر زکوٰۃ مانگتا، تو اسے دینے سے انکار کر دیتا: ''تم تندرست ہو، ہاتھ پاؤں رکھتے ہو، محنت مزدوری کر سکتے ہو...'' وہ اس سے کہتا۔ ''تم جیسے توانا آدمی کو ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آنی چاہیے!''

مجھے چاہیے کہ بلدیہ کو آگاہ کروں کہ ہر صبح مجھے بس لینے میں کتنی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلدیہ کاؤنسل اور بسیں خرید سکتی ہے۔ منجملہ دوسری چیزوں کے، اسی واسطے انھیں انتخابات میں چنا گیا تھا۔ لیکن افواہ ہے کہ یہ لوگ عوامی ٹرانسپورٹ کے معاملے میں بالکل بے حس ہیں؛ خود سرکاری کاروں میں گھومتے پھرتے ہیں اور مزہ یہ کہ پٹرول کے پیسے بھی نہیں دیتے۔ بہر کیف، وہ اپنے سودے طے کرنے میں مصروف ہیں، ان کے پاس بھلا اس کا وقت اور خواہش کہاں ہے کہ عوام کی فکر کرتے پھریں۔ لکھنے لکھانے سے کیا ہوگا، الّا یہ کہ ایسے خط غیر ملکی اخباروں کے پہلے صفحے پر شائع ہوں۔ اسی سے وہ حرکت میں آئیں گے۔ اکثر کوئی تبدیلی لانے کے لیے آدمی کو کسی غیر ملک کی وساطت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے، اگر *Le Monde*[5] یہاں کی روزمرہ کی زندگی کی بابت کوئی انکشافی مضمون وغیرہ شائع کرے، اور اگر صحافی کو ہماری واقعی حالت میں رہنا پڑے، تو ہمارے لیڈر لوگوں کو کافی پریشانی ہوگی۔ افسوس کہ ہمیں ردعمل کرنے کے لیے اس دن کا انتظار کرنا پڑے گا جب تک دارالبیضا قاہرہ اور نئی دہلی جیسا میگا سٹی نہیں بن جاتا۔ نادار شہری کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ میں بھی نادار شہری ہوں، چنانچہ مجھے پتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہوں۔ بلدیہ والوں پر مجھے یہ فوقیت حاصل ہے کہ واقعی صورتِ حال سے واقف ہوں اور خوب معلوم ہے کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

سنو، ایک آواز میرے اندر بھنبھنا رہی ہے: ''تم غریب شہری ہو، لیکن ایسا ہونا ضروری نہیں۔ تمھارا حال تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ اس متعفن بس پر سفر کرنے میں اپنی زندگی ضائع نہ کرو — ایک نہ ایک دن یہ تمھیں اجتماعی قبر میں دفن کر دے گی! اپنے بچوں کے مستقبل کا سوچو۔ جسے تم رشوت

---

[5] فرانس کا ایک مشہور و معروف اخبار۔

Scanned with CamScanner

کہتے ہو، یہ تمھاری ملکیت کی بازیافت کا ایک لطیف ذریعہ ہے۔ ہر کسی کا گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ لچک پیدا کرو، دیرینہ دوست، لچک ہی زندگی ہے۔ آگے بڑھو، اپنی بس میں سوار ہو جاؤ، اپنے کو کچل جانے دو، دھکے کھاؤ، تمھاری ناک اس آدمی کے منھ سے سٹی ہے جو کبھی دانت نہیں مانجھتا، کیونکہ دانت ندارد ہیں، اور سانس سے سخت بدبو نکلتی ہے، اس ڈاکیے سے اپنی درگت بنواؤ جو صفائی کرنا بھول گیا ہے اور تمھیں تحفتاً پسو دے جائے گا، تمھیں، جو وزارتِ ترقیات کے افسر ہو۔ جب تم بس سے اترتے ہو، تمھارا واحد سوٹ شکن آلود ہو چکا ہوتا ہے، تم سے بدبو آرہی ہوتی ہے، اور تمھارے پیر درد کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ انھیں روندا گیا ہے، اور تم آہ بھی نہیں نکال سکتے۔ نفرت انگیز آدمی! تمھارے باپ نے بھی تمھیں ایسی کھٹارا بس میں سوار ہونے سے روکا ہوتا: یہ نہ صرف شہر کو آلودہ کرتی ہے، بلکہ کسی دن بھی ان بیچاروں کے بوجھ سے الٹ سکتی ہے جن کے پاس اس میں چڑھنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ کم از کم تم ضرور اپنی حالت بدل سکتے ہو۔ تم اپنے بیوی بچوں کو زیادہ شائستہ، باعزت، اور لچکدار زندگی فراہم کر سکتے ہو۔ ہاں، بالکل، میرے دوست، لچکداری، لچکداری۔۔۔ اور تم دیکھو گے کہ اس کے پیچھے پیچھے سب کچھ چلا آئے گا۔ تم پوچھتے ہو کہ 'سب کچھ' کیا ہے؟ بالکل درست۔ یہ غیر واضح سا فقرہ ہے۔ چلو تصور کریں۔ تصور کرنا تمھارے لیے سہل ہے، تم تو اس کے ماہر ہو۔ تم اپنی ساری زندگی چیزوں کا تصور کرنے ہی میں تو گزارتے ہو۔ اچھا، تو چلو، اس 'سب کچھ' کا فرداً فرداً ذکر کریں۔ سب سے پہلے کار خریدتے ہو، نئی نہ سہی، بلکہ ایک اچھی حالت والی استعمال شدہ کار۔ تم طنجہ جاتے ہو، وہاں تمھیں بے شمار غیرملکی کاریں ملتی ہیں جو بیرون ملک کام کرنے والوں کی ملکیت ہیں۔ تم ڈیزل سے چلنے والی مرسیڈیز 240 خریدتے ہو؛ سو ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ کار ہاتھ آجائے تو تم حرکت کرنے لگو گے۔ مثلاً نئے مکان میں منتقل ہو جاؤ گے۔ یہ آسان نہیں، لیکن وقتی طور پر کرائے کا مکان لیتے ہو۔ تمھارے موکلوں میں سے کسی کے پاس کرائے پر دینے کے لیے مکان تو ہوگا ہی۔ تمھیں بس اتنا کرنا ہے کہ خبر پھیلا دو۔ مکان مل جائے تو تم اسے ساز و سامان سے آراستہ کرتے ہو۔ یہ کام حلیمہ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد تمھیں لوگوں کی آؤ بھگت کرنے کی بابت سوچنا ہوگا۔ اگر تم اپنے موکلوں کی آؤ بھگت گھر پر نہیں کرتے تو اپنے کاروباری لین دین میں آگے نہیں بڑھ سکو گے۔ یہ بالکل واضح ہے۔ اس کے بعد تمھیں اپنے لباس پر توجہ دینی ہوگی۔ آدمی کی خارجی نمود ہی سب کچھ ہے۔ اگر تم

Scanned with CamScanner

غریب ہوتو اس لیے کہ غریب آدمی جیسے نظر آتے ہو۔ خوشحال آدمی فوراً پہچانا جاتا ہے۔ یہ دولت کی نمائش کی بات نہیں ہے، لیکن مخصوص واضح علامتیں بہر حال ہوتی ہیں۔ تمھارے لیے باہر نکلنا ضروری ہے، وقتاً فوقتاً ریستورانوں میں جاؤ تاکہ اہم لوگوں کے ساتھ محوِ طعام نظر آسکو، تاکہ سب پر یہ بات کھل جائے کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو جو ہاتھ روک کر خرچ کرتا ہے۔ بیرے کے لیے بھاری بخشش چھوڑنا بے حد اہم ہے؛ اس سے تم بیک وقت مالدار اور فراخدل نظر آؤ گے۔ مسجد جانا بھی ضروری ہے، جیسے جمعے کے دن۔ تمھیں کوشش کرنی ہوگی، اپنی لامذہبیت اور خدا منکری کو ایک طرف رکھنا اور کھیل کھیلنا ہی ہوگا۔ سوسائٹی اسی کا نام ہے۔ ایک غیر مختتم کھیل۔ تمھیں جوڑتوڑ اور سازباز سے واقف ہونا پڑے گا، یہ جاننا ہوگا کہ ایک مقام سے دوسرے کی طرف کیسے حرکت کی جاتی ہے، رکاوٹوں پر کیسے غالب آیا جاتا ہے، مشکلات کو کیسے جُل دیا جاتا ہے، فضول چیزوں سے کیسے چھٹکارا پایا جاتا ہے، جیسے اخلاقی تاملات اور مجرم ضمیری۔۔۔''

ان تھک آواز بولے جاتی ہے، بولے جاتی ہے، میرے خون میں دوڑتی ہے، اپنے آہنگ کا تعاقب کرتی ہے، جبکہ میں، کبھی اس پر توجہ دیتا ہوں، کبھی کان بند کر لیتا ہوں، آنکھیں موند لیتا ہوں، اس بس میں جو ایسی سڑک پر تیزی سے دوڑی جا رہی ہے جو ہو نہ ہو آسمان کی چھت ہوگی؛ میں بمشکل ہی کھڑکی کے باہر دیکھ پاتا ہوں اور صرف سرخ، سبز، اور پیلے مرغزاروں کا ایک سلسلہ ہی نظر آتا ہے۔ اور میں گھاس اور پھولوں کے اس تصادم کے اوپر بہا چلا جا رہا ہوں، اس سے غافل کہ جو شخص میرا سینہ کچلے دے رہا ہے بہت موٹا ہے اور اس کے پسینے کی بساند میرا دم گھونٹے دے رہی ہے۔ آواز مجھے برہم کر رہی ہے، یہ میری آنتوں میں کسی اجنبی جسم کی طرح گردش کر رہی ہے، ہر طرف دوڑتی پھر رہی ہے، میرے اوپر منڈلا رہی ہے، پھر میرے حلق کے تلے میں سمٹ آتی ہے۔ میں کان میں روئی ٹھونس لوں تب بھی سنائی دیتی ہے۔ ''تو دنیا کو بدل کیوں نہیں دیتے!'' میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ وہ جواب دیتی ہے، ''نہیں، تم اپنی زندگی کا ڈھرا بدل دو۔'' میں اسے چلّاتے اور زور دے کر کہتے ہوئے سنتا ہوں: ''اپنی زندگی!'' یوں جیسے میں بہرا ہوں۔ پھر یہ آواز ناگوار اور ہتک آمیز ہو جاتی ہے: ''دنیا کو بدل دو! ہنہ، خود کو شاعر سمجھتا ہے، انقلابی، ہیرو۔ بیچارہ! یہ معاملہ تمھاری بسورتی ہوئی

Scanned with CamScanner

زندگی کو بدلنے کا ہے، اسے قدرے کم رقت انگیز بنانے کا، بس۔ دنیا کو تم نہیں بدل سکتے، اور زندگی کو تمھارے بے بضاعت، قابلِ افسوس وجود کی ذرا پروا نہیں، یہ دو ٹکے جتنی بھی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ جانتے ہو؟ امریکہ میں تمھاری زندگی ایک ڈالر کے برابر بھی نہیں۔ اگر کوئی تمھیں قتل کرنا چاہے تو کسی کرائے کے قاتل کو ایک ڈالر دے کر تمھارا قصہ پاک کروا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ تمھارے اسسٹنٹ حاج حمید کا کام تمام کروانا چاہے تو کئی ہزار دینے پڑیں، اس لیے کہ حاج حمید تم سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہ ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہے اور دوسروں کا سہارا بنتا ہے۔ تم اپنے بچوں تک کی کفالت نہیں کر سکتے، جبکہ تم ایک دفتر کے سربراہ ہو جہاں تمھارے اسسٹنٹ کے دل میں تمھارے لیے حقارت پرانی بستی کے کسی بوسیدہ گھر کی دیوار کی پھپھوندی کی طرح پھیلتی جا رہی ہے، بستی کا وہ گھر جہاں تمھاری بیچاری ماں سردی اور رطوبت سے فنا ہو رہی ہے۔ جب وہ جاں بحق ہو گی تو اس میں قصور تمھارا ہوگا: خطرے میں گھرے ہوئے فرد کی مدد نہ کرنے کا قصور۔ تمھاری ماں اچھے اور آرام دہ گھر میں رہنے کی مستحق ہے، جس میں نوکر چاکر ہوں، باورچی ہو، کار اور شوفر ہو۔ تمھارا باپ اس کے لیے کچھ نہیں چھوڑ گیا تھا۔ لیکن تم تھوڑے بہت تخیل کا استعمال تو کر ہی سکتے ہو، اپنی عزیز ترین اور اپنے سے قریب ترین ہستیوں، پہلے ماں، پھر اولاد، اور بالآخر بیوی کے کچھ تو کام آ سکتے ہو۔ باقی رہے تم خود، تو تم سادہ زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہو اور اسے جاری رکھ سکتے ہو، اس پر کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔ کچھ معلوم ہے؟ میں تمھاری آواز ہونے پر شرمندہ ہوں۔ ہر بار جب تم مجھے استعمال کرتے ہو، مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔ تم مجھے فضول میں استعمال کرتے ہو۔ کم از کم کاروبار کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے جایا کرو، تاکہ معاہدوں کو طے کر سکوں، دلچسپ منصوبوں کے بارے میں گفت و شنید کروں، جاپان کا سفر کروں، ہاں بالکل، میں تم سے جان چھڑانے اور کسی اصلی آدمی کے اندر خود کو پانے کا خواب دیکھتی ہوں، ایسا آدمی جو رئیس ہو، جس کی عزت کی جاتی ہو۔ تمھیں تو کوئی سلام بھی نہیں کرتا، تم اتنے نادار ہو۔ تمھارا وجود ہی نہیں۔ اب تم کسی کو دکھائی تک نہیں دیتے۔ تم دفتر پہنچتے ہو تو شاؤش یہ سوچتا ہے کہ کوئی بھک منگا پیسہ دھیلا لینے آ گیا ہے۔ کیا تم نے اپنا جائزہ لیا ہے؟ تمھیں پتا ہے کیسے دکھائی دیتے ہو؟ جس طرح سر جھکائے چلتے ہو، دیواروں سے بھڑ کر؟ اچھا یہ بتاؤ کہ حلیمہ کو کس طرح راغب کر پائے۔ اس نے تم سے کیسے شادی کر لی؟ وہ تم سے کسی بہتر ساتھی کی مستحق ہے، اور تم یہ جانتے

Scanned with CamScanner

بھی ہو، ہمیشہ اپنے سے یہی کہتے بھی ہو۔ اور یہ خیال کہ تم خوبصورت نجیبہ کو پٹا لینے کا خواب دیکھتے ہو۔ کیا نہیں جانتے کہ وہ حلیمہ سے کہیں زیادہ تقاضے کرنے والی ہے، ایک سے زیادہ تریاجہ تر رکھتی ہے؟ اچھا ہوگا کہ آزما دیکھو۔ ہوسکتا ہے کہ قائل ہو جاؤ کہ تمھارا واحد حل لچکداری ہی ہے۔ اب میں منھ بند کرتی ہوں۔ رخصت ہوتی ہوں۔ تمھارے ضمیر کے دباؤ سے جان چھڑاتی ہوں، جس کا بوجھ ٹن بھر سے زیادہ ہی ہوگا۔ یہ مجھے کچلے دے رہا ہے، میرا دم گھونٹ رہا ہے، مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ کچھ پتا ہے؟ میں تمھارے ضمیر کی دشمن بن گئی ہوں۔ یہ ساری گنجائش پر قابض ہوگیا ہے۔ ایک دن یہ تمھارا دم بھی گھونٹ دے گا۔ میں یہاں سے روانہ ہوتی ہوں۔ الوداع، میرے دوست۔ میں پیچھے وہ دوسری آواز چھوڑے جا رہی ہوں، وہ سخت، خشک آواز جو تمھارے ضمیر کی حلیف ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔''

بس اچانک بریک لگاتی ہے۔ بعض مسافر اپنے آگے والوں کے اوپر جا پڑتے ہیں۔ کچھ بالکل ونڈ اسکرین سے سٹ گئے ہیں۔ بیچارے ڈرائیور کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، اس کمپنی میں کام کرنے کی سزا ملی ہے۔ ''کم از کم تم روزی سے تو لگے ہوئے ہو!'' ایک مسافر اسے جواب دیتا ہے۔ ''خدا کا شکر، کم از کم یہ تو ہے۔'' ''خدا کا اس سے کیا لینا دینا ہے!'' ایک اکل کھرے بڑے میاں آواز لگاتے ہیں، آنکھیں چمک رہی ہیں۔ ایک باریش صاحب نعرہ لگاتے ہیں، ''اللہ اکبر! اللہ اکبر! تم سب جہنم میں جاؤ گے!'' بس رک گئی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھلوں کی چھوٹی سی گاڑی کے گرد، جسے ایک تھکا ماندہ گدھا کھینچ رہا ہے، اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی ہے۔ سب کچھ الٹ کر بکھر جاتا ہے۔ بظاہر مالک کو، جو ایک بوڑھا آدمی ہے، اپنے گدھے جتنا تھکا ماندہ، چوٹ نہیں لگی ہے۔ وہ جھک کر اپنی بکھری ہوئی نارنگیاں اور کیلے چننے لگتا ہے۔ لوگ اس کی مدد کرتے ہیں۔ ''کچھ نہیں ہوا،'' وہ کہتا ہے، ''مجھے پولیس یا ایمبولینس نہیں چاہیے۔'' وہ خوفزدہ ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ ایک پولیس افسر آ پہنچتا ہے۔ ''خبردار جو کسی چیز کو چھوا! مجھے اپنے کاغذات دکھاؤ۔''

''گھر پر ہیں۔''

''میں نہیں مانتا۔ چلو، تھانے چلو۔''

لوگ مداخلت کرتے ہیں۔ بڈھا ایک لفافہ پھلوں سے بھرتا ہے اور افسر کے آگے کر دیتا ہے،

Scanned with CamScanner

جو کہتا ہے، ''تمھارا خیال ہے مجھے اس سے خرید لو گے؟ چلو، میرے ساتھ تھانے چلو!''

بس دوبارہ چل پڑتی ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے رکھتا ہے۔ مجھے طرح طرح کی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھے فربہ آدمی کا خیال ہے کہ بڈھا سو درہم کے عوض چھوٹ سکتا ہے۔ ''تمھارا مطلب ہے سو درہم فی افسر!'' ایک اور اس کا جواب دیتا ہے۔ ''یعنی مل ملا کر لگ بھگ ہزار درہم، اور یہ بھی اس صورت میں جب پولیس والے بھلے لوگ ہوں۔'' میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، پولیس کی حمایت میں۔ بہر کیف، ہمارے پاس ثبوت وبوت تو کوئی ہے نہیں۔ افسروں نے اپنی ذمے داری پوری کی ہے۔ ان پر پہلے ہی سے رشوت خور ہونے کا شبہ کیوں کیا جائے؟ یہ سب میری دوسری آواز کہتی ہے، میری خوش گمان، نرم خو، انصاف پسند آواز۔ پھر وہ شر کی آواز پر کان دھرنے پر مجھے لعن طعن کرنا شروع کر دیتی ہے: ''تم چالیس سال کے ہو، ایماندار کارگزار ہو، اپنی راست بازی اور وقار قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے ہو، اس کے باوجود ڈھیلے پڑنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ میں محسوس کر سکتی ہوں۔ علامتیں اس کی چغلی کھا رہی ہیں۔ ورنہ کل کرائے کے مکانوں کے بارے میں پوچھنے کے لیے دلاّل کے پاس کیوں گئے تھے؟ کہتے ہو، معلومات حاصل کرنے کے لیے! اور پرلے دن مرسیڈیز گیراج پر کیوں ٹھہر گئے تھے؟ کہتے ہو، یونہی نظارہ کرنے کے لیے! جی چاہتا ہے تمھاری بات پر یقین کر لوں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ مجھے معلوم ہے تم کیا سوچتے ہو۔ بہر کیف، اسی لیے تو میں یہاں موجود ہوں۔ میں تمھاری کھال سے چپکی رہتی ہوں اور تمھاری نیندوں پر دھاوا بولتی ہوں۔ میں ہی تمھاری بے خوابی کی ذمے دار ہوں۔ تمھاری کوئی بھی خواب آور ٹکیہ مجھ پر کارگر نہیں ہوتی — ان کا استعمال تج کر تم نے اچھا ہی کیا۔ میں تمھیں قانون، اصول، فرائض اور راست بازی یاد دلانے کے لیے ہوں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے؛ میرے اختیارات محدود ہیں۔ اگر تم رسی تڑا کر فرار ہونے، رعایتیں قبول کرنے اور رفتہ رفتہ اپنے اصولوں اور معیاروں سے بھٹک جانے کا فیصلہ کیے بیٹھے ہو، تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ ٹھیک ہے، میں تمھیں سونے سے باز رکھوں گی، لیکن کب تک: میں تمھاری سب سے چھوٹی بیٹی کی اعلیٰ سمجھ بوجھ اور ذہانت سے رجوع کروں گی۔ کریمہ تمھیں کبھی اتنی کند ذہنی کے ساتھ اپنی عزت سے دستبردار ہو جانے کی اجازت نہیں دے گی۔ وہ تمھارا ضمیر ہے جو خود کو مجرم محسوس کرتا ہے۔ جب تم اپنے ہوش و حواس سے جاتے رہو گے تو وہ میری جگہ لے لے گی۔ مجھے کریمہ سے

Scanned with CamScanner

الفت ہے۔ بارہ سال کی ہے لیکن کہیں زیادہ بالغ۔ اس کی بلوغت قابلِ ذکر ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ وہ محض اپنی نگاہوں اور خاموشیوں سے اپنی ماں کو ڈرا دھمکا دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم کسی ایسی چیز میں الجھ جاؤ جس کا نصف بھی نہیں جانتے، کریمہ کا سوچو۔''

بس سے اترتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے کوٹ کی بائیں جیب پھٹی ہوئی ہے۔ میں اس حالت میں دفتر نہیں جا سکتا۔ بہتر ہوگا کہ کوٹ اتار دوں اور غیر رسمی اور بے تکلف نظر آتا ہوا داخل ہوں۔ لیکن لوگ بھلا کہاں سمجھیں گے؛ یہ سردیوں کا زمانہ ہے۔ تو کیا ہوا؟ مجھے حق حاصل ہے کہ اپنا کوٹ شانے پر اٹھائے چلوں۔ شاؤش کیا سوچے گا؟ وہ واقعی مجھے جز بز کر دیتا ہے۔ یہ شخص، دیہاتی گنوار، امدادی فوج کا سابقہ رکن، اس نے ایک بار مجھے رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ ایک دن، عید سے پہلے، اس نے مجھے ایک بھیڑ پیش کی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اسے برا لگا، لیکن اس کی یہ حرکت کسی طرح معصوم نہیں تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر اپنی خدمات بیچ رہا تھا، لوگوں کے واسطے دستاویزات فراہم کرتا اور ملاقاتیں طے کراتا تھا۔ اس کی دو بیویاں ہیں، آٹھ عدد بچے، اور ایک موٹر سائیکل۔ ایک دن بڑی دیدہ دلیری سے مجھے اس پر بٹھا کے گھر پہنچا آنے کی پیشکش کی۔ میں مزدور طبقے کے خلاف نہیں، لیکن یہ چپراسی جان بوجھ کر میری ہتک کرنا چاہتا تھا۔

میں دروازے سے اندر داخل ہوتا ہوں، اتفاق سے میرا دشمن، شاؤش، موجود نہیں ہے۔ حاج حمید ابھی تک نہیں پہنچا۔ میری ڈیسک کے خانے میں سوئی دھاگا ہے۔ دھاگا پرونے میں مجھے بڑی دقت ہو رہی ہے۔ میری بینائی جا رہی ہے۔ میں جھنجھلا جاتا ہوں۔ میرے ہاتھ لرز رہے ہیں۔ بالآخر کامیاب ہوتا ہوں۔ میں جیب سینے لگتا ہوں، جو مجھے سراسر حماقت معلوم ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر حاج حمید میرے پاس آ نکلے تو واقعی شرمندگی محسوس ہوگی۔ وہ میرا مذاق اڑائے گا، اور اس میں حق بجانب ہوگا۔ میں اپنے موزے بھی خود ہی رفو کرتا ہوں؛ حلیمہ اس سے انکار کرتی ہے۔ وہ صرف بچوں کے کپڑے ہی رفو کرتی ہے۔ کیسی افسوسناک تصویر ہے: چالیس سالہ، کالج کا سند یافتہ، پیشہ ور آدمی، شادی شدہ، دو بچوں کا باپ، اپنی ڈیسک کے پیچھے بیٹھا اپنے کوٹ کی پھٹی ہوئی جیب ٹانک رہا ہے! باہر سے دیکھنے پر یہ منظر قابلِ رحم اور پر لطف نظر آتا ہے۔ پہلے، شاؤش میرے لیے پودینے کی چائے

کا گلاس لایا کرتا تھا۔ یہ ایک روایت تھی۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے بھول جاتا ہے۔ ہر بار، اسے بلا کر منگوانا پڑتا ہے۔ حاج حمید کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں نجیہ کو فون کرتا ہوں: میں اسے سوتے سے اٹھا رہا ہوں: میری قسمت ملاحظہ ہو۔ اس کی آواز میں دوری ہے۔ میں اعتذاراً کچھ بڑبڑا دیتا ہوں، کہتا ہوں کہ غلطی سے اسے فون کر دیا۔ وہ اکیلی سوتی ہے۔ اس کی ماں اپنا وقت اس کے اور اس کی چھوٹی بہن کے درمیان گزارتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس سے اتفاقیہ ملاقات ہو: اور 'اتفاق' میں پیدا کر ہی لوں گا۔ بس مجھے اتنا ہی کرنا ہوگا کہ جب اس کا اسکول چھوٹ رہا ہو تو وہاں سے گزروں۔ میں اس کی رفاقت کرنے کی پیشکش کروں گا اور ہم کچھ راستہ ساتھ ساتھ چلیں گے۔ اگر موسم اچھا ہوا تو پیدل، ہوسکتا ہے چند cornes de gazell کھانے کے لیے رینے ساں پیسٹری شاپ پر ٹھہر جائیں۔ سبک سی تو ہے؛ میٹھی چیزیں زیادہ تو کیا کھاتی ہوگی۔

حاج حمید داخل ہوتا ہے اور مسٹر صبان کی فائل میری ڈیسک پر ڈال دیتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے، گویا اس کا ماتحت ہوں، کہ مجھے اس کا جلد از جلد تصفیہ کر دینا چاہیے۔ میں فائل کھولتا ہوں، خاکوں اور بلیو پرنٹس کا معائنہ کرتا ہوں۔ کھڑے ہو کر دفتر میں چکر لگانے لگتا ہوں۔ کھڑکی کے پاس جاتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں، اور دو موٹر سائیکل والوں کی جھڑپ ہوتے دیکھتا ہوں۔ عجیب بات ہے، اچانک لوگ زیادہ جارحیت پسند لگنے لگے ہیں۔ ذرا سی بات پر اچھی خاصی تو تو میں میں ہوسکتی ہے۔ حاج حمید بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے، پھر گالم گلوج کی آواز سے متنبہ ہو کر دوبارہ بیٹھ جاتا ہے۔

''سب خشک سالی کا کیا دھرا ہے،'' وہ فلسفیانہ انداز میں کہتا ہے۔

''تمھارا مطلب ہے، لوگ اس لیے لڑ رہے ہیں کہ بارش نہیں ہوئی؟''

''ظاہر ہے! آسمان جتنا نیلا ہوگا، اتنی ہی لوگوں کی جیب خالی ہوگی۔ بالکل فطری بات ہے۔ ہاں، تو تم نے مسٹر صبان کا کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''سبھوں کی طرح اسے بھی بولی دینی ہوگی۔''

''بالکل، ضرور دے گا۔ یہ تو رسمیات کی بات ہے، جیسا کہ تم جانتے ہو، اور ہمارا کام یہ پکا کرنا ہے کہ رسمیات ہمواری کے ساتھ پوری ہوں۔ فائل کا بغور مطالعہ کرو۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ گھنٹہ بھر بعد لوٹوں گا۔ کمر درد کر رہی ہے۔ لگتا ہے یہ انٹلیکچول لوگوں کی بیماری ہے۔ تم سے بعد میں

Scanned with CamScanner

ملوں گا۔ فائل کا کوئی صفحہ بھی نظر انداز نہ کرنا۔''

میں اس کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حاج حمید اس کا مطالعہ کرنے پر اتنا اصرار کیوں کررہا تھا۔ دو فائلوں کے درمیان ایک موٹا سا لفافہ پڑا ہے جس پر کوئی تحریر نہیں۔ سفید لفافہ۔ یہ کسی کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے اندر کیا ہے، لیکن پھر بھی اسے کھولتا ہوں۔ سو سو اور دو دو سو درہم کے نوٹوں کی دو گڈیاں۔ میں انھیں گنتا ہوں۔ نوٹ نئے ہیں۔ میں دوبارہ گنتا ہوں۔ راہداری میں آواز سنائی دیتی ہے اور میں جلدی سے انھیں پھر واپس لفافے میں رکھ دیتا ہوں۔ میرے جسم پر لرزہ طاری ہے۔ اتنے نوٹ میرے ہاتھوں میں کبھی نہیں آئے۔ میں نوٹوں کو لفافے میں رہنے دیتا ہوں اور ظاہر کرتا ہوں جیسے فائل کے صفحے پڑھ رہا ہوں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور بیس ہزار درہم کی بابت سوچ رہا ہوں۔ اپنے سے کہتا ہوں کہ یہ شروعات ہوسکتی ہے۔ صرف چند منٹ میں میں اپنی ماہانہ تنخواہ سے چار گنا کما سکتا ہوں۔ اگر میں یہ عمل دہراؤں تو دو ہفتوں میں مالدار ہو جاؤں گا۔ میں فائل کو بند کر دیتا ہوں اور دن سپنا دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی بڑی اچانک ہوگی۔ ہر شخص شبہے میں پڑ جائے گا۔ خوشی سے میری بیوی کی باچھیں کھل جائیں گی، لیکن اس کی ماں مجھے یہ یاد دلانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی کہ میری راست بازی پہلے جیسی نہیں رہی۔

میں فائل بند کر دیتا ہوں اور اس کے گرد ایک ربڑ بینڈ ڈال دیتا ہوں۔ اپنے سے دور کھسکا دیتا ہوں اور اسے تکتا ہوں۔ اس کا حجم مجھ پر طعنہ زنی کررہا ہے۔ ہاں، شروعات اسی طرح ہوتی ہے۔ ایک بے نام کا سفید یا خاکستری لفافہ۔ جیسے سڑک پر بٹوا پڑا مل جائے۔ بالآخر اندر سے مال نکال کر بٹوا کوڑے کے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ مجھے لفافہ خالی کر دینے کی ترغیب ہو رہی ہے۔ اگر خالی کرتا ہوں تو اس کے بعد پیچھے مڑنا ناممکن ہو جائے گا۔ کل پرزے حرکت میں آجائیں گے۔ میری زندگی بدل جائے گی: 'لفافے سے پہلے' اور 'لفافے کے بعد'۔ میں اٹھتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں، اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے ایک عورت بالکونی میں بیٹھی، بالوں کو مہندی لگاتی نظر آتی ہے۔ یہ بڑا شہوت انگیز پیکر ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں؛ میں مہندی کی خوشبو کو، عورت کی جلد کی بو باس کو تقریباً سونگھ سکتا ہوں۔ اس سے اوپر والی بالکونی میں ایک نوجوان لڑکی، غالباً کوئی نوکرانی،

Scanned with CamScanner

کپڑے سکھا رہی ہے۔ دو عمارتوں کے درمیان ٹھنسی ہوئی چھوٹے سے گھر کی ٹیرس پر کوئی بچہ بلی کے بلونگڑوں سے کھیل رہا ہے اور اس کی ماں سیاہ زیتون سکھانے کے لیے پھیلا رہی ہے۔

نیچے، بس اسٹاپ پر انتظار کرنے والوں کی قطار بڑھتی جا رہی ہے۔ افراتفری کا عالم ہے۔ جب بس آ کر کھڑی ہوتی ہے، سیاہ دھویں کی گھنگھور گھٹا ایگزاسٹ پائپ سے دھماکے مارتی ہوئی خارج ہوتی ہے۔ برابر کا ڈونٹ فروش لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہر چیز سے ڈیزل کی بساند آ رہی ہے۔ سگریٹ کے ٹوٹے سے میری انگلیاں جلنے لگی ہیں۔ میں اپنی ڈیسک پر لوٹ آتا ہوں اور پھر وہی فائل مخل ہو جاتی ہے۔ ڈیسک کی سطح پر اگر کچھ نظر آ رہا ہے تو وہ صرف مسٹر صبان کی فائل ہے۔ اس کا حجم کچھ اور بڑھ گیا ہے، اس کے ابعاد غیر معمولی ہیں۔ میں آنکھیں مسلتا ہوں۔ میں فریب ہائے خیال میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میرا مجرم ضمیر میری بصارت پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ میں اس نازک فائل کا معائنہ کسی اور وقت پر ٹال دیتا ہوں۔ اور یہی حاج حمید سے کہتا ہوں جو بار بار 'نازک' کا لفظ دہرا رہا ہے۔ وہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ ہمارے درمیان ساجھے داری کی ابتدا ہو رہی ہے۔ وہ اٹھ کر میرے لیے قہوہ یا کوئی اور مشروب لانے کی پیشکش کرتا ہے۔ اپنے دل میں یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اپنے اشتراک کی خوشی منانے والے ہیں۔ وہ غلطی پر ہے۔ میرا خیال ہے وہ غلطی پر ہے۔ مجھے یقین نہیں۔ مجھے تو کسی چیز کے بارے میں یقین نہیں۔ میں صرف خیالی پرواز کر رہا ہوں۔ وہ قہوہ اور کوک لے کر لوٹتا ہے۔ میں قہوہ لیتا ہوں۔ وہ اپنی بوتل کو یوں اوپر اٹھاتا ہے جیسے میری صحت کے لیے پی رہا ہو۔ ''چیرز!'' وہ کہتا ہے۔ کیسی لغو بات ہے، کہ آدمی کوک کی بوتل اور قہوے کے پیالے پر دوسرے کی صحت کا دعا گو ہو! اس صورتِ حال میں کوئی چیز بے تکی ہے۔ وہ قریب آ کر میرا شانہ پکڑ لیتا ہے۔

''زندگی ہمیشہ رحم دلی نہیں برتتی۔ تمھیں بہاؤ کا ساتھ دینا چاہیے۔ نہیں دو گے تو دم گھٹ جائے گا۔ ایسے موڑ آتے ہیں جب ہر کسی کی جیت ہوتی ہے، اور یہ سب لچکداری سے کیا جاتا ہے۔ میں تمھیں ایک دوست کا پتا دوں گا جو فرانس سے لوٹتے وقت ڈیزائنر سوٹ لاتا ہے۔ اس سے کہنا کہ میں نے تمھیں بھیجا ہے اور وہ تمھیں اچھی قیمت پر دے دے گا۔ یہ سب اس کے اپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ یہ وہی ہے جو میرے لیے لباس کا انتخاب کرتا ہے اور ہمارا ڈائریکٹر بھی اسے بہت پسند کرتا ہے۔ اسے

Scanned with CamScanner

فوری قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک اچھا سا سوٹ چن لینا، خاکستری رنگ کے سوا کوئی اور، اور مطمئن ہو جاؤ۔''

مجھے یہ 'لچکداری' خود کو مغلوب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں کسی ملائم پروں سے بھرے صوفے سے اس کا موازنہ کرتا ہوں جس میں آدمی کا جسم بڑی گدازی سے دھنس جاتا ہے۔ سر پیچھے ڈال کر میں خود کو آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔ حقیقی دنیا اب دکھائی نہیں دے رہی، مجھے اب اپنے عضلات موجود محسوس نہیں ہوتے۔ میں کہیں اور ہوں، بحیرۂ روم پر بہتی ہوئی کسی بادبانی کشتی میں، میری آنکھیں بند ہیں، ہوا میرے چہرے کو ہولے ہولے سہلا رہی ہے؛ میں خوش ہوں۔ ٹیلیفون بج اٹھتا ہے۔ ڈائریکٹر ہے، بڑی پرسکون آواز میں بول رہا ہے۔ ہو نہ ہو یہ سازباز کی آواز ہے۔ وہ اپنے گھر بعض دوستوں کے ساتھ، جن میں مسٹر صبان بھی شامل ہوگا، ڈنر کا بتاتا ہے۔ سب کچھ واضح ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا میں نے فیصلہ کر لیا ہے؛ بس یہی اسے معلوم نہیں۔ پھر حلیمہ فون کرتی ہے۔ بتاتی ہے کہ کریمہ پر پھر سے دمے کا دورہ پڑ گیا ہے اور کہتی ہے کہ وینٹولین خرید تا لاؤں۔ لیکن دراصل اس کے لیے تبدیلیِ آب و ہوا سب سے بہتر رہے گی۔ میں اسے فاس اپنی ماں کے پاس بھیج سکتا ہوں، لیکن وہاں گھر میں رطوبت ہے۔ مراکش کی ہوا کریمہ کے لیے زیادہ موزوں رہے گی اور وہاں ہمارا ایک عم زاد بھی رہتا ہے۔ لیکن میں اس سے کچھ وقت کے لیے کریمہ کو اپنے یہاں رکھنے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ اپنے والد کی طرح، کسی چیز کے لیے میں بھی کسی کا احسان مند نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن یہی عم زاد بن بلائے مہمان کی طرح ہمارے گھر آ ٹپکتا ہے اور بچوں کے کمرے میں سوتا ہے۔

جب کریمہ پر دمے کا دورہ پڑتا ہے تو مجھے تکلیف پہنچتی ہے اور اس کو آرام نہ پہنچا سکنے پر میں خود سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ تھوڑا بہت خرچہ کرنے سے ہم اس کی تکلیف کو کم کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ مرض خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

اب میں پھر دفتر میں تنہا ہوں۔ فون کو منقطع کر دیتا ہوں تاکہ سکون سے سوچنے کی مہلت مل سکے۔ سوچتا ہوں، کیا دوسروں کو بھی ایسی ہی وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، ان کے شکم میں بھی گرہیں پڑ جاتی ہوں گی، حلق خشک اور ہاتھ لرزنے لگتے ہوں گے؟ مجھے اب پتا نہیں کہ میری کپکپاہٹ کی وجہ سگریٹ ہے یا حالات۔ میں اٹھتا ہوں، دایاں بازو بڑھاتا ہوں، ہاتھ کی پشت پر ایک ورق رکھ کر

دیکھتا ہوں کہ کپکپاہٹ کتنی ہے۔ جسم کی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمارے ورزشی کھیلوں کے بوڑھے ماسٹر نے ہمیں یہ ترکیب سکھائی تھی۔ میں پھر بیٹھ جاتا ہوں اور فائل کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس بار میرے والد کا چہرہ آہستہ آہستہ حدِ نظر میں آ جاتا ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ وہ میری ہمت بڑھا رہے ہیں یا نارضامندی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا تاثر مبہم ہے۔ عام طور پر وہ ہمیشہ ایسے فعلوں کی مذمت کرتے تھے؛ شاید اب جہاں ہیں، وہاں انھوں نے لچکداری سیکھ لی ہوگی۔ دوسرے اسے 'مطابقت' کہتے ہیں۔ اس وقت، بہر حال، میں اس مقام تک نہیں پہنچا ہوں۔ ابھی تو بمشکل ہی اپنی مجرم ضمیری کے اوج تک آیا ہوں۔ میں اس سے ہنوز معاملہ کر رہا ہوں۔ اپنے شکوے شکایات کر رہا ہوں، ایسے ایسے ہولناک نقشے کھینچ رہا ہوں کہ وہ مجھے ایک واجبی سے بے دھڑک فعل، ایک معمولی سی بھول چوک کی اجازت دے دے۔ میں دوسری آواز کو کہتے ہوئے سنتا ہوں: ''بیس ہزار درہم، تم اسے معمولی بھول چوک کہتے ہو؟ اسے تمھارے اعمال نامے پر بڑا دھبا کیوں نہ کہا جائے، قاعدے کا بھاری استثنٰی...''

مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب وزارتِ ترقیات میں ہمارا دفتر عملہ بھرتی کر رہا تھا۔ مجھے ایک قدرے منفرد عرضی موصول ہوئی۔ فرانسیسی میں، غالباً بط کے پَر کے قلم سے لکھی ہوئی، جو اس طرح کام مانگ رہی تھی گویا ہم کسی اور صدی میں رہتے ہوں:

> خدا آپ کا گھر کشادہ کرے اور اسے اپنے کرم اور بچوں کی کلکاہٹوں سے بھر دے! خدا روشنیوں اور خوش قسمتی کے راستے آپ پر کھول دے! آپ کا دل پاک، صاف، سایوں اور ابتری سے محفوظ رہے! آپ کی آنکھیں کھلی رہیں اور آپ کی سماعت برقرار۔ کیونکہ اب جو میں آپ سے بیان کرنے والا ہوں وہ ایک معصوم آدمی کی کہانی ہے جو سنہری الفاظ کی آب و تاب سے دھوکا کھا گیا۔ میں آپ کو بے کیف نہیں کروں گا۔ جان لیں کہ میرا باپ شہر کا ستون تھا، کہ ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے، جس کے کشادہ صحنوں میں ایک گھوڑا آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ جان لیں کہ بدقسمتی کا وجود ہے، کہ بغض و کینہ اور

Scanned with CamScanner

ریاکاری آپ کے تصور سے بھی زیادہ عام ہیں۔ ناشکری بھی ہر طرف بہت پھیلی ہوئی ہے۔ آج میں آپ کے ہاتھ میں ہوں، آپ کے اچھے فیصلے کے اور آپ کی رحم دلی کے رحم و کرم پر ہوں۔ میں یہاں اتنا ہی آزاد ہوں جتنا صحن میں ہمارا گھوڑا ہوا کرتا تھا، لیکن ایسی آزادی کا کیا مصرف جو کسی کام میں استعمال نہ ہو؟ یہ سب وزارتِ ترقیات میں آپ کے دفتر میں کسی ملازمت کے لیے آپ کے کرم کی درخواست کرنے کے لیے ہے۔

خدا کرے کہ یہ خط آپ کو نہ صبح کی قہوہ نوشی سے پہلے ملے نہ کسی بدمزگی کے بعد، اور نہ ہی آرام کے لمحوں میں۔ اسے بالکل مناسب وقت پر پہنچنا چاہیے، لیکن یہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ یہ مجھے آپ کے جواب سے معلوم ہوگا، جو مجھے امید ہے کہ میرے حق میں اور جلد وصول ہوگا۔

آج اور ہمیشہ آپ کا خادم...

جب میں اس خط کو تہہ کر رہا تھا تو ایک تحریر میری توجہ میں آئی — ہلکی پنسل میں لکھی ہوئی، صفحے کے نیچے بائیں حاشیے میں۔ لکھائی اتنی باریک تھی کہ مجھے پڑھنے میں کافی دشواری پیش آئی:

"اگر آپ مجھے ملازم رکھ لیں تو ایک ہزار درہم آپ کی نذر کروں گا۔ یہ معاملہ ہم دونوں کے درمیان راز رہے گا۔"

یہ ایک مدھم سی بھنبھناہٹ تھی، ایک سرگوشی، کوئی بمشکل کہی گئی بات، چنانچہ بمشکل نظر آنے والی، مٹا دی جانے والی، کیونکہ پنسل سے لکھی گئی تھی۔

بے اختیار میرا جی ہنس پڑنے کو چاہا۔ میں نے ایک ربڑ نکالا، سرگوشی کو مٹا دیا اور فائل عملے کے ڈائریکٹر کے حوالے کر دی۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ اس آدمی کو ملازم رکھا گیا یا نہیں۔

ایک ہزار درہم! اُس زمانے میں یہ بڑی بھاری رقم تھی، کم از کم اسکول کے استاد کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا تھا، جو ہنس پڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس پیشکش کا جواب ذاتی طور پر کیوں نہ دیا۔

Scanned with CamScanner

میں ابھی تک دفتر میں اکیلا ہوں۔ میرا اسسٹنٹ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ شاید وہ دانستہ مجھے تنہا چھوڑ رہا ہے تاکہ میں فیصلہ کرسکوں۔ میں لفافے کو دوبارہ اٹھالیتا ہوں اور اسے ہاتھوں میں تولتا ہوں۔ میں اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتا ہوں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ میں کوئی پُرجم شے رکھے ہوں۔ یہ خوب بھرا ہوا بنوا ہوسکتا ہے یا خطوں کا بنڈل۔ عشقیہ خطوط، مثلاً۔ ربن سے بندھے عشقیہ خطوط کا تصور مجھے ہمیشہ پرکشش معلوم ہوتا ہے جنھیں لکھنے والے کو لوٹایا جارہا ہو۔ کیا میں نے حلیمہ کو عشقیہ خط لکھے تھے؟ یاد نہیں آتا۔ لیکن خط تو میں نجیہ کو لکھنا چاہتا ہوں۔ میں کھڑا ہوتا ہوں، چکر لگاتا ہوں، اور خود کو مختلف محسوس کرتا ہوں۔ میں ایک رئیس ہوں۔ ذہن میں ایک سوال تیر جاتا ہے: کیا بیس ہزار پورے پورے میرے لیے ہیں یا مجھے ان میں دوسروں کو شریک کرنا پڑے گا؟ دوسرا مفروضہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اچھا، تو شریک کرتا ہوں تو کس کو؟ حاج حمید، باس، یا شاؤش؟

ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ باس ہے، پوچھ رہا ہے کہ مسٹر صبان کی فائل کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں اس کا مطالعہ کررہا ہوں۔ وہ فون بند کردیتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ میں بدترین امکان کا تصور کرتا ہوں: رشوت لیتے ہوے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا۔ مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے، مجھے سبک سر کیا جارہا ہے، مجھے میرے سسرال والوں کے رحم وکرم پر ڈال دیا گیا ہے، میرے بچے اس تھوڑے بہت سے بھی محروم ہوگئے ہیں جو میں مہیا کرسکتا ہوں۔ کیسا ڈراؤنا خواب ہے! کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ شاؤش میرے لیے پودینے کی چائے کا گلاس لایا ہے اور میرے بچوں کی خیر خیریت پوچھ رہا ہے۔ بالکل یوں لگ رہا ہے جیسے کسی نے اسے خبردار کردیا ہو۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، چائے کی چسکی لیتا ہوں، جیب سے پیسوں والا لفافہ الگ کرتا ہوں، اور رقم کو دو زرد سے لفافوں میں تقسیم کرتا ہوں اور انھیں اپنی ڈیسک کی دائیں طرف کی دراز میں ڈال کر تالا لگا دیتا ہوں۔ میں تمام کاغذات پر بغیر پڑھے ہی دستخط کردیتا ہوں اور بزر کا بٹن دباتا ہوں۔ شاؤش پھرتی سے داخل ہوتا ہے۔ میں اسے فائل تھما کر کہتا ہوں کہ اسے رجسٹری کے دفتر میں داخل کر آئے۔ میں سکون کا گہرا سانس لیتا ہوں۔ یہ تو بہت آسان نکلا، تیز رفتار، اور سپاٹ۔ میں دیوانہ تھا جو اتنے بہت سے تاملات کا بوجھ خود پر لادے رہا۔ میں نے پہلا قدم اٹھالیا ہے۔ میں پہلے جیسا نہیں

رہا۔ میں بہتر آدمی بن رہا ہوں۔ ایک لفافہ کھول کر دو سو درہم کے دو نیلے نوٹ نکالتا ہوں۔ بالکل نئے ہیں، صاف ستھرے اور ابھی تک چھپائی کی مہک آ رہی ہے۔ دراز کو دوبارہ تالا لگاتا ہوں اور دفتر سے نکلتا ہوں۔ لنچ کا وقت ہو رہا ہے۔ ٹیکسی پکڑ کر ڈرائیور سے کہتا ہوں: لامیئر (La Mer) ریستوران، عین الذیاب میں۔ میں ہمیشہ اس ریستوران میں سمندری غذا کھانے کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ ہمارے ڈائریکٹر نے اپنی سالگرہ منانے کے لیے یہاں مدعو کیا تھا۔ میں نے خود کو مسرت کے دو گھنٹے تحفے میں دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ خود غرضی ہے — تو کیا ہوا؟

میں سمندر کی طرف رخ کیے بیٹھا ہوں۔ یہ بڑا خوبصورت دن ہے، موجیں اونچی اور دودھیا سفید۔ مجھے کھڑی چٹان سے ان کے ٹکرا کر بکھر جانے کی آواز بہت مرغوب ہے۔ میں بیرے کو بلا کر پہلے سگریٹ لانے کے لیے کہتا ہوں، گیتان مارکہ، بغیر فلٹر والی، اس کے بعد کھانے کا آڈر دیتا ہوں۔ اپنی چھوٹی سی دولت کے باوجود، دائیں سے بائیں، پہلے قیمت بعد میں پکوان، پورے مینو کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پھرتی سے حساب لگاتا ہوں۔ بھوک کھولنے کے لیے جھینگا مچھلی، پھر بھنی ہوئی سول مچھلی، اور کریم کسٹرڈ: 279 درہم، اس کے علاوہ کیبر نے شراب کا اَدھا اور منرل واٹر کی ایک بوتل؛ سب کچھ ملا کر 300 درہم سے زیادہ نہیں ہوگا۔

میں ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہوتا ہوں، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہوں، ہر اس چیز کو پس پشت ڈال دیتا ہوں جو آزادی اور لذت کی ان دو ساعتوں میں کھنڈت ڈال سکتی ہو۔ مجھے نجیہ کا خیال آتا ہے، اس کے جسم کا۔ پہلی بار میں اس کے کپڑے اتارتا ہوں اور اس کی مستحکم چھاتیاں، سپاٹ پیٹ اور بھرے بھرے کولھے دریافت کرتا ہوں۔ اڑتیس انتالیس سالہ ہونے کے باوجود وہ ابھی تک بے حد حسین ہے۔ ہو نہ ہو، شراب کا اثر ہے: میں وہ سب تصور کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جسے خیال میں لانے کی میں نے پہلے کبھی خود کو اجازت نہیں دی۔ کبھی کبھار مجھے پی لینی چاہیے، یقیناً یہ مجھے مشکل حالات کا سامنے کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ شاندار طعام اور وافر مشروب کے بعد میں بل ادا کرتا ہوں، ٹپ چھوڑتا ہوں، اور ٹیکسی بلانے کے لیے کہتا ہوں۔ کسی VIP کی طرح میری آؤ بھگت کی جا رہی ہے، کسی باس کی طرح۔ یہ اچھا لگتا ہے۔ میں کسی سے اپنی اس شرارتی مہم کا ذکر نہیں کروں گا۔ میں خود کو بیک وقت ہلکا پھلکا اور بھرا پُرا محسوس کرتا ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہتا ہوں

کہ گاڑی ہولے ہولے چلائے۔ اتنی جلدی دفتر لوٹ جانے کو جی نہیں کرتا؛ مجھے چاہیے کہ جس قدر ممکن ہو اس لمحے کو طول دوں۔ ڈرائیور ساحلی سڑک کے سہارے سہارے چلنا تجویز کرتا ہے۔ مجھے قبول ہے۔ اوائل بہار کے اِس دن لوگ قہوہ خانوں کے سامنے غسل آفتابی کر رہے ہیں۔ وہ مسرور ہیں، حالانکہ آسمان ہنوز نیلا ہے۔ مجھے پھر برسات کا خیال آتا ہے جو اس سال ہمیں بھلا بیٹھی ہے، لیکن پھر خود کو پرامید محسوس کرتا ہوں، اس اعتماد کے ساتھ کہ ملک کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لے گا۔ میں ملک کے ساتھ یگانگت محسوس کرتا ہوں، اپنے سے کہتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ خیریت گزری تو یہ بھی بچ رہے گا۔

دفتر میں حاج حمید کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کرتا ہے۔ اٹھ کر میرے قریب آتا ہے، اس کا ہاتھ پھیلا ہوا ہے۔ میں اسے سلام علیک کہتا ہوں۔ وہ کچھ توقف کرتا ہے، پھر، جو کچھ میرے گوش گزار کرنے والا ہے اس کی خاطر، دروازے کو تالا لگا دیتا ہے۔ میں دراز کھول کر اس کا لفافہ اسے تھما دیتا ہوں۔ وہ اسے اپنے بریف کیس میں سرکا دیتا ہے اور یہ کہتے ہوئے دفتر سے نکل جاتا ہے، ''کل ملیں گے!'' وہ اپنا مالِ غنیمت چھپانے جا رہا ہے۔ یقیناً بینک میں اس کی تجوری ہوگی۔ مجھے بھی یہی کرنا چاہیے۔ اگر میں بہت تیزی سے غریب سے امیر آدمی بن جاتا ہوں تو فوراً لوگوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔ مجھے سست رفتاری اختیار کرنی چاہیے۔ حلیمہ کو ہوا بھی نہیں لگنے دینی چاہیے۔ میں رقم کو کسی موٹی کتاب میں رکھ دوں گا، مثلاً ژاں پول سارتر کی وجود اور عدم (Being and Nothingness)، جو میں نے پرانے شہر کی استعمال شدہ اشیا کے بازار میں خریدی تھی۔ اس طرح میں کتاب کا عنوان الٹ دوں گا، عدم سے وجود کی طرف جاؤں گا، ایک لحاظ سے کتاب میرے بارے میں ہو جائے گی۔ کسی کو اتنی لحیم شحیم کتاب پڑھنے کا خیال نہیں آئے گا۔ اس نے نگاہ کی بابت جو لکھا ہے وہ مجھے پسند ہے۔ ایک خاص لمحے میں مَیں بھی ٹھیک وہی محسوس کرتا ہوں جو سارتر قہوہ خانے میں ویٹر کی بابت کہتا ہے۔ میں کسی دفتری کارندے کی طرح یومیہ اور نیم میکانکی افعال انجام دے رہا ہوں، تخیل سے عاری اور بے تجسس۔ میں سوچتا ہوں کہ آج سے سب کچھ بدل جائے گا۔ میں ایک بالکل نیا پیڈ نکالتا ہوں اور اس کے پہلے صفحے پر یہ چند فیصلے رقم کرتا ہوں:

— لمحہ موجودہ سے میں خود کو بدلوں گا۔ میں ٹھہر کر اپنے سے سوال کرتا ہوں: ''ایک

چالیس سالہ شخص کیسے بدل سکتا ہے؟ تم جانتے ہو، یہ ناممکن ہے۔ آدمی اس وقت بدلتا ہے جب جوان ہو، جب خود کو ڈھونڈ رہا ہو، اِس عمر میں نہیں۔'' چلو، یہ جو میں کر رہا ہوں اسے ارادہ ہی کہہ لیتے ہیں، بعد میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن بدلو گے کیا؟ میری چلت پھرت کا انداز، سب سے پہلے، مجھے سر اوپر اچھی طرح اٹھا کر چلنا چاہیے، پیٹھ الف سیدھی رکھنی چاہیے، اور بازوؤں کو ڈولنے دینا چاہیے۔ اگر میں اپنے اس پہلو کو بدل سکوں تو اسے ایک طرح کی کامیابی کہا جا سکتا ہے۔

—فطری طور پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی آرام دہ کپڑے پہنے ہو؛ چنانچہ مجھے اپنا لباس بدلنا چاہیے۔ میں ڈھیلے ڈھالے سوٹ اور نفیس جوتے پہنوں گا۔ میں نے اکثر رسالوں میں پڑھا ہے کہ آدمی کی نفاست اس کے جوتوں سے شروع ہوتی ہے۔ رنگوں سے پرہیز بند کرو۔

—میں سگریٹ پینا بھی ترک کروں گا۔ رمضان تک انتظار کروں گا اور اپنے پھیپھڑوں کو زہر آلود کرنا ختم کروں گا۔

—مزید ٹیلیوژن نہیں دیکھوں گا۔ اس کے بجائے مطالعہ کروں گا یا موسیقی سنا کروں گا۔ (اسٹیریو خریدو۔)

—ویک اینڈ گھر پر نہیں گزاروں گا۔ اپنے اہل و عیال کو ساحلِ سمندر پر یا پہاڑوں پر لے جایا کروں گا۔ آدمی کو تھوڑا بہت زندگی کا مزہ لینا چاہیے۔ (کار خریدو، غالباً استعمال شدہ۔)

— کھانا دھیرے دھیرے کھاؤ۔ (کھانوں کے درمیانی وقفے میں ٹھونگنا بند کرو۔)

— کوئی کھیل ویل اختیار کرو۔ (جسم کو چست رکھنے والی ورزشیں یا سائیکل چلانا۔)

—ڈائری لکھا کرو۔ (ایک تجوری خریدو جس میں اسے چھپا کر رکھو، مع اس روپے کے جو آسمان سے برسا کرے گا۔)

—باقی رہی نجیہ، تو مجھے جلد ہی اس سے سنجیدہ گفتگو کرنی چاہیے۔

میں نجیہ کو دینے کے لیے گلدستہ خریدتا ہوں۔ اگر اس کے گھر کوئی نہ ہوا تو پھر حلیمہ کو دے دوں

گا۔ وہ مجھ سے چکر میں ڈال دینے والے سوال کرے گی۔ عام طور پر میں پھول وول گھر نہیں لاتا۔ خیر، اس سے کہہ دوں گا کہ باس نے ہم سب کو بونس دیا ہے اور میں خوشی منا رہا ہوں۔

میں اپنے کو مختلف آدمی محسوس کرتا ہوں۔ میں کسی لمحے اپنی اُس دوسری آواز کی مداخلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ عجیب بات ہے، وہ منہ نہیں کھولتی۔ میں نے ایک دستاویز پر دستخط ہی تو کیے ہیں جو ایک آدمی کو اپنا کام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ چوری چکاری نہیں کی ہے۔ کسی کا مال نہیں ہتھیا لیا ہے۔ صرف ایک عمل کی انجام دہی میں آسانی بہم پہنچائی ہے۔ دس ہزار درہم سے ذرا آسانی کے ساتھ سانس لے سکوں گا۔ پرچون فروش کا حساب بے باق کر دوں گا۔ اس سے بھی بہتر یہ کہ اتوار کے دن تھوک بازار جاؤں گا اور چند ہفتوں کی ضروریات اکٹھی خرید لاؤں گا۔ سارا سامان ٹویوٹا ٹیکسی میں لدوا لاؤں گا، اور پرچون فروش سے، جو کبھی اپنی صفائی ستھرائی نہیں کرتا، ادھار مع سود خریداری کے دن ختم ہوں گے۔ بیوی سے کہوں گا یہ بونس کی رقم سے خریدی ہوئی اشیا ہیں، اور امید کہ وہ بہت زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کرے گی۔

میری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں نے چیزوں سے غفلت برتنے کی مدد سے جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے، جو ایک طرح کی بزدلی ہے۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ خاموشی رینگ رینگ کر بڑھتی جاتی ہے، فراموشی کا نقاب اوڑھے ہوئے۔ میری بیوی کو یہ بات معلوم ہے۔ وہ اس چیز کا پتا لگا لیتی ہے جسے میں چھپا رہا ہوتا ہوں۔ بس کوئی لمحہ بھر کے لیے مجھے گھور کر دیکھ لے، اور میرا سارا اطمینان جاتا رہے گا۔ خیر، جب میں گھر پہنچوں گا، اسے پتا چل ہی جائے گا کہ کچھ بدل گیا ہے؛ وہ میرا محاصرہ کرے گی، ہر زاویے سے میری طرف سوال اچھالے گی۔ میں خاموش رہوں گا اور ٹس سے مس نہیں ہوں گا، اب یہ دوسری بات ہے کہ کسی قدر سکون برقرار رکھنے کے لیے رقم اس کے ساتھ آدھی آدھی بانٹ لوں۔

اگر رات کو، میرے برابر سوتے ہوئے، وہ میرے خیالات بھانپ لے تو میرا دم ہی گھونٹ دے! میں خود کو رنڈوا تصور کرتا ہوں، بچے اپنے اپنے رستے لگ گئے ہیں۔ میں نجیہ کو اپنی آغوش میں تصور کرتا ہوں، اپنی زندگی میں۔ میں نجیہ کے بارے میں سارے ناخوشگوار خیالات برطرف کر دیتا ہوں: مثلاً بیمار یا برافروختہ، پراگندہ حال اور نظرانداز کردہ، بے روک ٹوک۔ بیویاں اکثر گھر پر اپنے

Scanned with CamScanner

کو بنانے سنوارنے کی کوشش نہیں کرتیں، الٹ سلٹ جو لباس چاہا پہن لیتی ہیں اور بمشکل بالوں میں کنگھی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے، اب شوہر کو ترغیب کہاں دلانی ہے۔

حلیمہ ابھی گھر نہیں پہنچی۔ کریمہ بتاتی ہے کہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے۔ عام طور پر ماں کے پاس وقت گزارنے کے بعد تازہ دم ہو کر لوٹتی ہے، جنگ کے لیے تیار۔ میں اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر رقم وجود اور عدم کی جلد میں چھپا دیتا ہوں، شاور لیتا ہوں، اور اپنی بیٹی کے ہوم ورک پر نظر ڈالتا ہوں۔ آج کل انھیں اسکول میں جو ریاضی سکھائی جا رہی ہے وہ اس سے مختلف ہے جو میں نے سیکھی تھی۔ فارمولوں سے سر مارنے میں میں کریمہ کا ساتھ دیتا ہوں۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھتی ہے، جیسے کچھ چاہتی ہو، اور مجھے اس کی آنکھوں میں گہری اداسی نظر آتی ہے۔ میری آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔

''اماں اکثر آپ پر اور ہم پر کیوں برستی رہتی ہیں؟'' وہ پوچھتی ہے۔ ''وہ کہتی ہیں کہ ہم آپ کی وجہ سے غریب ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

میں پوچھتا ہوں کہ کیا اسے کسی خاص چیز کی ضرورت ہے۔ اس کا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔

''ہاں، میں آپ کے ساتھ ایک سفر پر جانا چاہتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے پاس بہت پیسے نہیں ہیں کہ وہ سب کر سکیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ لیکن ایک دن، اگر آپ کو بہت سارو پیہ مل جائے، تو آپ آ کر مجھے سوتے سے اٹھائیں اور طنجہ دکھانے لے جائیں، وہ جگہ جہاں دونوں سمندر آ کر ملتے ہیں۔''

''میں بھی تمھارے ساتھ سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تمھارے پاس آؤں گا اور تمھیں تمھارے سپنوں کی سرزمین دکھانے لے جاؤں گا۔''

حلیمہ داخل ہوتی ہے، برہمی کے عالم میں۔ جیسے ہی گلدستے پر نظر پڑتی ہے، اپنی آواز کم کر دیتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا مہمان آ رہے ہیں۔ کریمہ اس کی طرف رخ کر کے میری طرف اشارہ کرتی ہے۔

''تو تم روٹی اور دودھ لانا بھول گئے۔ اس کے بجائے ہمارے لیے پھول لے آئے ہو۔ یہ

Scanned with CamScanner

نئی بات ہے! یہ بھلا کس خوشی میں؟''

پہلی دفعہ جی چاہا کہ سب کچھ سچ بتادوں:

''یہ پھول ایک ممتاز اور رحمدل خاتون کے لیے خریدے تھے۔ وہ گھر پر نہیں تھی، سو یہاں لے آیا۔''

''تو یہ بات ہے! کون عورت تم جیسے قلاش کو چاہے گی؟ پاگل یا بدکردار ہو تو ہو۔ ایسی کئی ہمارے پڑوس میں موجود ہیں۔ واقعی۔ کافی ہیں، جس کا چاہے انتخاب کر سکتے ہو، اور شروعات اپنی عم زادی سے کرو۔ وہ اتنی اکیلی ہے کہ بخوشی تم جیسے پھسڈی کو قبول کرلے گی۔ بسم اللہ۔ کوشش کرو، اور بعد آ کر میں مجھے بتانا۔''

آپے سے باہر ہوے بغیر، ایک لفظ بھی کہے بغیر، میں بک شیلف کے پاس جاتا ہوں، زرتشت یوں محوِ کلام ہوا (*Thus Spoke Zarathustra*) اور وجود اور عدم اٹھا کر پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالتا ہوں؛ کریمہ پر جھک کر اسے بوسہ دیتا ہوں، اور باہر چلا جاتا ہوں، دروازہ دھڑاکے سے بند کیے بغیر۔ باہر، ہوا معتدل ہے۔ ایک گیتان سگریٹ نکال کر جلاتا ہوں۔ میں خود کو فکروں سے آزاد، یہاں تک کہ پُرمسرت محسوس کرتا ہوں۔ میرے کان ابھی تک حلیمہ کی آواز سے جھنجھنا رہے ہیں۔ میں نجیہ کے گھر کی سمت میں رواں ہوں اور وہاں پہنچ کر گھنٹی بجاتا ہوں۔ وہ خود دروازہ کھولتی ہے۔ متعجب ہو کر مجھے اندر آنے کے لیے کہتی ہے اور پوچھتی ہے کہ سب کچھ ٹھیک تو ہے نا۔

''نہیں۔ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، لیکن مجھے تم سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تمھارے سکون میں مخل ہو رہا ہوں۔''

''تم مخل نہیں ہو رہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنے شاگردوں کا کیا ہوا کام دیکھنا ختم کیا ہے۔ میری لڑکی سو رہی ہے اور اماں ہفتہ بھر پہلے اپنے بڑے بھائی سے ملنے گئی ہیں۔''

وہ مجھے لونگ روم میں بٹھاتی ہے۔ نمایاں دیوار پر اس کی شادی کی تصویر آویزاں ہے۔ وہ اس میں تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی ہے اور اس کے شوہر کے لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے اسے معلوم تھا، قسمت ان پر ضرب لگانے والی ہے۔ ورنہ وہ کیوں اتنی مضطرب نظر آتی۔ وہ مجھے نارنگی کا عرق لا کر دیتی ہے، پھر، مختصری خاموشی کے بعد، پوچھتی ہے:

Scanned with CamScanner

''کیا حلیمہ کی وجہ سے؟ کل پرسوں حمام میں نظر آئی تھی۔ بالکل دوستانہ نہیں تھی۔ مجھے گمان ہوا کہ ناخوش ہے۔''

''ہاں، ناخوش ہے۔''

''تو اب تم کیا کرو گے؟''

''فی الحال، تھوڑا سا آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا کسی نے تمھیں یہاں اندر آتے دیکھا ہے؟''

''نہیں، میرے خیال میں تو نہیں۔''

''اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ لوگ بڑے موذی ہیں۔ وہ مجھ پر نظر رکھتے ہیں اور میرے بارے میں واہی تباہی بکتے ہیں۔ اس ملک میں اکیلی عورت کا رہنا بہت دشوار ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے، سمندر کے کنارے کسی قہوہ خانے کے باہر بیٹھ کر مشروب اور سگریٹ پیوں۔ اگر یہ کرتی ہوں تو مجھے کسبی سمجھیں گے۔ سو میں گھر چلی آتی ہوں اور بچی کی خبر گیری کرتی ہوں۔ رات کو سردی لگتی ہے۔ تنہائی میں ٹھنڈ لگتی ہے۔ چاہے کتنے ہی کمبل کیوں نہ لپیٹ لوں، میرے ہاتھ پاؤں یخ بستہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ ٹھنڈ کا مارا جسم آخر کار مر جاتا ہے۔ بعض اوقات، جب میری بیٹی کو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں تو وہ مجھ سے لپٹ کر سوتی ہے۔ اس کا ننھا سا جسم مجھے حرارت پہنچاتا ہے... میں تم سے یہ سب کیوں کہہ رہی ہوں؟ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے خالہ زاد ہیں، بمشکل ہی ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے ہیں، لیکن یہ بات ہے کہ مجھے افسردہ چہروں میں اپنا عکس نظر آتا ہے؛ مجھے کوئی شے مانوس معلوم ہوتی ہے، ایک طرح کی کمک۔ ٹھیک اِس وقت، تم مجھے اپنے سے بے حد قریب محسوس ہو رہے ہو، کہ میں جانتی ہوں تمھاری کیا حالت ہے۔ تم ایک آئینے کی طرح ہو۔''

میں اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انھیں رگڑ کر گرما دیتا ہوں۔ وہ خاموش خاموش رونے لگتی ہے، پھر آہستگی سے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیتی ہے۔

بہت زمانے کے بعد مجھے ایک قوی اور خوبصورت جذبہ اپنے میں ابھرتا محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر دوبارہ کچھ بولا تو سب کچھ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ میں اسے اپنے سے لگا کر اس کے گالوں کا بوسہ لیتا ہوں، جو آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہم رات صوفے پر گزارتے ہیں۔ میں بہت کم سوتا ہوں۔ اس کا جسم، جو بتدریج زیادہ پرسکون ہوتا جا رہا ہے، میرے پہلو میں ہے۔ رہ رہ کر ایک کپکپی سی اس کے جسم سے گزرتی ہے۔ میں فجر کے وقت اٹھتا ہوں اور دفتر چلا جاتا ہوں۔ میں اپنی دونوں کتابیں اس کی بک شیلف پر رکھ کر پنجوں کے بل لونگ روم سے نکل جاتا ہوں۔

وزارتِ ترقیات کے داخلے کے دروازے پر حلیمہ میرا انتظار کر رہی ہے، کم خوابی کے باعث پریشان حال نظر آ رہی ہے۔ اسے یہ گمان نہیں تھا کہ میں اپنی بات پر عمل کرنے کا اہل ہوں۔ وہ میری طرف بڑھتی ہے، قابلِ رحم نظر آ رہی ہے۔

''کہاں تھے؟''

''تمھیں اس سے کیا سروکار!''

ایک دوست نے مجھے لاتعلقی کا سبق سکھایا تھا۔ اکثر یہ کارگر حربہ ثابت ہوتی ہے۔ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ وہ پیچھے پیچھے آتی ہے اور چلّانے لگتی ہے۔ چونکہ میں نظر کے گھیر سے نکل چکا ہوں، لوگ نہیں سمجھ پاتے کہ کس پر چلّا رہی ہے۔ میں کھڑکی سے اسے کسی بھکارن کی طرح لوٹتے دیکھتا ہوں۔

میری غیر موجودگی میں تین فائلیں میری ڈیسک پر رکھ دی گئی ہیں۔ ان پر 'صیغۂ راز' کا نشان لگا ہے، اور ہاتھ سے 'اشد ضروری' کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کا دن بہت دور چھوٹ گیا ہے۔ محض ایک چھلانگ ہی میں میں اخلاقی اعتبار سے بگڑا ہوا آدمی بن گیا ہوں، عیش و عشرت کا مزہ چکھ چکا ہوں، اور اپنی بیوی سے جنسی بے وفائی کرتے کرتے رہ گیا ہوں۔ وقت کے اتنے قلیل عرصے میں اتنی زیادہ اتھل پتھل! یہ توازن کھو دینے کے لیے کافی ہے۔ اور فی الواقع مجھے چکر آ رہے ہیں۔ ذرا پہلے جب سگریٹ پینے کھلی کھڑکی کے پاس گیا تھا تو تقریباً گر پڑا تھا۔ ہوسکتا ہے میری طبیعت خراب ہو۔ کل پرسوں ہی ایک ڈاکٹر کو ریڈیو پر حقیقت پسندانہ انداز میں یہ کہتے سنا تھا کہ چالیس سال کی عمر کے آدمی کو غدۂ مثانہ

Scanned with CamScanner

(prostate) کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے اپنی مقعد کا معائنہ کرا لینا چاہیے، اور اس عمر سے اپنے میں چند تبدیلیاں لانی چاہییں۔ ٹھیک ہے۔ میں نے کل سے تبدیلیاں لانی شروع کردی ہیں۔ میں نئی زندگی کا آغاز کررہا ہوں، ماضی کو فراموش اور مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کررہا ہوں، کیونکہ ہر کام میں پیسے سے سہولت ہوجائے گی۔ فی الحال، مجھے معلوم نہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کس کو اولیت دوں؟ خود کو یا اپنے بچوں کو؟ حسبِ معمول، میں واقعات کو اجازت دوں گا کہ مجھے اپنے راستے پر چلاتے جائیں، تاہم میں اپنے بچوں کی بہبودی کا خیال رکھوں گا۔ آج رات گھر رکتا ہوا جاؤں گا، کپڑے بدلنے کے لیے اور کریمہ کے ہوم ورک پر نظر ڈالنے کے لیے۔ پھر وہاں سے کھسک لوں گا۔ نجیہ کے یہاں جاؤں گا۔ اس مرتبہ اس سے مستقبل، ہمارے مستقبل، کے بارے میں بات کروں گا۔

میں الل ٹپ تینوں میں سے ایک فائل کھولتا ہوں۔ موٹے سے لفافے کو تلاش کرتا ہوں۔ نہیں ہے۔ نہ بقیہ دونوں فائلوں میں ہے۔ ہوسکتا ہے ایسا بھول چوک میں ہوا ہو، یا پھر ہوسکتا ہے لفافے بعد میں آرہے ہوں۔ میں حاج حمید کی آمد کا انتظار کرتا ہوں۔ وہ ماہر ہے، وہ مجھے بتائے گا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سوچتا ہوں کہ آیا اس کی بابت براہ راست بات کروں یا اسے خود پہل کرنے دوں۔ ظاہر ہے، وہ اپنا حصہ لیتا ہے، اور وہ اس قسم کے معاملات سے نبٹنے کا عادی ہے۔ میں ہر بات کو اپنی حالت پر جوں کی توں رہنے دیتا ہوں، بڑی سی حساب کی پوتھی نکالتا ہوں اور میکانکی انداز میں چند صفحوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔

شاؤش، باچھیں کھلی ہوئی، اطلاع دیتا ہے کہ مسٹر صبان مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اچانک مجھے خوف دامنگیر ہوجاتا ہے۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کیا اس نے اپنا ارادہ تو نہیں بدل دیا؟ کیا وہ بھی حصہ چاہتا ہے؟... اس قسم کے کام میں پھنسنے کے بعد سب کچھ ممکن ہے۔ میں اسے تھوڑا سا انتظار کرنے کے لیے کہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقعے پر میرا اسسٹنٹ بھی موجود رہے۔ اگر کوئی الجھن وغیرہ پیش آئی تو وہ اس سے بہتر طریقے پر نبٹ سکے گا۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ حاج حمید مجھ سے زیادہ مراکشی ہے۔ اسے بات کرنا آتا ہے، چیزوں کو شاعرانہ اور کبھی تو مذہبی فارمولوں میں بدلنا آتا ہے جس سے سننے والوں کا سر چکرا جائے۔ اسے شوقی اور عمر خیام کے شعر از بر ہیں، یہی نہیں

Scanned with CamScanner

بلکہ احادیثِ نبوی، اور شہری اور دیہاتی کہاوتیں بھی۔ جیسا کہ عربی میں کہتے ہیں، 'اس کی زبان کترنی ہے۔'

دروازہ کھلتا ہے۔ حاج حمید اور مسٹر صبان داخل ہوتے ہیں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ حاج حمید ہمارا تعارف کراتا ہے۔ میں وضعداری نبھانے کی خاطر چند لفظ بڑبڑاتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ شاؤش سینی پر چائے اور قہوہ لیے آتا ہے۔ مجھے اس پر گروساں (croissants) اور cornes de gazelle کی پلیٹ بھی نظر آتی ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ دفتر نے اتنی فیاضی دکھائی ہے۔ دونوں بڑے آسودہ نظر آرہے ہیں۔ میں اعصاب زدہ ہوں۔ میرا پسینہ چھوٹ رہا ہے اور انٹ شنٹ بک رہا ہوں۔ مجھے اس آدمی کی آنکھوں میں دیکھنے کی جرأت نہیں ہو رہی۔ میں اپنی معمولی حالت میں نہیں۔ ٹھیکیداروں میں سے کسی ایک کی رفاقت میں قہوہ پینے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ اور لفافہ قبول کرنے میں بھی؟ میں ان کی گفتگو سنتا ہوں، حالانکہ میرا ذہن اور ہی باتیں سوچ رہا ہے۔

''اس سال آسمان بڑی کنجوسی دکھا رہا ہے!''

''اگر بارش نہیں ہوئی تو بھکاریوں کی تعداد اور بڑھ جائے گی...''

''بازار بھیڑوں سے بھر جائے گا اور قیمت آدھی رہ جائے گی..''

''ہسپانیہ میں بارش ہو رہی ہے، یہاں کیوں نہیں ہو رہی؟ ایسا کیوں ہے؟''

''ہمارا ایک پولیس کمشنر ہے جو ہزار ہا لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ اپنے چھڑے چھنبے کے فلیٹ میں جبری زنا کر رہا ہے، ساتھ ساتھ اس کی فلم بھی اتار رہا ہے، اور ان کی کیسٹیں یورپ بھیج رہا ہے... خدا ہمیں اسی کی سزا دے رہا ہے۔''

''اچھا، وہ کمشنر، وہ تو نرا عفریت ہے۔ خدا جانے وکیل اس کی گلوخلاصی کرانے میں کیا دلیل پیش کریں گے؟ جنون؟''

میں مداخلت کرنے سے پہلے کھانستا ہوں۔

''اس معاملے کا موسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ آدمی پورا عفریت ہے، اور اس قسم کے عفریت ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مرد روز ہی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں۔ کس کو اس

Scanned with CamScanner

کی خبر ہوتی ہے؟ کون اس کا ذکر کرتا ہے؟ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ پریس نے اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن وہ اقتدار کی نمائندگی کرتا ہے: اسے تو مثال قائم کرنا اور تمام شہریوں کی حفاظت کرنا چاہیے، خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔"

"بے شک، یہ طاقت کا ناجائز استعمال ہے۔ اس کی سطح پر یہ نظر میں آ جاتا ہے، کمتر دفتریوں کی سطح پر یہ نظر سے اوجھل رہتا ہے۔"

بہتر ہے کہ میں خاموش ہی رہوں۔ یہ مجھ پر کیا بلا سوار ہو گئی ہے کہ اس طرح وعظ کرنے بیٹھ گیا ہوں؟ میں موضوع بدل کر مسٹر صبان سے پوچھتا ہوں کہ سب کچھ ٹھیک تو ہے نا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک، مسٹر مراد۔ میں صرف آپ کو اتنا ہی بتا دینا چاہتا تھا کہ دو دستاویزیں فائل میں موجود نہیں تھیں۔ وہ میرے بریف کیس میں ہیں اور ان پر بھی آپ کے دستخط کی ضرورت ہے۔"

وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے انھیں نکالتا ہے۔ میں غائب دماغی سے حاج حمید کی جانب دیکھتا ہوں، جو اس طرح سر ہلاتا ہے کہ ہمیں اس درخواست کو نمٹا دینا چاہیے۔ میں کاغذات کو غائر نظر سے دیکھتا ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد ان پر دستخط کر دیتا ہوں۔

دن کے ختم پر، میں تشویش سے مغلوب ہو جاتا ہوں۔ مجھے بچوں کا خیال آتا ہے۔ مجھے کریمہ کا اداس چہرہ دوبارہ نظر آتا ہے۔ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہ رہا ہے۔ میں اسے طنجہ کی سیر کرانے لے جانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ چھٹیوں کے تین دن! مجھے یہ خیال فرحت انگیز لگتا ہے: مشکلات دفع ہو جاتی ہیں۔ میں حلیمہ سے کہہ دوں گا کہ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ جہاں کہیں بھی چاہوں جانے کا حق پہنچتا ہے۔ نجیہ کو معاملے کی بابت سوچنے کا وقت مل جائے گا۔ بہتر گھنٹوں تک شاؤش یا حاج حمید کی شکل نہیں دیکھنی پڑے گی۔ میں خود کو ایک آزاد آدمی کی طرح محسوس کرتا ہوں۔ یہ بالکل معمول کے مطابق بات ہے! میں فیصلے کرتا ہوں، مین عمل کرتا ہوں۔ کیا بگڑا آدمی آزاد آدمی ہوتا ہے؟ عجیب متضاد بات ہے: غلیظ پیسہ آدمی کو پر لگا دیتا ہے۔ لیکن آخر اس قسم کی آزادی کی کیا قدر و قیمت ہے؟

Scanned with CamScanner

میں خود کو حلیمہ اور اس کی ماں کے تسلط سے آزاد کر لیتا ہوں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ لیکن اگر، مثال کے طور پر، میں اپنی زندگی کو نئے سرے سے نجیہ کے ساتھ مرتب کروں، تو واقعی میں کچھ حاصل کر چکا ہوں گا۔ فی الحال، اہم ترین بات یہ ہے کہ اپنی بیٹی کے ساتھ چھٹیوں کے سفر پر نکل جاؤں۔ میں اسے حیرت میں ڈال دوں گا۔ وہ جمعے کے روز اسکول کا ناغہ کرے گی اور ہم اسکول کا کام ریل گاڑی میں انجام دیں گے۔ میں نجیہ کے یہاں جا کر اس سے بات کروں گا۔ وجود اور عدم کی پونجی میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکال لوں گا تا کہ سفر ٹھاٹ سے کر سکیں۔

حلیمہ کو فضیحتوں سے عشق ہے۔ اسے خود کو ستم رسیدہ دکھانا اچھا لگتا ہے۔ آج رات، میری لاتعلقی کا سامنا کر کے، وہ چیخے چلّائے گی، کھڑکیاں کھول دے گی، پڑوسیوں کو دہائی دے گی۔ آج رات میری رات ہوگی۔ میں ابھی سے اس کی تیاری کر رہا ہوں۔ میں کاغذ کا ایک ورق نکالتا ہوں اور مندرجہ ذیل نصیحت کم از کم سو بار نقل کرتا ہوں: 'اشتعال میں نہ آؤ۔ خود کو پرسکون رکھو۔'

گھر پہنچتا ہوں، اسی نصیحت کو دہراتے ہوئے، یہاں تک کہ اسے مزید سننا ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ حلیمہ خاموش ہے۔ اس نے اپنی حکمت عملی بدل ڈالی ہے۔ ہو نہ ہو، وہ اپنی طاقت کو بعد میں نسبتاً زیادہ شدید حملے کے لیے بچا رہی ہے۔ بالکل بعض جانوروں کا سا طرز عمل ہے، جو حملہ کرنے کے لیے پہلے پیچھے ہٹتے ہیں۔

میں اپنے کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔ وہ خاموشی سے ہر جگہ میرے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ میں بچوں کے کمرے میں جاتا ہوں۔ کریمہ اپنی فرانسیسی کی نوٹ بک پر ہی سو گئی ہے۔ میں اس کے بال تھپتھپاتا ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ بیدار ہو جاتی ہے۔ میری طرف دیکھ کر کھل کر مسکراتی ہے اور میری بانہوں میں آ جاتی ہے۔ میں اس کے کان میں سرگوشی میں کہتا ہوں کہ اپنا سامان تیار کر لے، کہ ہم صبح سویرے طنجہ جا رہے ہیں۔

دارالبیضا اور طنجہ کے درمیان چلنے والی ریل بڑی آرام دہ ہے۔ بدقسمتی سے، یہ بڑی سست رفتار بھی ہے، ساڑھے تین سو کلومیٹر کی مسافت تقریباً چھ گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ میں نطشے

Scanned with CamScanner

(Nietzsche) کی کتاب اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔ زرتشت... ایک عمدہ رفیق ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے، اس کو سنتے ہوئے، میری طبیعت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ کریمہ توجہ دینے والی لڑکی ہے؛ وہی ہمیشہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ سب کچھ ٹھیک تو ہے نا، مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ وہ بھی اپنے ساتھ ایک کتاب لائی ہے: کلیلہ اور دِمنہ کی حکایت، لیکن پڑھنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا۔ وہ کھڑکی سے چپکی بیٹھی ہے، ارضی منظر کو دیکھ رہی ہے اور بیچ بیچ میں تبصرہ بھی کرتی جا رہی ہے۔

''کھیتوں میں ایک بوڑھی عورت جا رہی ہے، سر کے وزنی بوجھ سے جھکی پڑ رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک آدمی گھوڑے پر بیٹھا چلا آ رہا ہے۔ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اسے بڑھیا کی مدد کرنی چاہیے۔''

''درخت بڑی تیزی سے بھاگے جا رہے ہیں۔''

''وہ بچے اسکول جانے کے بجائے پانی کے برتن اٹھائے لے جا رہے ہیں۔''

ہماری نشست کے مقابل درمیانہ عمر کی غیر ملکی عورت بیٹھی اونگھ رہی ہے، گھٹنوں پر ایک رسالہ کھلا پڑا ہے۔ کھلے ہوئے دو صفحوں پر پھیلی ہوئی سرخی ہے: ''آرگازم پر پہنچنے کے مفید اشارے۔'' شاید خاتون آرگازم پر پہنچنے ہی کا خواب دیکھ رہی ہے۔

قصر الکبیر کے اسٹیشن پر کوئی دہقان سوار ہوتا ہے اور غیر ملکی عورت کے برابر بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے گھاس پھوس اور پیال کی بو آ رہی ہے، چہرے پر سختی ہے۔ جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو میں اپنی نگاہ نیچی کر لیتا ہوں۔ کریمہ سو گئی ہے۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے، لیکن دہقان مجھے تک رہا ہے۔ میں آنکھیں موند لیتا ہوں اور اسے منہ ہی منہ میں دعائیں بڑبڑاتے ہوئے سنتا ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ مسٹر صبان ہو جو لفافہ واپس مانگنے کے لیے بھیس بدل کر میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ میری قمیص کا کالر پکڑ کر میرا دم گھونٹ دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ میں ہڑبڑا کر جگ پڑتا ہوں۔ تھوک غلط راستے اتر جاتا ہے۔ کھانسی آ جاتی ہے۔ کریمہ بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ ہم اصیلہ پہنچ گئے ہیں۔ سمندر پیارا لگ رہا ہے، دمک رہا ہے۔ اس کی چمک آنکھوں میں کھب رہی ہے۔ فاصلے میں چھوٹے چھوٹے سفید گھر ایک کے اوپر ایک ٹھساٹھس چڑھے نظر آ رہے ہیں۔ میری بیٹی کہتی ہے کہ سمندر دارالبیضا کے مقابلے میں یہاں زیادہ خوبصورت ہے۔ ''لیکن یہ ایک ہی سمندر تو ہے،'' میں کہتا ہوں۔ ''نہیں!'' وہ جواب دیتی ہے، ''یہ ناممکن ہے۔'' میں اس سے بحث نہیں کرتا۔

Scanned with CamScanner

دور سے دیکھنے پر طنجہ کسی شہوت انگیز شہزادی کی طرح نظر آتا ہے جو خلیج میں پسری ہوئی ہو اور اس کے بال سطح سمندر پر بہہ رہے ہوں۔ جب ٹرین اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو ہمیں دھچکا لگتا ہے اور پھر ہمیں نوعمر لڑکے گھیر لیتے ہیں، جو ہر کسی کو کچھ نہ کچھ پیشکش کر رہے ہیں: ہوٹل، ریستوران، ٹیکسی، گھر، امریکی سگریٹ، بلیک مارکیٹ کی وسکی، ولندیزی پنیر، حشیش۔ بعضے کچھ پیش نہیں کر رہے، لیکن ہاتھ آگے بڑھا رہے ہیں، سامان اٹھانے میں مدد کرنے یا بھیک مانگنے کے لیے۔ کریمہ تھک گئی ہے اور اسے بھوک لگ رہی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کباب ریستوران کے پاس آ کر ٹھہر جاتے ہیں، ساحل کے مقابل کی ایک میز پر آ بیٹھتے ہیں، اور بڑے نادر ذوق وشوق سے کھانے لگتے ہیں۔

میں خود کو کسی اجنبی ملک میں محسوس کرتا ہوں، گھر اور دفتر سے بہت دور۔ مجھے چھٹی منانے، خود کوست رو اور پرسکون محسوس کرنے کا موقع شاذونادر ملتا ہے۔ میں جلدی سے حساب لگاتا ہوں: المنزہ ہوٹل میں دوران قیام، ریستوران اور قہوہ خانے کے بل ملا کر پندرہ سو درہم لگیں گے۔ پیسے بچانے کی ایسی تیسی! میں اپنی بیٹی کو بہترین موقع فراہم کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ المنزہ پہنچتے ہی کریمہ تیراکی کے تالاب میں چھلانگ لگا دیتی ہے، دریں اثنا میں زرتشت... پڑھنے لگتا ہوں۔ سہ پہر کو میں اپنے بچپن کے ایک دوست کو فون کرتا ہوں جو ایک ٹریول ایجنسی چلا رہا ہے۔ وہ ایک بڑی کمپنی میں کام کرتا تھا جہاں وہ، اپنے بیان کے مطابق، ''چوری چکاری کی مشین کو ہمواری کے ساتھ چلنے سے باز رکھے ہوئے'' تھا۔ وہ اسے 'ریت کا ذرہ' بھی کہتے تھے، اس لیے نہیں کہ اس کی جسامت مختصر ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ رشوت ستانی کی راہ روکنے کے لیے خود کو ہمیشہ انتظامی امور میں شامل کروا لیتا تھا۔ ایک دن، اپنے فرائض سنبھالنے کے بعد، باس نے اسے ریف میں کمپنی کی شاخ کھولنے کے لیے ایک عمارت کی خریداری کے واسطے الحسیمہ بھیجا۔ اس کے تصرف میں پانچ لاکھ درہم تھے۔ اپنی ذمے داری کو سرگرمی سے انجام دینے کے لیے اس نے ایک جگہ ڈھونڈ نکالی اور بھاؤ تاؤ کر کے قیمت کو تین لاکھ درہم تک گھٹوا لیا۔ دارالبیضا لوٹنے پر باس کو بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ اس نے کمپنی کی دو لاکھ درہم کی بچت کرا دی ہے۔ باس برافروختہ ہو کر بولا، ''لیکن تم سے بھاؤ تاؤ کرنے کے لیے کس نے کہا تھا... تم سمجھے نہیں۔ تمھارا وہاں جانا صرف خانہ پری کے لیے تھا۔ تم نے تو سارے کیے کرائے

Scanned with CamScanner

پر پانی پھیر دیا ہے۔'' ''ایسی بات نہیں، بلکہ میں نے توسب کچھ پکا کرلیا ہے،'' اس نے جواب دیا۔ ''معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں، اور جہاں تک میرا تعلق ہے، معاملہ یکسو ہو گیا ہے۔'' اس کے بعد اسے ہر معاملے کی سن گن لینے کی عادت سی پڑ گئی، یہاں تک کہ اسے چوری چکاری اور غبن کے آثار نظر آ جاتے۔ چونکہ وہ ایک بااہلیت آدمی تھا جس کی ایمانداری پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی تھی، باس اسے ملازمت سے برطرف کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے بجائے اس نے اسے ملک کے باہر بھیج دیا، ایک ایسے ملک میں جہاں جنگ چھڑی ہوئی تھی، جس کا غیر تسلیم شدہ مقصد اس سے چھٹکارا پانا تھا۔ لیکن وہاں بھی اس نے رشوت کا انسداد شروع کر دیا، اور جس دن اس کے دفتر اور گھر پر گولہ باری ہوئی، اسے زبردستی واپس مراکش بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد کی کہانی قابلِ پیش گوئی تھی۔ انتقام کے مشتاق منیجر نے اسے اس دن کھڑے کھڑے نکال دیا جب گفتگو کے دوران ایک ناشائستہ لفظ اس کی زبان سے نکل گیا۔ 'ریت کا ذرہ' بے روزگار ہو گیا، لیکن اس پر مفتخر رہا کہ اس کی راست بازی سلامت رہی۔

کیا میں اس سے اعتراف کر سکوں گا کہ میں پھسل گیا ہوں، کہ میں اب وہ پہلا سا آدمی نہیں رہا، اور ایک نئی زندگی میرے لیے شروع ہو رہی ہے؟

ہم ملتے ہیں اور بچوں اور اسکول کے اخراجات کے بارے میں باتیں کرتے ہیں؛ مہنگائی اور اپنی غربت کے بارے میں۔ اسے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ میں نے شہر کے سب سے گراں ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے بونس ملا ہے اور یہ چند روزہ تعطیل بیٹی کے لیے تحفہ ہے۔ وہ قائل ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔

''تمھیں چاہیے تھا کہ ہمارے ہاں ٹھہرتے؛'' وہ کہتا ہے۔

''کریمہ ایسے ہوٹل میں ٹھہرنے کا خواب دیکھ رہی تھی جس میں تیرنے کا اچھا سا تالاب ہو۔ یہ ایک تحفہ ہے۔ ایسی چیز نہیں جو میں اسے روز روز دے سکوں۔''

وہ مجھے اس کمپنی کے خلاف اپنی عدالتی کارروائی سے آگاہ کرتا ہے جس نے اسے برطرف کیا تھا اور کہتا ہے کہ اگر اس نے چوری کی ہوتی تو کبھی نہ نکالا جاتا۔

Scanned with CamScanner

ہم شہر کی لمبی سیر کرتے ہیں اور اس کے گھر کھانا کھاتے ہیں۔ اگلے دن کریمہ میرے دوست کی بیٹی ماریہ کے ساتھ اس کے گھڑسواری کے کلب جاتی ہے۔ جب واپس آتی ہے تو اس کے بارے میں تفصیل سے بتاتی ہے۔ ''دیکھیں گے،'' میں کہتا ہوں۔

اتوار کے دن، سہ پہر کے چار بجے، ہم واپسی کے لیے ریل گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔ کریمہ جلد ہی سو جاتی ہے۔ مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا۔ ضیافت ختم شد۔ میں اس فوجی کی طرح ہوں جو چھٹی سے لوٹ رہا ہو۔ میں خود کو پھر سے کمزور محسوس کر رہا ہوں، شکوک سے لبریز۔ آواز 'ب' میرے اندر سے ابھرتی ہے، لیکن اونچی نہیں ہوتی۔ یہ مجھ سے وہی سب کچھ کہتی ہے جو میں پہلے سے جانتا ہوں: ''تمھارا دوست تم سے زیادہ باعثِ فخر ہے۔ وہ دھوکے بازوں، کرپشن، ایک پورے نظام سے برسرِ پیکار ہے۔ وہ یکہ وتنہا ہے۔ تم نے اس سے جھوٹ بولا۔ تم نے اپنی دوستی کے ساتھ غداری کا پہلا قدم اٹھالیا ہے۔ وہ گزر بسر کے لیے ہفتے کے ہر دن محنت کرتا ہے، کبھی چھٹی نہیں مناتا، اور صرف اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کی بیوی اس کی بہت مدد کرتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی گھر لاتا ہے اس سے مطمئن رہتی ہے اور زیادہ کا مطالبہ نہیں کرتی۔ وہ صورتِ حال سے واقف ہے اور کبھی اپنے شوہر کو وہ کرنے کی شہ نہیں دیتی جو دوسرے کرتے ہیں۔ دوسری طرف، تم نے ایک مدت تک مزاحمت کی، لیکن بالآخر دباؤ کے آگے سپر انداز ہو ہی گئے۔ اب تمھارا کیا ہوگا؟ آگے کیا منصوبے ہیں؟ نجیبہ کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرو گے؟ لیکن کیا تمھارے پاس اتنی حسین جوان عورت کے مطالبات پورے کرنے کے وسائل ہیں جو زندگی اور ارمانوں سے چھلک رہی ہے؟ کیا تمھارے پاس اتنا جسمانی کس بل اور توانائی ہے کہ وہ جنگ جیت سکو جو حلیمہ چھیڑنے سے نہیں ہچکچائے گی؟ وہ آخر تک مقابلہ کرے گی، کیونکہ وہ اس شے کا ایک زمانے سے انتظار کرتی آ رہی ہے، اور نہیں چاہے گی کہ کوئی اور اس سے فائدہ اٹھائے، جسے تم اپنے 'بونس' کہتے ہو۔ وہ ناقابلِ مزاحمت ثابت ہوگی، کفر، تشدد؛ کوئی چیز اس کی تسکین نہیں کر سکے گی۔ ہو سکتا ہے یہ جنگ محبت کے واسطے ہو؛ کچھ بھی ہو، وہ تمھیں نچلا نہیں بیٹھنے دے گی۔ میرے بیچارے دوست، تم نے اچھا کیا جو ننھی کو چھٹیوں کے یہ چند دن فراہم کر دیے، اس کے باوجود کہ یہ گندے پیسے سے خریدے گئے ہیں۔ اسے اس کی ضرورت تھی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ فیصلہ کرو: گھر جاؤ، پیسے واپس کر دو، اور پاک وصاف رہو، یا پرانی زندگی

کو خیر باد کہو اور دیکھو کہ نئی زندگی کہاں لے جاتی ہے۔ تم بھول رہے ہو کہ تم نہ مہم جو ہو، نہ جوے باز۔ تم ایک سیدھے سادے، نیک فطرت آدمی ہو جو پاکبازی سے گھٹ کے رہ گیا ہے۔ تم ساری زندگی راست بازی کے احساس سے مغلوب رہے ہو اور اب، جسے صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے، اس سے بھٹک رہے ہو۔ الوداع، میرے دوست! میں تمھیں ارضی مناظر اور تمھارے خیالات کے ساتھ چھوڑ کر رخصت ہوتی ہوں۔''

قنیطرہ پر ایک خوبصورت عورت ایک بڑی عمر کے آدمی کے ہمراہ گاڑی میں سوار ہوتی ہے۔ وہ اس کی بیٹی ہو سکتی ہے، لیکن ایسا ہے نہیں؛ وہ اس کی بیوی ہے۔ آدمی، بظاہر، مالدار ہے، شہری باشندہ نہیں۔ عورت غالباً اوسط گھرانے کی ہے۔ بہت زیادہ میک اَپ تھوپ رکھا ہے، بہت زیادہ زیورات سے لدی پھندی ہے، اور تیز خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔ قدرے انگھڑ معلوم ہوتی ہے۔ جب بیٹھتی ہے تو اس کا تھیلا الٹ جاتا ہے۔ کڑے اور سونے کی زنجیر، نوٹ رکھنے کا موٹا جیبی بٹوا، چند تڑے مڑے سو درہم والے نوٹ، دو عدد لپ اسٹکیں، رومال، بال کاڑھنے کا برش، کنجیوں کا گچھا اور کسی مذہبی تحریر کے کاغذ میں لپٹا ہوا تعویذ نکل کر سیٹ پر بکھر جاتے ہیں۔ جب وہ ان چیزوں کو سمیٹنے کے لیے جھکتی ہے تو مجھے اس کی چھاتیاں صاف نظر آتی ہیں۔ وہ میری طرف سوچی سمجھی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی ہے۔ میں چیزیں ترتیب سے رکھنے میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ بوڑھا آدمی مجھ سے کہتا ہے:

''عورتیں شیطان کی بھتیجیاں ہیں... غازے اور خاک دھول کے پیچھے چہرہ چھپا لیتی ہیں... اور ہم کتے کے پلّوں کی طرح ان کے قدموں میں گر پڑتے ہیں، اپنے گھٹنوں کے بل، جیسے اس وقت تم ہو۔''

میں کھڑا ہو جاتا ہوں اور کہتا ہوں، ''خدا آپ کو شیطان اور اس کی اولاد سے محفوظ رکھے!'' عورت کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں سردمہری نہیں۔ بڈھے کو جھپکی آ گئی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے عورت ہر چیز کے لیے تیار ہے۔ اس قسم کی عورت مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے۔ کریمہ آہستہ آہستہ جگنے لگی ہے۔ عورت موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوے آ کر ہمارے برابر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ کریمہ کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، اس کی تعریف کرتی ہے، اور اپنے گھر انفا آنے کی دعوت دیتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ مجھے اپنا گھر کا پتا اور فون نمبر دیتی ہے۔ کریمہ پوچھتی ہے کہ کیا اس کے بچے ہیں اور اس کے پاس تالاب ہے۔

''بچے تو نہیں، لیکن اچھا تالاب ہے،'' وہ جواب دیتی ہے۔

ہمارے دارالبیضا پہنچتے پہنچتے شوہر بیدار ہو جاتا ہے اور ریل گاڑی میں ہونے کی وجہ بتاتا ہے۔

''میرے احمق ڈرائیور کے یہاں ابھی ابھی ساتواں بچہ ہوا ہے۔ اسے کتنا بھی سمجھاؤں کہ کرۂ ارض پر پہلے ہی بہت بوجھ ہے لیکن وہ مسلسل بیوی کو حاملہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیں لینے قنیطرہ نہیں آسکا۔ عجیب اول جلول آدمی ہے! مجھ سے کہنے لگا، 'ٹرین لے لیں۔' دنیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے! نہ احترام نہ عزت۔ کوئی دن کی بات ہے، رئیس رو سیاہ ہو جائیں گے۔''

میں کریمہ کو گھر پہنچاتا ہوں، کپڑے تبدیل کرتا ہوں، اور باہر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ بیوی دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر میرا راستہ روکتی ہے۔ ہاتھوں میں خواب آور ٹکیوں کی شیشی دبا رکھی ہے اور ساری کی ساری گولیاں نگلنے کی دھمکی دیتی ہے۔ میں بیٹھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اپنی بدمزہ اداکاری بند کرے۔ وہ چیخیں مار کر اپنی نفرت اور تکلیف کا اظہار کرتی ہے۔ دریں اثنا، ٹیلیوژن پر ایک مصری سوپ اوپیرا آ رہا ہے جس میں ایک ترک کردہ عورت پوری قوت سے چلا رہی ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں گھر میں ہوں یا سوپ اوپیرا میں۔ میں ٹیلیوژن بند کر دیتا ہوں۔ بیوی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، میرے برابر آ بیٹھتی ہے، اور معافی مانگتی ہے۔ میں نے پہلے کبھی اسے ایسی حالت میں نہیں دیکھا ہے۔ عام طور پر تو وہ اپنے بہت قوی اور پُراعتماد ہونے کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ سر نیہوڑا کر اپنے کمزور ہونے کا محض ڈھونگ کر رہی ہو؟ مجھے شبہ ہوتا ہے، یہ کوئی جال ہے، کوئی چارسوبیسی۔ ''اپنے کو مضبوط رکھو، پرسکون رہو، ہار نہ مانو،'' میں اپنے سے کہتا ہوں۔ میں اس گھر کو دیکھتا ہوں جو اب مجھے اپنا نہیں معلوم ہوتا، یہ ساز و سامان، صوفے کی گدیاں، دیوار پر آویزاں تصویریں۔ میں پھیلی ہوئی بے ترتیبی پر غور کرتا ہوں اور یہاں اپنے اجنبی ہونے کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ میرا بیٹا داخل ہوتا ہے، بغل میں کتابیں دبائے۔ وہ کچھ نہیں کہتا، ایک پھل اٹھا کر پھر بجلی کے کھمبے کی روشنی میں پڑھنے باہر چلا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کریمہ سوگئی ہے۔ میں حلیمہ سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ناچاقی گہری ہے اور ان پچھلے چند دنوں کے واقعات سے کہیں زیادہ پیچھے جاتی ہے۔

''اگر آج ہم گھر ٹوٹنے کی منزل تک پہنچ گئے ہیں تو جان لو، اس میں تمھاری ماں کا بڑا ہاتھ ہے۔ پیسے کی پوجا ہر چیز کو جو اس سے چھوجائے سڑا گلا دیتی ہے۔ اسے سیدھے سادے انسانوں سے، ایسے ایماندار انسانوں سے جو کجرو ہونے کے نااہل ہیں، نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ایک طویل مدت تک میں اس نفرت کو اپنے ساتھ لیے پھرتا رہا۔ مجھے اس پر فخر تک محسوس ہوتا تھا۔ تمھاری ماں نے مجھے اس کا جتنا زیادہ احساس دلایا، میری راست بازی اسی تناسب سے اور مستحکم ہوتی گئی۔ لیکن اس سے مسلسل پیکار کرنا بہت مشکل ہے! میں جب تک ہوسکا اس کی مزاحمت کرتا رہا... یہاں تک کہ ایک دن میں نے ہتھیار ڈال دیے، تمھاری ماں کے ہاتھوں اپنی سبک سری سے جان چھڑانے سے زیادہ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر۔ تم نے ہمیشہ اپنی ماں کا ساتھ دیا ہے، تو اب اسی کے پاس واپس چلی جاؤ۔ جاؤ، جا کر اس کے ساتھ رہو اور مجھے چین کا سانس لینے دو۔ میں جدوجہد کروں گا تاکہ میرے بچوں کو کسی چیز کی تنگی محسوس نہ ہو۔ جب تک ان کا مستقبل پکا نہیں کر لیتا، خود آسائش اور تعیش کی زندگی نہیں گزاروں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ مجھے روکنے کی کوشش مت کرو۔ ایک زمانے سے ہمارے درمیان محبت سرد ہو چکی ہے۔ ہماری زندگی بے کیف اور یاس انگیز بن کر رہ گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کا کوئی بھلا نہیں کر رہے۔''

میں باہر نکل جاتا ہوں، اس طرح حساب بے باق کرنے پر اسے ہکا بکا چھوڑ کر۔ میں نجیہ کی گھنٹی بجاتا ہوں۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ میں دوبارہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ ایک پڑوسی کھڑکی کھول کر بتاتا ہے کہ وہ کسی سفر پر گئی ہوئی ہے۔ میں خود کو تنہا پاتا ہوں، تھکا ماندہ، بے گھر۔ کیا اپنے گھر واپس چلا جاؤں؟ ناممکن۔ میں رات باہر کھلے میں گزارنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ میں شاہراہِ گاندھی کے سہارے سہارے چلنے لگتا ہوں۔ ہائی اسکول اور کالج کے زیادہ سے زیادہ طلبا اس خوب روشن شاہراہ پر پڑھائی کرتے ہیں۔

میرا لڑکا مجھے روکتا ہے۔

''ابا، کہاں جا رہے ہیں؟''

''کہیں نہیں۔ بس چہل قدمی کر رہا ہوں۔ فضا دلکش ہے۔''
وہ میرے ساتھ چلنے کی پیشکش کرتا ہے۔
''گھر کے حالات ٹھیک نہیں لگ رہے، ابا!''
''نہیں، اچھے نہیں ہیں۔ زندگی آسان نہیں۔ ہاتھ میں پیسہ آتے ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ دوسرے کو دھکے مار سکتے ہیں، اس کے پیر کچل سکتے ہیں۔ تمھاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''
''محنت کرتا ہوں، لیکن کبھی کبھی ہمت ٹوٹ جاتی ہے، خاص طور پر جب یہ احساس ہوتا ہے کہ کچھ بھی کرنے کے لیے تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کسی بڑے اسکول جانا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے، داخلے کے لیے مقابلے کا امتحان ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر یہ کافی نہیں ہوتا، سفارش کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ایسی چیز ہے جو خریدی نہیں جاسکتی۔ اور میں آپ جیسا ہوں۔ رشوت، ہرگز نہیں! حقیقت میں، اگر سب لوگ ہم جیسے ہوں، تو ملک بہت اچھی حالت میں ہو۔ مجھے کرپشن کا ہم معنی عربی لفظ 'فساد' زیادہ پسند ہے: یہ اُس چیز پر دلالت کرتا ہے جو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہو، حشرات کی طرح، جیسے لکڑی جو سڑ گل گئی ہو اور کسی کام کی نہ رہی ہو، حتیٰ کہ آگ جلانے کے کام بھی نہ آسکے۔ آدمی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر وہ اپنی روح بیچ دیتا ہے، دوسروں کا ضمیر خریدتا ہے، تو وہ عام بربادی کے عمل میں شریک ہو رہا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، رشوت بھیک مانگنے کی طرح ہے۔ بھکاریوں کا وجود اس لیے ہے کیونکہ لوگ بھیک دیتے ہیں۔''

ہم ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کی بات سنتا ہوں۔ مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن میں کچھ کہتا نہیں۔ وہ مجھے واپس گھر لے جانے کی پیشکش کرتا ہے اور میں قبول کر لیتا ہوں۔ راستے میں وہ بتاتا ہے کہ ویک اینڈ پر دو شخص مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ شاید یہ حاج حمید تھا، شاید سوچتا ہو کہ اس کے ساتھ شراب خانوں کا پھیرا لگانا پسند کروں۔ میں لونگ روم میں بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہوں، لیکن میرے خیالات کہیں اور ہیں۔ میں کتاب رکھ کر روشنی گل کر دیتا ہوں۔ رات لمبی اور کٹھن ہوگی۔ بیٹے کے الفاظ میرے ذہن سے گزرتے ہیں۔ مجھے خجالت محسوس ہوتی ہے۔ میں لفافہ مسٹر صبان کو واپس لوٹانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ اس وقت وہ وجود اور عدم میں پڑا ہوا ہے، جو نجیہ کی بک شیلف میں رکھی ہے۔ میں اس کے جلد واپس آنے کی آس لگاتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے کسی ایسے شخص کا پتا

لگانا ہوگا جو مجھے قرض دے سکے، تا کہ اس میں سے جو کچھ خرچ کر چکا ہوں وہ واپس لوٹا دوں۔ یہ دو ہزار درہم کے لگ بھگ ہوگا۔ شرط بدنے کو تیار ہوں کہ اتنی رقم حلیمہ کے پاس ضرور ہوگی۔ مجھے اس سے صلح صفائی کرنی ہوگی۔ معاملہ الجھتا جا رہا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ میں نے رقم لی ہے۔ میں اسے اپنے پاس رہنے دے سکتا ہوں اور یہ ظاہر کر سکتا ہوں جیسے میرے پاس نہیں ہے۔

کس نے کہا تھا کہ رات اچھا مشورہ دیتی ہے؟ یہ غلط بات ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ مشورہ نہیں دیتی، بلکہ یہ حقائق کو ضرورت سے زیادہ ڈرامائی شکل دے دیتی ہے، بڑھا چڑھا کر زیادہ وزنی بنا دیتی ہے۔ میں خود کو سرنگ میں پاتا ہوں جہاں حرکت کرنا دشوار ہے۔ رات بوکھلاہٹ پیدا کرنے والی شے ہے۔ میں اپنے پیر زمین سے اکھاڑ نہیں پاتا۔ جب بھی قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں، میرے جوتوں کے تلوے فٹ پاتھ سے چپک جاتے ہیں۔ ہر بار جب جدوجہد کرتا ہوں، میری پنڈلی کے پٹھے کھنچنے لگتے ہیں۔ میں پسینے میں نہا گیا ہوں۔ باہر نکلنے کا راستہ نظر نہیں آ رہا۔ بہتر ہے کہ اٹھ کر ایک گلاس پانی پی لوں۔ اگر رخنہ اندازی ہو تو ڈراؤنے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ الا یہ کہ یہ اتنے قوی، اتنے متشدد ہوں کہ آدمی کے واپس سو جانے کا انتظار کریں اور دوبارہ ابھر کر اس کے سر میں، جب وہ تکیے پر ابتر حالت میں پڑا ہو، تباہی مچا دیں۔

اب میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میرے پاس پیچھے لوٹ جانے کا کوئی امکان نہیں۔ میرا ضمیر جتنے کچوکے لگانا چاہتا ہے، لگائے۔ یہ میرا ضمیر ہی ہے جو مجھے اس سرنگ میں لا پھینکتا ہے۔ اگر یہی قیمت ادا کرنی ہے تو یوں ہی سہی۔ میں سرنگ کے فٹ پاتھ سے عہد و پیمان کرتا ہوں۔ میں ہر رات یہاں ہوں گا۔ میں بالآخر اس کا عادی ہو جاؤں گا۔ سرزمین ظلمات کی پیہم زیارت کرنے سے میں اپنے شیطانوں کو زیر کر لوں گا۔ دل کو، جیسا کہ دوسری آواز کہتی ہے، سخت ہونا چاہیے، یا ٹوٹ جانا چاہیے۔ کوئی رحم نہیں، کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اُن خالی برسوں اور خشک موسموں کا ازالہ کر دیا جائے جن کے دوران کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

دوسری آواز چل پڑتی ہے: ''بالآخر تم آزاد ہو گئے ہو، تم نے وسوسوں سے نجات پا لی ہے۔ اپنی انگلی، اپنا ہاتھ، اپنا پورا بازو مشین کی چرخی پر رکھ دیا ہے۔ اب تم پر واجب ہے کہ عزم سے آگے

Scanned with CamScanner

بڑھتے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ یہ بے حد آسان ہے۔ اب تمھارے لیے ضروری ہے کہ اپنے رہن سہن میں چند تبدیلیاں لاؤ۔ مجھے پتا ہے، تم نے پہلے سے اندازہ کرلیا ہے کہ کیا تبدیلیاں لانی ہیں، لیکن اتنا کافی نہیں۔ تمھیں اپنے دوست احباب بھی بدلنے ہوں گے۔ باہر دنیا میں نکلو، اپنی موجودگی کو لوگوں پر ظاہر کرو، باروں میں جاؤ، دوسروں کو شراب پینے کے لیے مدعو کرو، عشایئے دو، محفلیں منعقد کرو، الغرض، ذہن کو رشوت خور کے محتاط شائستگی کے سانچے میں ڈھالو۔ شروع میں بے چینی ضرور محسوس ہوگی، لیکن چند دنوں میں یہ جاتی رہے گی اور تم اس کے عادی ہو جاؤ گے اور دنیا کو تازہ نگاہ سے دیکھنے لگو گے۔ خود کو خطرات میں ڈالے بغیر زندگی میں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بہرحال، تمھاری تنگ افق، چھوٹی سی زندگی کی بازار میں کوئی قیمت نہیں۔ چاہو تو اسے عید الاضحیٰ کے موقعے پر بھیڑوں کی منڈی میں بیچ کر دیکھو، لیکن مجھے یقین نہیں کہ لوگوں کا ازدحام اسے خریدنے کو ٹوٹ پڑے گا۔ کون ایسی خشک اور تنگ کھال میں گھسنا چاہے گا جس میں بس آدھے آدمی کے سمانے کی جگہ ہے؟ کون ان پُرآزار پینتالیس سالوں کو اپنانے بھاگا بھاگا آئے گا؟ خطرہ کم سے کم یا بلکہ معدوم ہے۔ چنانچہ، میرے دوست، اپنے وسوسوں سے ہمیں بے لطف نہ کرو، جو تمھارے اہل و عیال کو آزمائشوں میں ڈالے ہوے ہیں۔ نجیہ کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاؤ، اپنا تھوڑا سا وقت اور یہ پیسہ جسے تم ناپاک کہتے ہو، اُسے دو۔ اسے خوش کرو، چاہے ایک ہفتے کے لیے یا ایک مختصر سے موسم کے لیے۔ دوڑو، گاؤ، شور مچاؤ، کدکڑے مارو، اپنی کھال پر کچھ رنگ لاؤ، اور نارنگی کے پھولوں کا تھوڑا سا پانی اپنی بغلوں میں چھڑکو، بالوں کی تراش خراش بدلو، یہ بھونڈی مونچھ مونڈ ڈالو، اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو — وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آگے بڑھتے جاؤ اور سوچ بچار بند کرو!''

تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، مجھے سوچ بچار بند کرنا چاہیے ورنہ پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ دیوانگی گھات میں بیٹھی ہے، میں اسے اپنے چاروں طرف منڈلاتا ہوا محسوس کرتا ہوں، مجھے طعنے دے رہی ہے، عہد کر رہی ہے کہ لوٹ آئے گی اور میرے عقل و ہوش پر قابض ہو جائے گی۔

ٹھیک ہے۔ چلو معاملہ صاف کردیں اور لیاقت سے کام کریں۔ ایک ایک کر کے چیزوں سے معاملہ کریں: کل صبح دفتر جاتے ہوے میں نجیہ کے یہاں رکتا ہوا جاؤں گا۔ اگر وہ موجود ہوئی تو اسی شام ملنے کی دعوت دوں گا۔ اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ دفتر پہنچ کر ڈائریکٹر کے ساتھ قہوہ پیوں

Scanned with CamScanner

گا۔ مجھے معلوم ہے کہ حاج حمید یہی کرتا ہے۔ یہ دونوں کے درمیان ایک طرح کا اشارہ ہے۔ ہم بارش اور موسم کی خوشگواری کی باتیں کریں گے۔ جب ہم وہاں سے اٹھ رہے ہوں گے، میں باس سے پوچھوں گا کہ کیا اور فائلیں ہیں۔ وہ میرا باس سہی، لیکن میرے دستخط نہ ہوں تو بے بس ہے۔ سو کل صبح آٹھ بجے میں ایک رشوت خور دفتری اہلکار کی جون اختیار کرلوں گا۔ میں ان الفاظ پر نادم نہیں۔ ظہر کے وقت میں حاج حمید کو لنچ پر چلنے کی دعوت دوں گا۔ میری دانست میں اس کے ساتھ اخفا اور ایما غیر ضروری ہیں۔ مجھے کھل کر بات کرنی چاہیے، پتے کھول کر کھیلنا چاہیے۔ میں اس مکان کے بارے میں اس سے صلاح مشورہ کروں گا جس کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے رقم قرض دے دے۔ خیر، یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ مجھے فی ہفتہ ایک سودے پر قناعت کرنی چاہیے۔ جلدی سے لگائے گئے تخمینے کے مطابق اس سے ماہانہ چالیس اور پچاس ہزار درہم کی آمد ہوسکتی ہے، یعنی چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر۔ اس حساب میں اگر عام چھٹیوں، تعطیل پر جانے، اقتصادی اونچ نیچ، بعضے ٹھیکیداروں کی خست، اور کچھ تعیشات کو بھی —— آپ دیکھیں گے کہ میں ان کی اہلیت رکھتا ہوں —— منہا کر دیا جائے تو میں سالانہ پانچ ملین ہاتھ آنے کا یقین کرسکتا ہوں۔ اور اس برستے ہوئے بن کو، اس حقیقی خزانے کو صرف میری موت ہی روک پائے گی۔ یہ خیال مجھے طاقتِ پرواز، جرأت، اور ولولہ بخشتا ہے۔

آج صبح میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ حلیمہ میرے لیے قہوہ تیار کر رہی ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، یہاں تک کہ اس سے پوچھتا ہوں، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ وہ کہتی ہے، نہیں۔ میں باہر آ کر ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرتا ہوں۔ یہ ایک مسلمان بھائی ہے: لٹکی ہوئی تسبیح، کھلا ہوا قرآن، اور کیسٹ ٹیپ، جس میں عبدالصمد سورۃ البقرہ کی قرأت کر رہا ہے۔ میں سگریٹ جلانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کی آنکھیں سیاہی مائل ہیں۔ گاہے بگاہے وہ پیچھے دیکھنے کے آئینے میں میری طرف نگاہ ڈال لیتا ہے۔ اس کی گنجان ڈاڑھی مجھے خوفزدہ کر رہی ہے۔ میں بھی خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ اقتدار کبھی ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ ''یہ لوگ فساد کی اولاد ہیں،'' میرے سابقہ فلسفے کے پروفیسر نے، جس سے کبھی کبھار فرانسیسی ثقافتی مرکز میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، ایک دن مجھ سے

کہا تھا۔ ''جس کا مطلب ہے کہ عام لوگ جتنے زیادہ رشوت خور ہوں گے، اسلامیوں کو پنپنے اور لڑنے کا اتنا ہی زیادہ جواز ملے گا۔''

مجھے دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ کافی مصروفیت کا دن سامنے کھڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک عرضی پر آج ہی ساری ضروری کارروائی مکمل کرنی ہے۔ میں اپنے ہاتھ ملتا ہوں۔ یہ کیسے ہوا کہ آسان پیسہ اور پہلے ہاتھ نہ آیا؟ حاج حمید بتاتا ہے کہ مسٹر صبان میری تلاش میں ہے۔ ''مجھے پسند کرنے لگا ہے؛'' میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں۔

سہ پہر کے وقت وہ بغل میں ایک موٹی سی فائل دابے، میرے دفتر میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ حاج حمید کسی اور میٹنگ کا بہانہ بنا کر معذرت کے ساتھ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ کیا ہو رہا ہے جس سے بے خبر ہوں؟ مجھے شبہ کیوں ہو رہا ہے؟

مسٹر صبان بتاتا ہے کہ یہ عرضی اس کی نہیں، ایک امریکی کمپنی کی ہے جو ایک مراکشی جماعت کی مشارکت سے تعمیراتی کاروبار میں منافع کے لیے سرمایہ لگانا چاہتی ہے۔ وہ تو بس ایک درمیانی واسطہ ہے۔

''میں تو بعض دوستوں کے کام آ رہا ہوں۔ دوستی اہم چیز ہے۔ بھلائی کی یاد بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے۔''

پھر وہ مجھے منصوبے کے بارے میں صراحت سے بتاتا ہے، معاملے کو جلد لپیٹ دینے کی اشد ضرورت پر اصرار کرتا ہے اور دو دن بعد لوٹنے کو کہتا ہے۔ اس کے جاتے ہی میں لفافہ تلاش کرتا ہوں۔ وہ نہیں ہے۔ عجیب بات ہے۔ شاید وہ دستخط کرنے پر دے۔ میں حاج حمید سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ کاغذات کا معائنہ کرتا ہوں۔ ہر بات ضابطے میں نظر آتی ہے۔ میں اس کے حق میں تائید کرنے اور فائل ڈائریکٹر کو پہنچانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ اسے بھی تو معلوم ہو جائے کہ کاہے کے بارے میں ہے۔ میں اوپر اس کے پاس جاتا ہوں۔ جیسے ہی فائل اس کی ڈیسک پر رکھتا ہوں، وہ ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے اور مسٹر صبان کے خلاف اُدھم مچانے لگتا ہے، اور اسے 'چلتا پرزہ' کہتا ہے۔

''اس میں سے بدبو آ رہی ہے۔ وہ بچولیے کا ڈھونگ کیوں رچا رہا ہے؟ میرا مشورہ ہے کہ تم منظوری واپس لے لو۔ ہو نہ ہو، یہ کوئی چال ہے۔''

Scanned with CamScanner

ہوسکتا ہے کہ وہ مسٹر صبّان پر اس لیے خار کھائے بیٹھا ہو کہ اس نے براہ راست میرے پاس آ کر اس کی تحقیر کی۔ اسے اپنا کمیشن نہیں ملے گا، اس لیے اپنی بھڑاس نکال رہا ہے اور چاہتا ہے کہ سودا ناکام رہے۔ میں فائل اٹھا کر واپس اپنی ڈیسک پر آ جاتا ہوں۔ مجھ پر آشکار ہوتا ہے کہ غیر قانونیت اتنی سہل نہیں۔ اس کے بھی اپنے قواعد ہیں، تحریری اور غیر تحریری قوانین، رموز اور علامات۔ میں ان سے نابلد ہوں۔ اس دلدل میں ابھی بس میرے پاؤں ہی گیلے ہوئے ہیں۔ میں کیا کروں؟ منظوری دینے سے انکار کر دوں؟ عرضی کے معائنے میں تاخیر کروں؟ بچولیے سے کیا کہوں، جس کے پاس اور راستے کھلے ہوں گے؟ اگر وہ سیدھا وزیر کے پاس پہنچ جائے تو؟ لیکن وزیر اتنے معمولی سے کام میں کیوں ہاتھ ڈالنے لگا۔ وہ اسے اپنی کابینہ کے سربراہ کے حوالے کر دے گا، جو میرے دفتر کے ڈائریکٹر کی ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے نہیں ہچکچائے گا۔ الغرض، تانے بانے کچھ اس طرح بُنے ہوئے ہیں کہ سب، یا تقریباً سب ہی ملوّث ہیں۔ بقول مسٹر صبّان کے، بھلائی کی یاد اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ احسان ایک طرح کا قرض ہے؛ ایک نہ ایک دن اسے چکانا پڑتا ہے۔

اگلے دن، مسٹر صبّان سویرے سویرے ہی میرے دفتر آ دھمکتا ہے۔ کہتا ہے کہ جلدی میں ہے اور یہ کہ کل وہ فائل کا کچھ حصہ دینا بھول گیا تھا۔ ایک بڑا سا زرد لفافہ میری طرف بڑھا دیتا ہے اور جانے کے لیے مڑتا ہے، اور میرا دن اچھا گزرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ اندر ایک چھوٹا سفید لفافہ ہے۔ میں اسے کھولتا ہوں: سو ڈالر مالیت کے نئے نوٹوں کی گڈی۔ امریکی شرکا کے لحاظ سے وہ مجھے ڈالر دے رہا ہے۔ میں جلدی جلدی انھیں گنتا ہوں: چار ہزار ڈالر۔ نوٹ جن سے ابھی تک طباعتی روشنائی کی مہک آ رہی ہے اور جن پر سلسلہ وار نمبر پڑے ہیں۔ میں لفافے کو چھپا کر ایک سگریٹ سلگاتا ہوں۔ حاج حمید ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے معاملہ الجھتا جا رہا ہے۔ یہ شاید خوف ہے یا تجربے کی کمی۔ اس پیسے سے بدبو آ رہی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ اس کو جلد از جلد خرچ کر دینا چاہیے۔ ٹیلیفون بجتا ہے۔ میں اچھل پڑتا ہوں۔ میں، جیسا کہ ڈاکٹر نے کہا تھا، ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوں، کمزور ہوں۔ ہر بات مجھ پر اثر انداز ہو جاتی ہے اور میرا سکون غارت کر دیتی ہے۔ نجیہ فون کر رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کیا کہوں۔ وہ شام گھر آنے کے لیے کہہ رہی ہے، بیٹی کے کھانا کھا لینے کے بعد۔ میں اس پر مسرور اور

Scanned with CamScanner

پریشان دونوں ہوتا ہوں۔ مجھے فیصلے کرنا اچھا نہیں لگتا۔اور جب زبردستی کرنے پڑ جائیں تو انتخاب کے لمحے کو، جس قدر ممکن ہو، التوا میں ڈالنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے اُن دنوں کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے جب سب کچھ پرسکون اور دھیما دھیما تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری زندگی جاں گسل تھی، لیکن گنجلک مسائل سے آزاد بھی تھی۔اب ہر شے ڈرامائی جسامت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر بات سنگین ہے، چاہے یہ ایک ٹیلیفون کال ہو، ایک ملاقات، ایک دستخط، ساحل کے ساتھ ساتھ موٹر میں سیر، حاج حمید کی نگاہ غلط انداز، شاوش کی کوئی جنبش، آسمان کا رنگ، قہوے کا ذائقہ، ڈالر کی تبادلی شرح، اخراجاتِ زندگی — ہر چیز پریشان کن ابعاد کا چولا پہن لیتی ہے۔

نجیہ کی آواز صاف وصریح ہے، اس عورت کی آواز جو جانتی ہے کہ کیا چاہتی ہے۔ حلیمہ بھی جانتی ہے کہ کیا چاہتی ہے۔ بس دونوں جو وسیلے اختیار کرتی ہیں ان میں فرق ہوتا ہے۔ حلیمہ، یقیناً، منتقم ہے، لالچی ہے۔ اس کی ماں اسے شہ دیتی ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ مراکشی عورتوں پر ظلم ہو رہا ہے، ان پر حکومت کی جا رہی ہے، ان کے ساتھ بدعنوانی کی جا رہی ہے! ہاں، بعض عورتوں کے بارے میں یہ درست ہے، لیکن میری ساس کے بارے میں نہیں، اور اس کی بیٹیوں، بھتیجیوں اور عم زادیوں کے بارے میں بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہے؟ غربت ایک نقص ہے، کانا یا کبڑا پیدا ہونے کی طرح۔ اور اگر اس نقص کی ذمہ دار فطرت ہے، تو کیا فطرت کو دوش دیا جائے؟ اگر میں مالدار ہو جاؤں، تب بھی وہ مجھ پر حملے کرنے سے باز نہیں آئے گی، کیونکہ اس کی نظر میں میں پہلے کی طرح قلاش ہی رہوں گا۔

میں مقررہ وقت سے پہلے ہی دفتر سے اٹھ جاتا ہوں۔ آسمان پر نظر ڈالتا ہوں اور حیرت سے سوچتا ہوں کہ آخر اس حرکت کے کیا معنی ہیں۔ سر اٹھانے اور آنکھوں کو نیلاہٹ سے بھر لینے کی کیا تک ہے؟ کوئی تک نہیں۔ بس عادت کی بات ہے۔ آئندہ سے مجھے وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ مجھے سریع اور مستعد ہونا چاہیے، صاف ذہن اور مستحکم۔ دونوں صورتوں میں، چاہے حلیمہ کے ساتھ یا نجیہ کے، مجھے اپنے عزم میں استقامت برتنی چاہیے۔ کاش مجھے پتا ہوتا کہ یہ عزم کس چیز کے بارے میں ہے! خیر، چلو دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے، انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ بھڑک مت اٹھو۔ جلد بازی کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ سوچو، تجزیہ کرو، ٹھنڈے دماغ سے غور کرو، عجلت کے بغیر، ہر چیز

Scanned with CamScanner

کوتولو۔ کچھ بھی کرو، بس جلد بازی نہ کرو۔ اب میں نجیہ سے ملنے جاتا ہوں۔ اسے کئی برسوں سے معلوم رہا ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمارے راستے ایک دوسرے کو کاٹیں گے؛ جبھی تو اسے یہ بالکل قدرتی معلوم ہوا کہ میں اس کے گھر کی گھنٹی بجاؤں اور اس پر اعتماد کر کے اپنا دکھڑا سناؤں۔ ہمارا تعلق بہت پہلے شروع ہوا ہوگا، خاموشی سے، زیرِ سطح۔ اب حساب کا وقت آ پہنچا ہے۔ کیسی ڈراونی بات ہے! میں حیران ہوں اور خود کو کمزور محسوس کرتا ہوں۔ میں اتنی حسین بیوہ کو آخر دے ہی کیا سکتا ہوں؟ اس نے مجھے کیوں چنا ہوگا؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس میں خود بھی اس کی تھوڑی سی مدد کی ہے۔ اب مجھے حقیقت سے نظریں چار کرنی ہوں گی۔ کیسی آزمائش میں آ پڑا ہوں میں!

نجیہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں پہلے گھر جاتا ہوں، کریمہ کو پیار کرتا ہوں، کچھ پھل کھاتا ہوں، اور رخصت ہوتا ہوں۔ حلیمہ کچھ نہیں کہتی۔ اس کا چہرہ تھکا ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر کو تباہ ہوتا ہوا دیکھ رہی ہے، اس کو بچانے سے عاجز۔

نجیہ نے ابھی ابھی اپنی بچی کو سلایا ہے۔ وہ مجھے چمٹاتی ہے اور چومتی ہے۔ میں اس کے جسم کی حدت اپنی بانہوں میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ مجھے دھکیل کر دور کر دیتی ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ وہ بولنا شروع کرتی ہے۔

''میں چند دنوں کے لیے خالہ کے پاس فاس گئی تھی اور وہاں اس معاملے پر غور کیا۔ میرا خیال ہے کہ میں تمھیں چاہتی ہوں اور اگر ہماری شادی ہو جائے تو مجھے مسرت ہوگی۔ میری ماں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ دودھ پلانے والی کہانی ایک مذاق تھا۔''

میں خاموش رہتا ہوں۔ اچھا تو بات یوں تھی۔ کیا تعجب! وہ میرا ہاتھ تھام کر چومنے لگتی ہے۔ میں وجود اور عدم کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا ہوں۔ وہ ہنوز اپنی جگہ پر ہے۔ میں اپنا بریف کیس اسے تھما دیتا ہوں اور اس سے لفافہ نکالنے کے لیے کہتا ہوں۔

''ارے، امریکی پیسہ! تم تو مالدار ہو!''

''ہم مالدار ہیں!''

''کہاں سے ملا؟''

Scanned with CamScanner

''کمیشن۔''

کیسا کمیشن؟''

''وہی جو ہر عزتِ نفس رکھنے والے کو سودا کامیابی سے نبٹانے کے بعد ملتا ہے...''

''لیکن یہ تو رشوت ہے!''

''یہ بات پوری طرح صحیح نہیں۔ رشوت وہ ہے کہ آدمی دوسرے سے اس چیز کے پیسے اگلوائے جو اس آدمی کا حق ہے۔ مثال کے طور پر، پاسپورٹ کی ملکیت ہر شہری کا حق ہے۔ اب اگر، رسیدی ٹکٹ کے علاوہ، پاسپورٹ اہلکار کسی رقم کا مطالبہ کرتا ہے جس کا اندراج نہیں کیا جاتا، تو یہ ہوئی رشوت۔''

''لیکن یہ تو بڑا باریک سا فرق ہے۔ پیسہ بہر حال گندا ہی ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم ایسے ہو، معاشرے کی، ریاست کی، لوگوں کی چوری کرنے کے اہل۔''

''مبالغہ نہ کرو۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں چرایا، خاص طور پر عوام کا۔ یہ رقم مجھے ایک امریکی کمپنی نے دی ہے۔ بہر کیف، یہ دھندا تو ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ہو رہا ہے۔ بقیہ ہم سب تو محض عطائی ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے۔ تم میری امیدوں پر پانی پھیر رہے ہو۔ تمھارے کردار کی راستی، تمھارے وقار ہی نے مجھے تمھاری جانب مائل کیا تھا۔ دیانتدار آدمی نادرات میں سے ہیں۔ میں اسی لیے تمھارے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ افسوس... مجھ سے بھول ہوئی۔''

وہ رونے لگتی ہے۔ مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے جھوٹ بولنا چاہیے تھا۔ ہمیشہ سچ بولنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ میں نے ہوشمندی کا کام نہیں کیا۔ میں اسے اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن زیاں تو ہو ہی گیا ہے۔ وقت نکل چکا۔ میں ہار گیا ہوں۔ سب کچھ ہار گیا ہوں۔ میں سخت نراس ہوں، لیکن آنسو بہانا نہیں شروع کروں گا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں لفافہ واپس بریف کیس میں ڈال دیتا ہوں، وجود اور عدم اٹھاتا ہوں، اور دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔ کیا وہ مجھے روکے گی؟ وہ مضبوط اور اچھی عورت ہے؛ وہ سپر انداز نہیں ہوگی۔ وہ مجھے جانے دیتی ہے۔ رات کے دس بجے میں خود کو باہر سڑک پر پاتا ہوں۔ کچلا ہوا، سفاکی سے منہدم کیا ہوا، میں بمشکل حرکت کر پا رہا ہوں۔ کاش شراب کا متحمل ہو سکتا، مدہوش ہو کر اس مشکل لمحے کو بھلا دیتا۔ اپنی ناخوشی اور تنہائی پر غور کرتے ہوئے

میں چلتا جاتا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی کا خیال آتا ہے، اور ہمارے طنجہ کے اس مختصر سفر کا۔ مجھے عار محسوس ہوتا ہے۔ میں عزت کے قابل نہیں۔ میں نے ہر چیز برباد کردی ہے، تہس نہس کردی ہے، اور مجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہورہا ہے۔ مجھے نجیہ کے ساتھ ہی اپنی زندگی کی بنا رکھنی چاہیے تھی۔ اس نے کبھی مجھے رشوت خوری کی طرف نہ دھکیلا ہوتا۔ میں اپنی کمزوری اور اوہام کا شکار ہوں۔

سیدھے گھر جانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں بہت رات گزر جانے کا انتظار کروں گا۔ اگر حلیمہ مجھے اس پسپا حالت میں دیکھے گی تو اس سے فائدہ اٹھائے گی۔

چلتے چلتے میں ایک عورت سے ٹکرا جاتا ہوں جو سیاہ جلابہ پہنے ہوے ہے۔ میں معذرت کرتا ہوں اور وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اِس گھڑی ایک جوان عورت سڑک پر کیا کررہی ہے؟ میں اس کی طرف رخ پلٹتا ہوں۔ وہ میری طرف آتے ہوئے کہتی ہے، ''تم شکستہ خاطر نظر آتے ہو۔ آؤ، میں تمھیں چائے بنا کردوں۔''

میں بے چون وچرا اس کے پیچھے ہولیتا ہوں۔ اگر مجھ پر ترس کھارہی ہے تو اور اچھا ہے۔ میری بلا سے طوائف ہے یا چور اچکی۔ اور یہ ڈالر، کوئی حرج نہیں کہ رکھ لے۔ میں اپنے ہوش وحواس سمیٹتا ہوں۔ نہیں، یہ رقم میری ملکیت ہے۔ اسے کمانے میں مجھے بیس سال سے زیادہ لگے ہیں۔

ہم تیز قدموں سے خاموشی میں چلتے ہیں۔ جب ہم اس کی خستہ حال عمارت پہنچتے ہیں تو وہ مجھ سے کہتی ہے:

''اس پر توجہ نہ دینا۔ غلیظ لوگ ہیں، عمارت کے داخلے میں کوڑا کرکٹ ڈال دیتے ہیں۔ دیہاتی ہیں جنھیں شہر میں زندگی کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ بعضے تو دیوار پر پیشاب بھی کردیتے ہیں۔ زینے پر کوئی بتی نہیں ہے، کیونکہ جب بھی نیا بلب لگتا ہے، کوئی چرا لے جاتا ہے۔ اپنے بریف کیس کا خیال رکھنا؛ کبھی کبھی لونڈے اندھیرے میں گھات لگائے ہوتے ہیں اور لوگوں کے تھیلے وغیرہ کھسوٹ کر چمپت ہوجاتے ہیں۔''

میں تبصرہ کیے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ ہر طرف سے بدبو آرہی ہے۔ دروازوں کے عقب سے ٹیلیوژن پر مصری اداکاروں کی چیخ وپکار سنائی دے رہی ہے۔ ہمارے بچپن کی مصری فلمیں بڑی شاندار ہوا کرتی تھیں، لیکن ان دنوں ٹیلیوژن پر جو پروگرام دکھائے جارہے ہیں، سخت بیہودہ

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں۔ گراوٹ اسی کا نام ہے۔ اداکاری دکھانے کے بجائے کردار لبڑ دھگی مچاتے ہیں، اجتماعی ہذیان میں شریک ہوتے ہیں اور مراکشی اور زیادہ اپنے مصری دیوتاؤں کی حرکات وسکنات اور اندازِ تکلم کی نقالی کرتے ہیں۔ یہ مرض وبا کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو ایک نئی قسم کی سنسر شپ عائد کرتا: سوقیانہ پن (mediocrity) پر پابندی لگا دیتا! اگر میرے بس میں ہوتا تو مجھے اس پر توجہ ہی نہ دینی پڑتی کہ اس قسم کے پروگراموں کا وجود ہے، نہ اس سے خوش ہوتا کہ اس قسم کی مہملیات لوگوں کو مشغول رکھتی ہیں۔

میں بے دم پانچویں منزل پر پہنچتا ہوں اور یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ یہاں کیا کر رہا ہوں۔ وہ دروازہ کھولتی ہے۔ ایک بلی لپک کر باہر نکلتی ہے اور اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم سہلانے لگتی ہے۔ یہ کون ہے؟ اسے کس نے بھیجا تھا؟ میں سوال کرنے بند کرتا ہوں اور ارد گرد پر نظر ڈالتا ہوں۔ دو صاف ستھرے، مرتب کمرے۔ دیوار پر مصری گلوکار محمد عبدالوہاب کی تصویر آویزاں ہے۔ اس کے برابر، خود اس عورت کی تصویر، جو ایک شُستہ وخوش وضع بوڑھے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہے۔

''میرے والد ہیں۔ اس تصویر کے کھینچے جانے کے چند دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں آتا ہوں، جہاں وہ چائے بناتی ہے۔ میز پر گھڑی والا ریڈیو رکھا ہے۔ گیارہ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ میں اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتا ہوں اور وہ تین منٹ پیچھے نظر آتی ہے۔

جب وہ تن سے اپنا جلابہ جدا کرتی ہے تو مجھے نظر آتا ہے کہ وہ کس قدر جوان ہے۔

''تم سوچ رہے ہوگے کہ میں تمھیں اپنے گھر کیوں بلا لائی ہوں،'' وہ بولی۔ ''یہ احمقانہ اور نامعقول حرکت تھی۔ ایسا میں نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ میں ایک طالب علم ہوں، یتیم۔ اکیلی رہتی ہوں اور راتوں کو اسپتال میں نرس کا کام کرتی ہوں۔ میں طب پڑھ رہی ہوں اور مجھے لکھنا لکھانا بھی پسند ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو، مجھے بہت سی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ میں خاصی متجسس واقع ہوئی ہوں۔ میں اکیلے گھر لوٹنے سے خوفزدہ تھی، سو میں نے اپنے خوف پر قابو پایا: جب تمھیں دیکھا تو مجھے فوراً پتا چل گیا کہ تم بھی میری ہی طرح تنہا ہو اور مجھے ضرر نہیں پہنچاؤ گے۔''

''تم بہت اچھی ہو، لیکن بے دھڑک۔''

''جانتی ہوں۔ سارا دن اسکول میں گزارتی ہوں، اور ہفتے میں تین راتیں اسپتال میں، تو کبھی کبھار مجھے تبدیلیِ فضا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب ہم چائے پی لیں گے، تو تمھیں گھر بھیج دوں گی۔''

''تم عجیب ہو۔''

''بس، وہی ہوں جو ہوں۔ وہ ہونے کی کوشش نہیں کرتی جو نہیں ہوں۔''

''مجھ سے آ ٹکرانے کا شکریہ۔''

''محض اتفاق تھا۔ تم اتنے غمزدہ کیوں ہو؟''

''میں پُرسکون آدمی تھا۔ شادی شدہ، دو بچوں والا۔ اچھی ملازمت تھی، لیکن پھر میں پھسل گیا، اپنا توازن کھو بیٹھا۔ ایک غلطی کر ڈالی، اور اب لگتا ہے کہ اپنے سب طرف رنجیدگی پھیلا رہا ہوں۔ پورا معاملہ بتانے میں بہت وقت لگے گا، اور میں تمھیں بے کیف نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اب اس کا چہرہ اچھی طرح روشنی میں آ گیا ہے۔ اس میں کوئی چیز عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے اس کی ایک آنکھ جامد ہے۔ بالصراحت، بائیں آنکھ۔ میں ایک جھپاکے میں اس کی تصدیق کر لیتا ہوں۔ یہ آنکھ جواباً کوئی جنبش نہیں کرتی، یہ میری طرف حرکت نہیں کرتی۔ مجھے کچھ بے سکونی محسوس ہوتی ہے، اور میرا خیال ہے کہ اسے بھی میری بے اطمینانی کا احساس ہو گیا ہے۔

''ہاں، میں صرف ایک آنکھ سے دیکھتی ہوں۔ دوسری اس وقت جاتی رہی جب میں بچی تھی۔ اسی لیے تم سے ٹکرا گئی تھی۔ اچھا، اب میں سونا چاہتی ہوں۔ میں تمھیں ایک فون نمبر لکھے دیتی ہوں جس پر تم رات کو اسپتال میں مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ اگر تم بات چیت کرنا یا چائے پینا چاہو، مجھے فون کر لینا۔ میرا نام نادیہ ہے۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل دیتا ہوں، اور سیڑھیوں پر لڑکھڑا کر اپنی گردن توڑ بیٹھنے سے بال بال بچتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ کتنی صاف صاف باتیں کر رہی تھی، اور مجھے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ مراکش میں اس قسم حیرت انگیز عورتیں موجود ہیں۔ مجھے اس کی ہر بات پر یقین ہے۔ کیا اسے دروغ گوئی کا مرض ہے؟ شاید۔ مہم جو؟ بالکل۔ نصف رات کے بعد کا عمل ہے۔ میں گھر لوٹتا

Scanned with CamScanner

ہوں۔کل،خدا،آسمان،نجیہ،یانادیہ دوبارہ میرے سکون کی بازیافت میں میری مدد کریں گے۔

صبح کو ڈاڑھی مونڈتے وقت،ہر آنکھ کے نیچے تین نئی جھریاں اور کان کے پیچھے ایک چھوٹا سا سفید دھبا میری توجہ میں آتا ہے۔ پہلے میرا چہرہ کبھی متغیر نہیں ہوتا تھا،ہمیشہ یکساں رہتا تھا،بس ایک طبعی سی تھکان یا آزردگی ضرور ہوتی تھی۔اب لگتا ہے جیسے میں سرحد کے دوسری طرف پہنچ گیا ہوں۔ لیکن حاج حمید کے چہرے سے زندگی کی راحت اور آسائش کا احساس ٹپکتا ہے۔ میں کبھی بے جھریوں والا رشوت خور نہیں بن سکوں گا۔ میں ضرورت سے زیادہ سوچ بچار کرتا ہوں۔سلیقے سے کام نہیں کرسکتا۔ پہلے حلیمہ پوچھا کرتی تھی کہ رات کہاں گزاری۔ اطمینان سے سچ سچ بتانے کے بجائے میں کہانیاں گھڑتا تھا اور اس پر آواز اٹھاتا تھا۔کیا میں تمھیں ایسا آدمی لگتا ہوں جو داشتہ رکھتا ہو؟ نہیں! میں وہ غریب آدمی ہوں جو نہیں جانتا کہ مشین کے راستے سے کیسے ہٹے جو اسے کچل کر رکھ دے گی۔ میں مشین کو ٹھیک یہاں سے دیکھ سکتا ہوں،جو باقاعدہ رفتار سے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ قریب تر آ رہی ہے۔کبھی اسے حاج حمید چلا رہا ہوتا ہے،کبھی مسٹر صبان،اور کبھی نادیہ،جس کے چہرے کے خدوخال دھندلا گئے ہیں۔اور اس اثنا میں میں کیا کروں؟ میں کراہتا ہوں،شکوے شکایتیں کرتا ہوں۔ آئینے سے منت کرتا ہوں کہ وہ کوئی اور پیکر دکھائے،ایک ایماندار آدمی کا پیکر،جو میں اپنی ساری زندگی ہوا کرتا تھا۔لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔معاملے کو درست نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے اب یہ بھی پتا نہیں کہ کون سا دن ہے،لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ میں ڈالروں سے جان چھڑالوں گا۔اگر میں انھیں مقامی سکے میں بدلواتا ہوں تو لگے گا کہ میں نے انھیں کمانے کے لیے کچھ تو کیا۔علامتی عمل،ایک واہمہ۔انھیں درہموں میں بدل کر میں کم از کم یہ تو سوچ سکوں گا کہ ریاستی خزانے میں زرِ مبادلہ لارہا ہوں۔لیکن کیا ان کی مشکوک اصلیت بدلنے کے لیے یہ کافی ہوگا؟

میں ایک ایسے بینک کا انتخاب کرتا ہوں جس سے میں نے پہلے کبھی معاملہ نہیں کیا۔ میرے مخصوص بینک کا ٹیلر (teller) مجھے جانتا ہے اور اسے شک گزرے گا۔کمرہ بہت بڑا اور سرد ہے۔طرزِ تعمیر فرانسیسی دور کا ہے۔بڑا ٹھوس بنا ہوا ہے،جو قطعی حسبِ معمول ہے؛بینک کو ٹھوس ہونا ہی چاہیے۔ مجھے

Scanned with CamScanner

اپنے لجلجے پن کا خوف ہے۔ یہ میری چغلی کھا سکتا ہے، یا مجھ سے کوئی غلط حرکت کروا سکتا ہے۔ کھڑکی کے پیچھے کے آدمی کا چہرہ فربہ ہے، اور اس کے خط و خال مونچھوں کے جھاڑ جھنکاڑ نے ڈھک چھپا رکھے ہیں۔ اس کی تمام حرکات نیم میکانکی ہیں۔ وہ نوٹوں کو برق رفتاری سے گنتا ہے۔ مجھ پر ایک پھسلتی سی نگاہ بھی ڈالے بغیر، وہ ایک فارم پر کرنے کے لیے شیشے کے نیچے سے کھسکا دیتا ہے۔ میں ایک طرف ہو کر اسے غور سے پڑھتا ہوں۔ یہ فرانسیسی میں لکھا ہے۔ میں ہوشیاری دکھا کر عربی میں لکھے فارم کا مطالبہ کر سکتا ہوں، یا کم از کم دولسانی فارم کا۔ لیکن میں ہوشیار نہیں بنوں گا۔ مطلوبہ معلومات میں سے ایک میرے قومی شناختی کارڈ کا نمبر ہے۔ میں وہ لکھ دیتا ہوں۔ اب پہلی بار کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہوا آدمی مجھے دیکھتا ہے، چند لمحوں تک تکتا رہتا ہے، اور میرا کارڈ دیکھنے کو مانگتا ہے۔ میں کارڈ شیشے کے نیچے سے سرکا دیتا ہوں اور انتظار کرنے لگتا ہوں۔ وہ کھڑا ہو کر عقب میں جاتا ہے، پھر لوٹتا ہے۔ میں صرف نصف رقم تبدیل کرانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ یکبارگی مجھے اپنے بیٹے کا خیال آ جاتا ہے، جو امریکہ جا کر انگریزی پڑھنا چاہتا ہے۔ میں اس رقم سے اس کا سفرخرچ ادا کر سکتا ہوں۔ اس سے کہوں گا کہ یہ میرے بچپن کے ایک دوست نے ادھار دی ہے جو اب امریکہ میں رہتا ہے۔ ٹیلر ہموار رفتار سے ڈالر گنتا ہے، بس اسے بار بار اپنی شہادت کی انگلی کو تر کرنا پڑتا ہے کیونکہ نوٹ نئے اور بالکل کرارے ہیں۔

''یہ ڈالر کبھی استعمال نہیں ہوئے ہیں!'' وہ میری توجہ میں لاتا ہے۔

''شاید،'' میں جواب دیتا ہوں۔

میرا جی اس سے کہنے کو چاہتا ہے کہ مجھے شک و شبہے کی نظر سے دیکھنا بند کرے، اپنے تبصرے موقوف کرے، جلدی کرے اور درہموں میں متبادل رقم میرے حوالے کرے۔ لیکن میں جنبش نہیں کرتا۔ میں انتظار کرتا ہوں۔ مجھے کیشیئر کی کھڑکی کا ٹکٹ دینے سے پہلے وہ میرے پتے کی تصدیق کرتا ہے اور میرے دفتر کا فون نمبر مانگتا ہے۔ میں اسے نمبر دیتا ہوں۔ وہ لکھ لیتا ہے، مجھ سے دوبار دہرواتا ہے۔ یہ مرے پر دُرّے مارنا ہے!

کیشیئر میری طرف نہیں دیکھتا۔ رقم پڑھتا ہے، دراز کھولتا ہے، اور سو سو اور دو دو سو درہم کے نوٹوں کی گڈیاں نکالتا ہے۔ میں انھیں نہیں گنتا۔ حقیقت میں میں اس کی انگلیوں کی حرکات کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ساتھ ہی انھیں گننے کی کوشش کرتا ہوں لیکن قاصر رہتا ہوں۔ میں انھیں اپنے بریف کیس میں ٹھونس کر سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل جاتا ہوں۔

اف! کیسی آزمائش تھی! یہ پیسہ کہاں چھپاؤں گا؟ مسٹر صبان کو واپس نہ کردوں؟ نہیں، میں اب پیچھے کی طرف لوٹنے کے موڈ میں نہیں۔

دفتر میں کچھ نیا نہیں۔ وہی لگا بندھا معمول، یا تقریباً۔ صرف ایک فون جو بینک سے نمبر کی تصدیق کے لیے کیا گیا۔

میرا جی نادیہ کو فون کرنے کو چاہتا ہے لیکن مجھے شام پڑنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ رہی نجیہ، تو معلوم نہیں کہ وہ مجھے کبھی اپنے قریب پھٹکنے دے گی۔ میں دن ختم ہونے پر کوشش کروں گا۔ میں گھر کا سکون بحال کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ میں آدھی رقم حلیمہ کو دے دوں گا تاکہ وہ طلائی کمرکس خرید سکے جس کا اسے بڑا ارمان ہے۔ جب بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ کسی شادی وادی پر جانا پڑتا ہے، وہ رونے لگتی ہے۔ اس کی دانست میں ہر شادی شدہ عورت کے پاس طلائی کمرکس ضرور ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں یہ رقم کافی ہوگی یا نہیں، بہرحال اس سے کہہ دوں گا کہ اسے پیشگی سمجھے۔ کسی قدر سکون کا سانس تو لے سکوں گا۔ یہاں تک کہ رات کو نجیہ یا نادیہ سے ملنے بھی جا سکوں گا۔ اسے کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ وہ مجھ سے پوچھ تاچھ نہیں کرے گی کہ رقم کہاں سے آئی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ بیشتر افسر لچکداری سے کام لیتے ہیں! میں لچکدار آدمی بن گیا ہوں۔ مجھے ان گذشتہ چند ہفتوں کے اضطرابوں پر افسوس ہے۔ زندگی اب مجھ پر مسکرا رہی ہے۔ حاج حمید بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس کی مسکراہٹیں پسند نہیں۔ وہ منافق ہے، جہنم میں جائے گا۔ جیسا کہ میری ماں کہتی ہے، ''آنتوں کے اندر تک دھوکے باز۔'' آنتوں ہی کا کیا، اس کا تو سر، ہاتھ، پیر، چال، گفتگو، آنکھیں... سب ہی دھوکے کی ٹٹی ہیں۔

مجھے پھر اتنے حسین چہرے پر جامد آنکھ کا خیال آتا ہے۔ یہ ستم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ح ح (حاج حمید) کے ساتھ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آج سے میں اسے ح ح کہا کروں گا۔ سمجھے گا کہ بڑا نامور ہو گیا ہے، کسی امریکی ٹیلیوژن شو کے اداکار کی طرح۔ عربی میں 'ہائیہ' صوت کے ساتھ یہ 'حاحا' سنائی دیتا ہے، مضحکہ خیز! ح ح کی دو زندگیاں ہیں۔ میں جانتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی بھی جانتی ہے۔ وہ اس پر تحائف اور پیسے لنڈھاتا ہے اور وہ اس سے زیور خریدتی ہے؛ خود اسی نے مجھے

Scanned with CamScanner

ایک دن یہ بتایا تھا۔ اس کے پاس سونے کے دو کمر کس ہیں۔ وہ انھیں مفید سرمایہ کاری سمجھتا ہے، اس کے باوجود کہ سونے کے نرخ میں بہت زیادہ اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ وہ ایک غیر شادی شدوں کے فلیٹ میں اپنے طبّی نام کے کسی دوست کا شریک ہے، جو اسی کی طرح رشوت خور ہے اور اس کا خصوصی کام کسی وزارت میں آلات و اشیا کی خریداری ہے۔ وہ اپنی لونڈیاں ثانوی اسکول کے صدر دروازے سے اٹھاتا ہے، اور کبھی کبھار دانش گاہ کے کیمپس سے۔ زندگی دونوں پر متبسم ہے۔ لڑکیاں ان پر مکھیوں کی طرح یلغار کرتی ہیں۔ بعض اوقات وہ جنسی محفلوں کا انتظام کرتا ہے۔ کل پرسوں کی بات ہے کہ ح ح نے مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ ''وقت آ گیا ہے کہ تمھیں کلب کا حصہ بن جانا چاہیے، اب جبکہ تم مال والے ہو۔۔۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ کسی قسم کے اخلاقی تامل سے اتنا خالی کیوں ہے؟ آخر مجھے کیوں یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی؟ میں اپنے سے کئی سوال کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر چیز کی قیمت ہے: ایک لمحے کی کجروی، خوشی کا ایک پل، یا فراموشی کا۔۔۔ ہر چیز کی۔ مجھے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، جبکہ زندگی ح ح اور اس کے ہالی موالیوں کو طویل مدتی قرض دے دیتی ہے۔ انھیں کوئی فکر نہیں ہوتی، بود و ماند اختیار کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔

رات کو میں نجیہ کی گھنٹی بجاتا ہوں۔ اس کی ماں دروازہ کھولتی ہے، اندر بلاتی ہے اور چائے کا گلاس پیش کرتی ہے۔ نجیہ ابھی ابھی سودا سلف لینے گئی ہے۔ اس کی ماں حلیمہ اور بچوں کی خیر خبر پوچھتی ہے۔ وہ لونگ روم میں مجھے بیٹھا چھوڑ کر باورچی خانے میں جاتی ہے۔ لوٹنے پر کہتی ہے، ''تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ سیدھا سادہ سا ہوگا، لیکن مزیدار۔'' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں۔ نجیہ میرا شاید کھانے تک وہاں رکے رہنا پسند نہ کرے۔ میں شائستگی سے کچھ بڑبڑا دیتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ جب کھولتا ہوں تو نجیہ میرے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ پُرخلوص، حتیٰ کہ سواگت کرتی ہوئی۔ مجھ سے فرانسیسی میں کہتی ہے:

''کل کی بات پر مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تم سے خاصی ترشی کا سلوک کیا تھا۔ بہرکیف، یہ تمھاری زندگی ہے، اور تم وہی کرو جو کرنا چاہتے ہو۔ بس اپنے غیر قانونی دھندے میں مجھے مت الجھاؤ۔ تم جب چاہو بخوشی یہاں آؤ، لیکن غلیظ پیسے سے میں کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ میرا اصول

Scanned with CamScanner

ہے۔ اس ملک میں اب بھی ایسے لوگ ہیں جو اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ نایاب ضرور ہیں، لیکن ان کا وجود ہے۔ اور، خدا کا شکر ہے کہ یہ ملک انھیں کے دَم سے چل رہا ہے۔ سبھی مراکشی رشوت خور نہیں ہیں۔"

اس میں کیا کلام، اگرچہ رشوت خوری وبا کی طرح ہے، ایک 'متوازی اور زیرِ زمین معیشت' ہے، جیسا کہ ایک سابقہ متشدد اشتراکی کہا کرتا تھا، لیکن یہ سارے کے سارے مراکشیوں پر، بہرحال، اثر انداز نہیں ہوئی ہے۔

یہ موقع اس بیماری کی خوردہ گیری کرنے کا نہیں ہے جو خوب پھیلی ہوئی ہے اور بظاہر ان لوگوں کے گروہ کو فائدہ پہنچا رہی ہے جنھیں لاحق ہے۔

نجیہ برہم ہے۔ اگر میں سچ مچ رشوت خور ہی ہوتا، کوئی ایسا جس نے فطری طور پر اس عمل کو اپنی زندگی میں داخل کیا ہوتا، تو کوئی میرے اندر اچانک رونما ہونے والی تبدیلی کو نہ تاڑ پاتا۔ مجھے پتا چلتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میں تصدیق کرتا ہوں، کہ میں اس قسم کے دھندے کے لیے بالکل موزوں نہیں۔

میں نجیہ سے اس کا اعتراف کرتا ہوں، جو میری بات نہیں سنتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ سے بات کر رہا ہوں اور میں چاہے کچھ بھی کروں، دوبارہ اس کا اعتماد اور احترام حاصل نہیں کر سکتا۔

میں نادیہ کو فون کر سکتا ہوں۔ شاید اس کے ساتھ معاملہ قدرے آسان ثابت ہو۔ لیکن میں اس کے لیے کوئی جذبہ نہیں محسوس کرتا، سوائے واجبی سی جسمانی کشش کے۔ میں اس کے جسم کی فیاض گولائیوں کو یاد کرتا ہوں۔ فی الوقت میں اسے دھیان میں لاتا ہوں اور اس کی خواہش کو اپنے اندر چڑھتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اب معلوم نہیں کہ مجھے نجیہ کی خواہش ہے — جو، اس وقت جب میں نادیہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں، میرے سامنے کھڑی ہے — یا یہ محض خواہش ہے جس کا کوئی ہدف نہیں، بالکل جس طرح تنہائی میں اپنے کو سہلاتا ہوں۔

نجیہ کتابیں اور کچھ ذاتی چیزیں پلاسٹک کے تھیلے میں رکھتی ہے اور مجھے خدا حافظ کہتی ہے۔

میں رخصت ہوتا ہوں، اپنا غصہ دبائے ہوئے، نادیہ کے جسم میں اپنا ابھار اتارنے کے لیے بالکل تیار۔ وہ باتھ روب پہنے میری منتظر ہے۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر ہم بانہیں ایک دوسرے کے گرد

Scanned with CamScanner

حمائل کر دیتے ہیں اور بستر کی طرف بڑھتے ہیں۔ میں آنکھیں موند لیتا ہوں۔ اس کا پورا بدن تپ رہا ہے۔ چومتے ہوئے ہم اپنے کپڑے جدا کرتے ہیں۔ ہم برہنہ ہیں۔ میں اس کی جامد آنکھ کا سامنا کرنے سے کتراتا ہوں۔ مجھے اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس میں داخل ہو ہی رہا ہوتا ہوں کہ وہ مجھے نرمی سے پرے دھکیل دیتی ہے، اٹھتی ہے، اور ایک کنڈوم لا کر دیتی ہے۔ میری استادگی جاتی رہتی ہے۔ میں کنڈوم چڑھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن نہیں چڑھا پاتا۔ میں کنڈوم پہن کر جفتی کرنے کا عادی نہیں۔ وہ باتھ روب پہن لیتی ہے، ایک سگریٹ پیتی ہے، پھر آ کر میرے پہلو میں لیٹ جاتی ہے۔ وہ مجھے بار بار اور مختلف انداز سے سہلاتی ہے، تا آنکہ میرا عضو اس کی گداز اور مستحکم انگلیوں کے لمس سے پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے؛ وہ کنڈوم چڑھا دیتی ہے۔

صبح میں دفتر جاتے ہوئے گھر رکتا ہوں، کپڑے بدلتا ہوں۔ حلیمہ رو رہی ہے۔ کہتی ہے، دو آدمی کل رات آئے تھے۔ اسے پورا یقین ہے کہ وہ پولیس والے تھے۔

''اب کیا نئی مصیبت کھڑی کر لی ہے، بد بخت؟ نہ صرف یہ کہ تم اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر طوائفوں کے یہاں گھسے رہتے ہو، بلکہ اس پر یہ ستم اور کہ بچوں کی طرح دھر لیے جاتے ہو! تمھیں باقاعدہ پھانسا گیا ہے۔ چوٹی کا کام کر دکھایا! پہلی بار مرد بننے کی جرأت کرتے ہو، حقیقی مرد بننے کی، اور تمھارا پیدائشی انگھڑپن تمھاری ایسی تیسی کر دیتا ہے۔ اگر جیل جانا پڑے تو مجھ سے روٹی اور زیتون لانے کی توقع مت رکھنا۔ اپنی رنڈیوں سے کہنا کہ لا کر دیں، جن کی واہ واہ کرتے ہو۔ یہ لو، یہ خط چھوڑ گئے ہیں۔ ضرور طلبی کا پروانہ ہوگا۔ یقین نہیں آتا، اس ملک میں تھوڑی بہت رشوت ہر کوئی لیتا ہے اور پکڑا نہیں جاتا۔ لیکن سید مراد۔ سید پاکباز، سید اخلاق کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ پڑی برابر کمیشن لیں اور پولیس دوڑی دوڑی گھر چلی آئے۔ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو، صاف ظاہر ہے کہ تم نے کچھ پیسہ لیا ہے جو بہت زیادہ صاف نہیں تھا۔ یہ تمھاری پیشانی پر لکھا ہے۔ واہ ری شرم! واہ ری قسمت!''

میں نے اسے بولنے دیا۔ وہ دو آدمی پولیس والے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا خط رسمی وضع کا نہیں ہے۔ اس پر وزارتِ داخلہ کا سرنامہ نہیں۔ سفید کاغذ پر بس ہاتھ سے اتنا لکھا ہوا ہے، ''ہم دوبارہ آئیں گے!'' سو آیا کریں! میرے لیے خوف کی کوئی بات نہیں۔ ح ح نے لاکھوں کروڑوں سرقہ کیے

ہیں، اور اسے کبھی کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ ہمارے باس نے حال ہی میں دوملین کی عمارت خریدی ہے۔ اپنی تنخواہ پر تو کیا لے سکتا تھا! سچ ہے، اگر رشوت ستانی کے خلاف لڑنا ہی چاہتے ہیں تو پہل بڑی بڑی اسامیوں سے کرنی ہوگی، وہی جو دیکھتے دیکھتے ساہوکار بنتے جا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں لیکن ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ کوئی چیز انھیں خوفزدہ نہیں کرتی۔ کوئی چیز بھی۔ ان سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے، انھیں کوئی قلق نہیں ہوتا۔ مجھے چند ہزار درہم پر سزا دینے سے تو رہے۔ یا دیں گے؟ نہیں، وہ دو آدمی ح ح کے دوستوں میں سے ہوں گے۔ یہ کوئی نازک معاملہ ہوگا۔ دفتر میں بات کرنا دانشمندی نہیں، اسی لیے انھوں نے گھر آ کر مجھ سے ملنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے ٹھیک کیا، میں سمجھ سکتا ہوں۔

میں ٹیکسی میں دفتر پہنچتا ہوں۔ شاؤش ادب سے پیش آتا ہے لیکن مجھے ترس بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے، یوں جیسے میں سزائے موت پانے والوں کی قطار میں کھڑا ہوں۔ ح ح قدرے کم گرمجوشی سے استقبال کرتا ہے؛ اداسی سے میرے پاس آتا ہے، جیسے کوئی بری خبر سنانے والا ہو۔

''کل سہ پہر دو آدمی آئے تھے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا اور انھوں نے بتایا بھی نہیں کہ کون ہیں۔ وہ آج صبح دوبارہ آئیں گے۔ خدا کرے یہ کوئی غلط فہمی ہو۔ بہرکیف، کوئی گڑبڑ ہو تو مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ پھر بھی ہوشیار رہنا، کچھ بھی کرو مگر نام وام مت بتانا۔ اگر وہ تمھیں پکڑ لیں تو میں ایک اہم شخص سے بات کر سکتا ہوں جو ایک جج سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کیا کرنا چاہیے... اگر ضرورت آ پڑے تو چند ہزار درہم خرچ کرنے سے کام ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ، میں نے معلومات حاصل کر لی ہیں۔ حکومتی کارندہ ہونے کے باعث رشوت ستانی کی سزا میں تمھیں لگ بھگ تین سال کی جیل ہوگی۔ لیکن پہلے انھیں ثابت کرنا ہوگا کہ رشوت لی گئی۔ دو امکان ہیں: یا تو تم خود اعتراف کرو، یا وہ پھندا لگائیں اور تمھیں رنگے ہاتھوں جا پکڑیں۔ دوسرا مفروضہ خارج از امکان ہے۔ اب پہلا باقی رہا۔ تمھیں ہر چیز کا انکار کرنا ہوگا۔ بہرحال، تمھارا طرزِ زندگی، میری معلومات کی حد تک، رئیسانہ نہیں، سو تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تمھارے پاس تو کار تک نہیں... اطمینان رکھو، میں تمھارا ساتھی اور سچا دوست ہوں — امید ہے کہ تم مجھے دوست سمجھتے ہو — اور میں تمھاری استثنائی پاکیزگی کی، تمھارے اخلاقی احساس کی، اچھی کارکردگی، اور، صاف سیدھے طور پر، تمھاری دیانتداری کی

گواہی دے سکتا ہوں۔''

''تمھاری حمایت کا بہت بہت شکریہ،'' میں جواباً کہتا ہوں۔ ''اور جہاں تک دوستی کا تعلق ہے، یہ بڑی اور بیش قیمت چیز ہے۔ میرا بس ایک ہی دوست ہے اور وہ طنجہ میں رہتا ہے۔ لیکن اگر اسے پتا چلا کہ مجھ پر اس چیز کا شبہ کیا جا رہا ہے جسے 'لچکداری' کہا جاتا ہے، تو وہ اپنی دوستی سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ وہ پاکباز آدمی ہے۔ اس کے نزدیک یہ اس تعلق سے غداری کے مترادف ہوگا جس میں ہم منسلک ہیں۔ چونکہ تمھیں یقین ہے کہ مجھ پر نہ شک کیا جا رہا ہے اور نہ الزام لگایا جا رہا ہے، میں سکون کا سانس لے سکتا ہوں، یا کم از کم اس کی کوشش کر سکتا ہوں۔''

ح ح اپنی اخبار بینی میں غرق ہے۔ وہ سیاسی سکیورٹی کے سربراہ پولیس کمشنر کے معاملے کی پیش رفت کی بڑے شغف کے ساتھ خبر رکھتا ہے جس نے پانچ سو سے زائد عورتوں کے ساتھ جبری جفتی کی تھی۔ وہ برہمی سے بکواس کیے جاتا ہے اور اپنے غیظ و غضب کو لگام نہیں دے پاتا۔

''سزائے موت سنائی گئی ہے... بس؟ لیکن پورا حساب بے باق کرنا چاہیے، عذاب اٹھائے۔ اسے تو پاگل کر دینا چاہیے۔ موت تو صرف ایک ہمیشہ کی نیند ہے۔ وہ اس سے بدتر کا مستحق ہے۔''

اُس رات میں وہی خواب سوویں بار دیکھتا ہوں: میں خاصی بلند ٹیرس پر ہوں۔ باقی سب لوگ اترنے کے لیے بیرونی سیڑھی استعمال کر رہے ہیں۔ میرے والد، میرا بھائی، پڑوسی۔ مارے خوف کے میرا خون جم گیا ہے۔ جب سیڑھی کے پاس پہنچتا ہوں تو مجھے کامل یقین ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ اسے کھینچ لے گا۔ اس لیے میں انتظار کرتا ہوں۔ خواب تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے پیشاب کرنے کی حاجت مجھے بیدار کر دیتی ہے، ورنہ صبح تک مجھے اسی حالت میں رہنا پڑتا۔

ح ح نہ صرف چین کی نیند سوتا ہے، بلکہ ممکن ہے اس کو سرے سے کبھی ڈراؤنے خواب ہی نہ آتے ہوں۔ وہ اغادیر میں اپنے یاروں کے ساتھ ویک اینڈ منانے کا ذکر کرتا ہے، جہاں یارانِ طریقت تاش کھیلنے اور رات دلکش لڑکیوں کے ساتھ گزارنے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے گذشتہ دورے کی تصویریں دکھاتا ہے، جنھیں دفتر میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کی بیوی اسے کبھی لینے نہیں آتی، نہ کبھی فون

Scanned with CamScanner

وون کرتی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی سب سے بڑی لڑکی اس سے ملنے آتی ہے۔ مجسمہ سازی کا حسین نمونہ۔ وہ لڑکی کے بارے میں فکر مند ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے تو ح ح کھڑکی کے پاس یہ اطمینان کرنے کے لیے جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی مرد تو نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہے۔ میں اسے چھیڑنے کے لیے کہتا ہوں، ''ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اسکول بھی ختم نہیں کیا۔'' اپنی سی حالت کے بہت سے دوسرے باپوں کی طرح، وہ سیدھا اصل بات پر آ جاتا ہے: ''میں اس کی عفت کی نگہبانی کا ذمے دار ہوں۔ اتنی خوبصورت لڑکی دنیا جہان کی پیچیدگیوں، پریشانیوں اور اندیشوں کا بوجھ ہوتی ہے۔ اس ملک میں مرد نوخیز لڑکیوں کی معصومیت اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ کبھی ہائی اسکول چھوٹنے پر جا کر دیکھو۔ طلبا سے زیادہ مرسیڈیز کاریں نظر آئیں گی۔ اور لڑکیاں ان میں جا گھستی ہیں! یہی سارا المیہ ہے۔ وہ ایسے مردوں کے ساتھ جا گھستی ہیں جو ان کے باپ کی عمر کے ہوتے ہیں... یہ مجھے قبول نہیں۔ میری لڑکی بڑی متین ہے، یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن میں اس کی سہیلیوں کو نہیں جانتا۔ سارا قلق اسی کا ہے۔''

وہ بتدریج ہیجان میں آ گیا ہے۔ لیکن، عجیب بات ہے، وہ کسی ایسے شخص کے قالب میں خود کو نہیں دیکھتا جسے نوخیز لڑکیوں کی معصومیت اور سادہ لوحی سے 'فائدہ اٹھانے میں' کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی!

میں اس کی بات دہرا کر اسے ٹھنڈا کرتا ہوں کہ اس کی لڑکی بہت متین ہے۔ لیکن حقیقت میں مجھے اپنے کہے پر یقین نہیں۔ جس طرح باپ کے دوسری طرف مڑنے پر اس نے مجھے دیکھا تھا اس سے اس کی مفروضہ سادہ لوحی کی بابت بہت کچھ پوری طرح واضح ہو گیا تھا۔ وہ اسے الو بنا رہی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ایک سے زائد عاشق ہیں اور وہ ابا کی ننھی منی بٹیا ہونے کا ناٹک رچاتی ہے۔ اول آخر کسی وجیہہ وشکیل مالدار لڑکے سے شادی کر لے گی۔ یہ ایک رومانی ناول کی طرح ہے۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ مجھے اس کے بیگ سے باہر کو نکلی ہوئی کتاب ہم دونوں نظر آئی تھی۔ وہ متلوّن مزاج لڑکی نظر آتی ہے جو صرف عیش وعشرت اور آسائش کی متوالی ہے۔ ح ح کی فکر مندی جائز ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس سے مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔ ہر شخص کی اپنی پریشانیاں ہیں۔ فی الوقت میری پریشانیاں اکٹھی ہوتی جا رہی ہیں۔ اول تو یہی کہ مجھے معلوم نہیں کہ جو دو آدمی میری تلاش میں

تھے وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ اگر پولیس والے تھے تو حاضری کا پروانہ چھوڑ گئے ہوتے۔ نیلے رنگ کا کاغذ۔ بہت زمانہ پہلے، جب اپارٹمنٹ کا مالک ہمیں نکالنا چاہتا تھا، ایسا کاغذ ایک بار ملا تھا۔ میں کرایہ باقاعدگی سے وقت پر ادا کرتا تھا لیکن اس نے اس کے برعکس دعویٰ کیا تھا۔ میں ہمیشہ رقم نقد دیتا تھا اور وہ رسید ہضم کر جاتا تھا۔ اس واردات سے مجھے معلوم ہوا کہ لوگ کتنے بدنیت اور آزار بخش ہوتے ہیں۔ میں نے اس پر بھروسا کیا اور وہ میری پیٹھ پیچھے کچھ اور کھچڑی پکا رہا تھا۔ اس نے ایک جج کو رشوت دی کہ اس کا مقدمہ اوروں کے آگے کر دے۔ جج نے پولیس والوں کو حکم بھیجا، جنھوں نے مجھے طلب کر لیا۔ خوش قسمتی سے میں نے درجن بھر گواہ جمع کر لیے تھے، سو مقدمہ برخاست کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے میں چیک سے ادائیگی کرتا ہوں اور اس سے رسید لیتا ہوں۔

چنانچہ یہ پولیس نہیں ہوگی۔ ریاستی وکیل کا قائم کیا ہوا انسدادِ رشوت کا دستہ ہو تو ہو۔ لیکن اس نے تو اپنے فرائض کبھی سنبھالے ہی نہیں تھے۔ اگر کبھی یہ دستہ جوش و خروش سے کام شروع کر دے تو، میری قسمت کو دیکھتے ہوئے، بسم اللہ مجھی سے ہوگی۔

مجھے کریمہ کا خیال آتا ہے، اس کے مستقبل کا۔ ابھی تک تو مجھے اس کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میرے اچانک غائب ہو جانے، ہیجان میں آ کر پھٹ پڑنے، خاص طور پر میری اعصاب زدگی سے اسے تشویش تو ضرور ہوئی ہوگی، لیکن وہ کچھ کہتی نہیں۔ خیر، میں عہد کرتا ہوں کہ آج شام سیدھا گھر جاؤں گا اور اس کے ساتھ وقت گزاروں گا۔

ڈائریکٹر ہم لوگوں کو میٹنگ کے لیے بلاتا ہے۔ ح ح اپنی ٹائی درست کرتا ہے، بالوں میں کنگھا پھیرتا ہے، اور اپنا بریف کیس اٹھا لیتا ہے۔

"پہلے آپ، باس!"

میں اس کے آگے آگے چلنے لگتا ہوں؛ وہ قریب آ کر میرے کان میں دھیمے سے کہتا ہے:

"مجھے شبہ ہے کہ ڈائریکٹر میری لڑکی کی تاک میں ہے۔ اس کے اسکول کے صدر دروازے کے سامنے ایک دن اس کی مرسیڈیز دکھائی دی تھی۔ پکا عورت باز ہے، اور اس کا کلیہ ہے کہ بیس برس سے کم ہو۔"

جب ہم پہنچتے ہیں، ح ح ڈائریکٹر کو بڑے احترام سے سلام کرتا ہے؛ ہم آنے والوں میں سب سے پہلے ہیں؛ وہ ہم سے بچوں کی خیر و عافیت پوچھتا ہے اور ح ح معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔ ڈائریکٹر مجھ سے میری لڑکی کی عمر پوچھتا ہے۔

''تیرہ سال، ڈائریکٹر صاحب۔''

''خدا اسے برکت دے اور شر سے محفوظ رکھے... ہم اخلاقی اعتبار سے برے زمانے میں زندہ ہیں۔ بہتر ہے کہ نرینہ اولاد ہی ہو۔ سولہ سے بیس کی درمیانی عمر کی بیٹیوں کا باپ بننے میں مجھے تامل ہے۔ میری سب بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ اب تو خیر سے میں نانا ہوں۔ مجھے اب ان کی عصمت کے بارے میں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ان کے شوہروں کا جھنجھٹ ہے۔''

ایک معمول کی میٹنگ تھی۔ کوئی خاص بات نہیں۔ لگی بندھی۔ ڈائریکٹر ان منصوبوں کا جائزہ لیتا ہے جو ہمیں پیش کیے گئے تھے، جو بولیاں لگی تھیں ان کی جانچ پڑتال کرتا ہے، اور بعد میں، حسبِ معمول، ہمیں اخلاقیات پر اپنا مختصر سا لیکچر دیتا ہے۔ اس دوران میرا ذہن دوسری طرف بھٹک نکلتا ہے۔ میں اس کی بات ایک کان سے سنتا ہوں اور خود کو ایک شاندار دن سپنے میں غرق کر لیتا ہوں۔ اس بار میں زیادہ دور تک نہیں جاتا۔ میں اسکول میں اپنی بیٹی کے ساتھ ہو جاتا ہوں، اس کے برابر ایک ہی سیٹ پر بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ وہ زندہ دل، ذہین، توجہ دینے والی، اور ہر چیز کے بارے میں متجسس ہے۔ وہ گھر کے مقابلے میں اپنی جماعت سے زیادہ ہم آہنگ اور مانوس نظر آتی ہے۔ میں اپنے سے کہتا ہوں کہ سب والدین کو چاہیے کہ خود نظر آئے بغیر اپنے بچوں کا مشاہدہ کیا کریں۔ شاید میرا تخیل میری طبیعت کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ اور کیوں نہیں؟ اے کاش میں کسی گوریا کی طرح کسی شاخ پر بیٹھ کر اسی طرح نجیہ کا اس کے اسکول میں یا گھر کی تنہائی میں مشاہدہ کر سکوں! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں اس کے لیے جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہ چاہت ہے یا زندگی کے ایک کٹھن وقت میں محسوس ہونے والی سیدھی سیدھی جسمانی کشش۔ میں اس کے ساتھ میاں بیوی والی زندگی بسر کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی زندگی کے لیے میں کبھی تیار نہیں تھا۔ میری شادی ریت نبھانے کے لیے تھی، محبت کی خاطر نہیں۔ میں حلیمہ کو چاہتا تھا، لیکن جیسے ہی اس کی ماں سے میرا

Scanned with CamScanner

سامنا ہوا، میں سمجھ گیا کہ یہ عورت ہماری زندگی میں ٹانگ اَڑائے بغیر نہیں رہے گی اور ہماری محبت کا خاتمہ کردے گی۔ اپنے شوہر اور اپنے قبیلے والوں کے درمیان، حلیمہ نے ہمیشہ اپنی ماں کے کنبے کو فوقیت دی ہے۔ محبت کے جذبات آہستہ آہستہ ماند پڑتے گئے۔ ہمارے درمیان اب کچھ بچ رہا ہے تو وہ صرف عادت کے غلاف تلے دھیما سا تنفر ہے اور افسردہ دلی۔ اب مجھے بس اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ہے۔ خود میری زندگی تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ مجھ میں اب مزاحمت کی طاقت نہیں رہی۔ شاید مجھے نجیہ سے مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے تو اس آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے اپنی مدافعت کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے اپنے حالیہ افعال کی صحت کا یقین نہیں ہے، ان پر کوئی فخر نہیں ہے۔ میں دباؤ میں آگیا اور نہیں جانتا کہ کیا عمل کرنا چاہیے، کیا طور طریق اپنانا چاہیے۔ خیال پھر ان دو آدمیوں کی طرف چلا جاتا ہے جو میری تلاش میں تھے۔ میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ وہ مجھے ہاتھ لگائیں۔ تاہم جانتا ہوں کہ پولیس تھانے کے دروازے سے گزرتے ہی آدمی کے سارے حقوق سلب ہوجاتے ہیں۔ ٹھیک ہے، قوانین کا وجود ہے، لیکن یہ وجود نظری ہی ہوتا ہے۔ پولیس والوں کی ذہنیت نہیں بدلی ہے۔ پہلے آدمی کی ٹھکائی کرتے ہیں، پھر بات اگلواتے ہیں۔ یہ عام دستور ہے۔ میں عام واقعات کی بات کررہا ہوں، سیاسی واقعات کی نہیں۔ انسانی حقوق کی مختلف تنظیمیں 'تحویل' کی مدت اڑتالیس گھنٹوں تک گھٹوانے میں تو کامیاب ہوگئی ہیں، لیکن وہ پولیس کی ذہنیت کب بدلیں گی؟

یکبارگی میں اپنے سے سوال کرتا ہوں: کیا رشوت ستانی عام قانونِ تعزیرات کی حکم عدولی ہے یا سیاسی جرم؟ کیا ایک عرضی کو دوسری پر رعایت دینے کے لیے رشوت لینا سیاسی معاملہ ہے؟ اس کا انحصار عرضی کی نوعیت پر ہے۔

اب میں ڈرنے لگا ہوں۔ پیٹ میں گرہیں پڑنے کا احساس ہورہا ہے، اور میرا خون ایک لمحے تیزی سے دوڑنے لگتا ہے اور دوسرے لمحے بڑی سست رفتاری سے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے ہیں۔ میں اپنی بھنویں پونچھتا ہوں۔ ڈائریکٹر مجھے تک رہا ہے اور پوچھتا ہے، میری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میں اسے اطمینان دلاتا ہوں کہ ٹھیک ہوں۔ گرمی محسوس ہورہی ہے۔ جب آدمی کو اندیشہ ہو تو گرمی لگنے لگتی ہے۔ میں کبھی بہت دلیر نہیں رہا ہوں۔ یہ والد کی وجہ سے ہے۔ وہ مجھ

Scanned with CamScanner

سے کہا کرتے تھے، ''جو ڈرتے ہیں وہ بخشے جاتے ہیں!'' پھر یہ حدیث نقل کرتے تھے کہ 'میانہ روی سب سے بہتر ہے۔' وہ انتہا پسندی سے گریز کرتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ زندگی تحفے تحائف نہیں پیش کرتی۔ اس لیے وہ شکایتوں کے طومار نہیں باندھتے تھے۔ سچ پوچھیں تو ان کی ایمانداری کی وجہ جرأت اور جسارت کی کمی تھی۔ میں انھیں پر گیا ہوں: اب تک رشوت نہ لینے کی وجہ پکڑے جانے کا خوف تھا۔ پھر آدمی اپنے ضمیر سے مفاہمت کر کے کہتا ہے کہ وہ سچ مچ راست باز ہے، اصولوں اور قوانین اور خوبیوں کو ترقی دے رہا ہے۔

دفتر لوٹنے پر شاؤش ہمارے لیے چائے لاتا ہے۔ میرا پہلا گھونٹ گلے کی غلط نالی میں چلا جاتا ہے اور دَم تقریباً گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ یہ اعصاب زدگی کی علامت ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے بازی کرتے ہیں، چوری کرتے ہیں، اس کے باوجود شاندار صحت کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ ح ح صلاح دیتا ہے کہ ایک دن کی بیماری کی رخصت لے لوں۔ لیکن میں ڈاکٹر کو نہیں دکھلاؤں گا، کیونکہ میری طبیعت کی ناسازی خوف اور ضمیر کی خلش کے باعث ہے۔ کیا نہیں؟ سوائے اس کے کہ کسی نفسیاتی معالج کے پاس جاؤں جو میری بات سن سکے گا اور میرے علاج کی نزاکتوں سے واقف ہوگا۔ میں اپنی چیزیں سمیٹتا ہوں اور، بالآخر، ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ کرتا ہوں، جو ح ح کا دوست ہے۔ وہ ساتھ تاش کھیلتے ہیں؛ یقیناً وہ اس 'خوف کے مرض'' (fear syndrome) کو پہچانتا ہوگا، 'مبتدی رشوت خور کا خوف۔' شاید اس مرحلے کو طے کرنا ضروری ہے، اس سے پہلے کہ آدمی اپنی ذات کو اذیّت پہنچانے لگے، اس کی تحقیر کرے، اور ہولناک عواقب کا تصور کرنے لگے۔

ڈاکٹر کی تشخیص ہے کہ میں بہت زیادہ جذباتی اور خجالت مند ہوں۔ استعمال کے لیے سکون آور گولیاں دیتا ہے۔ میں راحت سے سوتا ہوں، لیکن صبح اٹھنے پر خود کو تھکا تھکا محسوس کرتا ہوں۔ باقی رہی خجالت، تو یہ اِدھر کچھ عرصے سے میرے خلاف کام کر رہی ہے، یہاں تک کہ مجھے جتنا ہوں اس سے بھی زیادہ ادنیٰ بنائے دے رہی ہے۔ یہ مجھے پچھاڑتی ہے اور روندتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک لعنت ہے جو ستانے کے لیے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ مدرسے میں جب کبھی استاد میری

Scanned with CamScanner

طرف دیکھتا تھا تو میں شرم سے سرخ پڑ جاتا تھا۔ بیس سال کی عمر تک میں لوگوں سے اس لیے ہاتھ ملانے سے گریز کرتا رہا کہ میرے ہاتھ ہمیشہ پسیجے رہتے تھے۔ جب میرے یہاں پہلی ولادت ہوئی، تب مجھ میں تھوڑی سی خوداعتمادی پیدا ہوئی اور اس مرض پر تھوڑا سا قابو پاسکا۔ لیکن کوئی نازک موقع آجائے تو مرض میں دگنی شدت آجاتی ہے۔

اگر پولیس کی طلبی ہو تو مجھے کیسا لباس پہن کر جانا چاہیے؟ میرے پاس دو سوٹ اور پانچ قمیصیں ہیں۔ اگر گہرا نیلا سوٹ پہنتا ہوں، تو بے چارے مسکین پولیس والے سمجھیں گے کہ ان کی تحقیر کر رہا ہوں۔ اگر بری تراش خراش میں جاتا ہوں، تو معلوم ہوگا کہ میں قصداً افسر شاہی کے کسی کم رتبہ عہدیدار کا روپ دھارن کر رہا ہوں جو اپنی حقیری تنخواہ پر قانع ہے۔

یہ اہم ہے کہ آدمی کیسا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں، مراکش میں، فقیہ اپنے جبے سے پہچانا جاتا ہے! شاید ہمیشہ نہیں۔ خیر، کچھ بھی سہی، یہاں لوگ فطری رنگ ڈھنگ یا سادگی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر ایسے لوگ دیکھنے ہیں جو ہنوز سادہ زندگی سے چپکے ہوئے ہیں تو دیہاتی علاقوں میں جانا ہوگا۔ غریب، لیکن دونوں ہاتھوں سے آؤ بھگت کرنے والے اور کریم لوگ۔ شہری لوگ جتنے زیادہ رئیس ہوتے ہیں، اتنے ہی زیادہ کائیاں۔ میری ساس کی آنکھوں کے پیچھے حساب شمار کی مشین لگی ہوئی ہے۔

یہ عجیب بات ہے۔ کان کے پیچھے جو دھبا تھا، وہ پھیل گیا ہے۔ میں اسے چھو کر دیکھتا ہوں لیکن محسوس کچھ نہیں ہوتا۔ میں دوسرے کان کا معائنہ کرتا ہوں۔ وہاں بھی ایک دھبا نکل آیا ہے۔ ہو نہ ہو، میرے جگر کا معاملہ ہے۔ عورتوں کے ایک رسالے میں پڑھا تھا کہ اس قسم کا دھبا جگر کے اضمحلال کی علامت ہے۔ میرا جگر کیوں مضمحل ہونے لگا؟ میں الکحل تقریباً پیتا ہی نہیں، چاکلیٹ سے کوئی رغبت نہیں، اور کھانے پینے کے معاملے میں کافی محتاط ہوں۔ لیکن ان سب کی کوئی اہمیت نہیں۔ محتاط لوگ اپنے لیے مشکلوں کو دعوت دیتے ہیں؛ بےفکرے اکثر صحت مند رہتے ہیں۔ انھیں کچھ نہیں ہوتا۔ مشکلیں ان سے کنّی کاٹ جاتی ہیں؛ انھیں اتنی بے اطمینانی ہی نہیں ملتی کہ نشوونما پاسکیں۔

بہتر ہے کہ کسی جگر کے ماہر سے مشورہ کروں۔ لیکن اس کے لیے بھی سفارش کا ہونا ضروری ہے۔ اس خیال ہی سے مجھے اپنے دائیں پہلو میں درد محسوس ہونے لگتا ہے جہاں میرا جگر واقع ہے۔

Scanned with CamScanner

نہیں، میں بیمار و بیمار نہیں ہوں۔ یہ بس تشویش کا نتیجہ ہے۔ اس سے جلد پر داغ دھبے نکل آتے ہیں۔
میری جلد ایسے سفید دھبوں سے بھری ہے: ان کے جلد پر ابھر آنے کا سبب غلیظ پیسہ ہے۔ میں ابرص
(albino) بن جاؤں گا۔ اس صورت میں پولیس کو مجھ سے سوال جواب کرنے کی حاجت نہیں رہے
گی: بس میرے برہنہ کیے جانے کی دیر ہے، وہ دیکھ لیں گے کہ میرے خون تک کو رشوت سے الرجی
ہے۔ یہ بہت منطقی بات نہیں۔ اگر ہوتی تو ابرصوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ ملک کو، بلکہ پورے خطے
کو اپنا نام بدلنا پڑ جاتا! میں سڑک پر لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، اپنے ہی جیسے کسی کشتہ کی تلاش میں۔ میرا
جی چاہتا ہے کہ ح ح سے اپنی قمیص اتارنے کے لیے کہوں۔ بالکل قدرتی بات ہے کہ اس کا پورا جسم
اس قسم کے داغ دھبوں سے اٹا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ انھیں میک اَپ کے نیچے چھپائے ہوئے ہو۔ وہ
نقاب نہیں اوڑھے ہوتا؟ اپنے چہرے پر غازہ نہیں لگاتا؟ میں قریب آ کر اس کا معائنہ کرنے کی
جرأت نہیں کرتا۔ میں اس سے اس افتاد کا ذکر کرتا ہوں۔ اسپورٹس کے صفحے پر سے نظریں اٹھائے بغیر
کہتا ہے کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے، بعد میں جسم اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ ''ہم سب اس
حالت سے گزرتے ہیں۔ یہ معمول کی بات ہے۔ زندگی کے بدلنے کی نشانی ہے۔ ہم ایک حالت سے
گزر کر دوسری میں جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق اضطراب سے ہے۔ خون پرانی رفتار
سے نہیں دوڑتا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم دیکھو گے، یہ رخصت ہو جائے گا، تم اس کے عادی
ہو جاؤ گے۔ بس شمپین سے پرہیز کرو اور لابسٹر نہ کھایا کرو!'' اس میں کیا شک ہے کہ وہ مجھے
بے وقوف سمجھتا ہے۔ میں لابسٹر کھانے سے مستغنی ہوں، اس لیے کہ کبھی کھایا ہی نہیں۔ مجھے اس کی کمی
کیسے محسوس ہوسکتی ہے؟ میں تو شراب بھی کہاں پیتا ہوں؟ بس کبھی کبھار فرانسیسی شراب کا ایک جام، یا
بہت ہوا تو برف پڑی وسکی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ وہ مجھے سگریٹ پینے سے منع کر دے گا۔ میری واحد
عیاشی: پھیپھڑوں کو نکوٹین اور ٹار سے بھرنا مستزاد۔ یہ میری ذات کا شعوری طور پر تباہ کن پہلو ہے۔
خیر، مجھے تمباکو نوشی سے اجتناب کرنا چاہیے، کریمہ کی گداز اور شیریں درخواست کی خاطر، جو اس نے
میرے کان میں کی تھی، ''یہ ہم دونوں کا راز ہے۔ اگر مجھ سے پیار کرتے ہیں تو سگریٹ پینا چھوڑ
دیں۔ صبح آپ کو کھانستے ہوئے سنتی ہوں تو بڑا دل دکھتا ہے۔ آپ اپنی بیٹی کا دل نہیں دکھانا چاہتے، یا
چاہتے ہیں؟''

Scanned with CamScanner

حلیمہ کی پیہم خاموشیاں اور ظاہرا لاتعلقی مجھے قلق پہنچاتی ہے۔ مجھے گمان تھا کہ آخر میں ہماری محبت دوستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ افسوس، یہ آہستہ آہستہ بجھ گئی ہے، بنا سلجھے ہوئے، اور اس کی جگہ کشیدہ خاطری نے لے لی ہے۔ بچوں کی وجہ سے مجھے بہت کچھ قبول کرنا پڑا ہے۔ لیکن اب ہم دونوں کے ساتھ رہنے کے کوئی معنی نہیں۔

جب کھانستا ہوں تو میری بیٹی کو دکھ ہوتا ہے۔ اگر کل مجھے جیل میں ڈال دیا گیا تو وہ کیا محسوس کرے گی؟ مگر میں جیل کیوں جانے لگا؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو دوسروں کے کیے سے زیادہ برا ہو؟ میں نے تو ابھی قانون شکنی کی ابتدا ہی کی ہے، اور حال یہ ہے کہ ابھی سے چار مرطوب دیواروں میں خود کو محبوس دیکھ رہا ہوں۔ مجھے خیال آرائی کا شغف کچھ زیادہ ہی ہے۔ مجھے فلموں کے لیے کام کرنا چاہیے تھا؛ اچھا منظر نگار بنتا۔ فی الحال تو میرے فراواں تخیل کا واحد شکار خود میری زندگی ہے۔ میں ہمیشہ ہی واقعات پر سبقت لے جاتا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں غیب بیں ہوں، لیکن، جیسا کہ والد کہا کرتے تھے، مجھے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ان کے نتائج نظر آجاتے ہیں۔ اسے قلق کہتے ہیں۔

اچھا تو میں نے یہ کیوں نہیں دیکھ لیا تھا کہ میرے مسوڑھے سڑنے لگیں گے؟ ایک مدت سے ان سے خون رِس رہا ہے۔ مجھے اس بات سے زیادہ خوفزدہ ہونا چاہیے تھا۔ میری بینائی ہنوز اچھی ہے۔ اگر کل کلاں کو میرا شبکیہ (retina) الگ ہو جائے، تو یہ ایک اتفاقی امر ہوگا۔ ان سفید داغ دھبوں سے کیا پیش گوئی کر سکتا ہوں؟ غالباً ان کی وجہ نفسیاتی ہے، یہ جسمانی تو نہیں ہو سکتی۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ اگرچہ... طبیعت زیادہ اچھی نہیں محسوس ہوتی۔ مجھے خیالی گھوڑے دوڑانا بند کرنا ہوگا۔ یہ واحد چارہ ہے۔ میں کاغذ سے متنفر ہو گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے سفید دھبے کاغذ کی وجہ سے ہوں۔

ح ح سخت برہمی کے عالم میں دفتر پہنچتا ہے۔

معائنہ کرنے والوں کی ایک ٹولی نے آج سہ پہر آنے کا اعلان کیا ہے۔ وہ برافروختہ ہے تو اس لیے کہ ان میں کے کسی فرد سے واقف نہیں۔ کون جانے؟ اگر انھیں رشوت دی بھی جا سکے تو بھی ضابطے ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔ ہر چیز کہی نہیں جا سکتی۔ وہ کس بات سے ڈر رہا ہے؟ رشوتیں اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑ جاتیں۔ ایک لفافہ ہاتھ بدل لیتا ہے، بس۔ کوئی گواہ نہیں، کوئی تحریر

نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ بالکل بے عیب کارروائی ہے۔ اسی لیے تو اسے سیّال مال کہا جاتا ہے۔ یہ گردش کرتی ہے، بہتی ہے، نوٹ ایک جیب سے دوسری میں چلے جاتے ہیں، اور ابھی تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے جو ان کی اصل کا سراغ لگا سکے۔ کیا آپ لیزر مشین کے سامنے سے سرپٹ دوڑتے ہوئے کسی سودر ہم کی مالیت کے نوٹ کا تصور کر سکتے ہیں جو ان تمام لوگوں کے نام اجاگر کر سکے جنھوں نے اسے چھوا ہو؟... لیکن اس سے ثابت کیا ہوگا؟ بنیادی طور پر، مشین کو اس سے زیادہ کرنا چاہیے۔ بہرحال، ابھی تک تو ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ اور اگر اس کا وجود بھی ہوتا، تو مافیا نے اس کے پرخچے اڑا دیے ہوتے۔

ح ح مضطرب ہے اور میں نہیں۔ عام طور پر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میرا معاملہ ٹھوس ہے اور مجھے کسی بات پر خود کو مجرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ لے دے کر وہ مجھ سے اس پرانے ٹائپ رائٹر کی باز پرس کر سکتے ہیں جسے کوئی استعمال نہیں کر رہا تھا۔ جب اس کی جگہ برقی ٹائپ رائٹر آ گیا تو میں پرانے والے کو چند دنوں کے لیے عاریتاً گھر لے گیا تھا۔ میرے لڑکے نے اس پر اپنے اسکول کا کام کیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے بعد سے میں نے اسے اپنے گھر ہی پڑا رہنے دیا۔ کبھی کبھار کریمہ استعمال کر لیتی ہے: اس نے آپ ہی آپ ٹائپ کرنا سیکھ لیا تھا۔ اگر وہ اس کی ڈھنڈائی کرتے ہیں، میں واپس لے آؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ چند دنوں کے لیے مستعار لے گیا تھا۔ بس یہی ایک چیز غیر موجود ہے۔ فائلیں ترتیب سے ہیں۔ دفتر منظم اور صاف ستھرا ہے۔ ہماری سیکرٹری ابھی تک علالت کی رخصت پر ہے۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ح ح کی گھٹی میں بالا بالا 'سودے طے کرنا' پڑا ہوا ہے، اس سے پہلے کہ اس کے لیے اس سے رجوع کیا جائے۔ بہت سے لوگ اسی کی طرح ہیں۔ وہ ابتدا ایسے آدمی کی تلاش سے کرتے ہیں جس کی طرف لفافہ، چاہے موٹا تازہ یا دبلا پتلا، سرکایا جا سکے، حالانکہ وہ اپنے انتہائی بنیادی حقوق کی حدود میں ہوتے ہیں۔ آدمی ایسی وبا سے کیسے زور آزمائی کر سکتا ہے؟ کیسے اس کی مزاحمت کر سکتا ہے؟

سب سے پہلے شاوش داخل ہو کر اطلاع دیتا ہے، ''کمیشن کے اصحاب۔'' یہ تین آدمی ہیں۔ تینوں مونچھ والے ہیں، جو شاید اپنے ہیرو صدام کے احترام میں رکھی ہیں۔ ان کے منھ کھولنے سے

پہلے ہی میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ وہ اس کے حمایتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس وقت ہوا تو میں انھیں اس چھوٹے سے قصبے ہلبجہ کے بارے میں بتاؤں گا جس پر صدام کی فوج نے زہریلی گیس چھوڑی تھی۔ لیکن یہ سیاست پر بات کرنے کا محل نہیں۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ مجھے پریشانی میں ڈالنے والی کسی چیز کی تلاش کا موقع انھیں دوں۔ ان کا سربراہ چھوٹا سا گول مٹول آدمی ہے، سرمئی سوٹ، نیلا سویٹر، ہلکے بھورے رنگ کی قمیص، اور نیلی اور سرخ دھاری دار ٹائی لگائے ہوئے ہے۔ گنجا ہے لیکن گنے چنے باقی ماندہ بال چندیا سے چپکے ہیں، گویا اس نے انھیں وہاں گوند سے لگا دیا ہو۔ دوسرے دو رکن عام سے ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات نہیں جس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ دونوں میں جو دراز قامت، سب سے بدلباس ہے، دانتوں سے ناخن کترتا ہے۔ ایک موقعے پر میں اسے ناک میں انگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں۔ وہ جلدی سے اسے کھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے۔ ناک میں انگلی ڈالنے اور کان کریدنے والے رنگے ہاتھوں پکڑا جانا پسند نہیں کرتے۔ بالکل قدرتی بات ہے: انھیں معلوم ہے کہ یہ ایک کراہت آمیز فعل ہے۔ میں دیکھنے پر تلا نہیں بیٹھا ہوں۔ امید ہے کہ وہ انتقام نہیں لے گا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی گندی عادتوں کے مالک ہمیشہ ستھرے لوگ نہیں ہوتے، نہ اخلاقی اعتبار سے، نہ جسمانی اعتبار سے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ اپنی ناک سِنک رہا ہے، جیسے اپنی گزشتہ حرکات کو برحق ثابت کر رہا ہو۔ خیر، میری بلا سے۔ یقیناً وہ یہ سوچ رہا ہوگا کہ میں بھی اسی کی طرح نک رِسا ہوں۔ وہ سیکرٹری کی ڈیسک کے پاس آتا ہے، اور جتاتا ہے کہ کاربن پیپر کی زیادتی ہے۔

''ہم خرچ بچانے کی کوشش کر رہے ہیں،'' میں کہتا ہوں۔ ''ہم اب رِبن نہیں خریدتے۔ بڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ مشین کاربن پیپر پر براہ راست چھاپتی ہے، اس طرح ہم فوٹو کاپیوں کی لاگت بھی بچا لیتے ہیں۔''

''یہ بڑی کم بچت ہے،'' وہ کہتا ہے۔

وہ ح ح کی میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک فائلوں کی ایک ایک تھپی اٹھا لیتا ہے اور ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔ گاہے گاہے ایک یا دوسرا رک جاتا ہے اور باس کے کان میں چپکے سے کچھ بڑبڑا دیتا ہے اور کام جاری رکھتا ہے۔ ح ح اور میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ وہ میرے مقابلے میں زیادہ مضطرب نظر آ رہا ہے۔ اچانک باس کھڑا ہو کر کسی چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں

Scanned with CamScanner

دوڑانے لگتا ہے۔ ح ح مدد کی پیشکش کرتا ہے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر میرے طرف آتا ہے۔

''کچھ سامان نظر نہیں آ رہا۔ فہرست میں چوبی کوٹ ریک، کیلکولیٹر، اولیوتی (Olivetti) کمپنی کا دستی ٹائپ رائٹر شامل ہیں... یہ سب غائب ہیں۔''

میں وضاحتاً کہتا ہوں کہ ٹائپ رائٹر بدلا گیا ہے۔

''اور پرانا والا؟ کیا وہ تم نے بیچ ڈالا؟''

''نہیں صاحب۔ پرانے والا زنگ آلود ہو گیا تھا۔ میں مرمت کرنے گھر لے گیا۔ میں چیزوں کی تھوڑی بہت مرمت کرنا جانتا ہوں۔ کوٹ ریک ہم نے راہداری میں رکھ دی ہے۔ یہاں بہت زیادہ جگہ گھیرے ہوئے تھی۔''

''اور کیلکولیٹر؟''

''یہیں ہے، حاج حمید کے ڈیسک کی دائیں ہاتھ والی دراز میں۔ اب زیادہ استعمال نہیں ہوتا۔ میں نے ایک چھوٹا سا بیٹری سے چلنے والا کیلکولیٹر اپنے پیسوں سے خرید لیا ہے۔ میں وہی استعمال کرتا ہوں۔''

ح ح مسکراتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قابلِ گرفت چیز ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، پھر ہم سے کوئی اچھا ریستوران تجویز کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ ح ح کہتا ہے، ریستوران کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا: اس کے گھر چلیں اور طعام کریں۔ میں کبھی انھیں اپنے گھر لے جانے کی جرأت نہ کر سکتا۔ یہ رشوت کی صورتوں میں سے ادنیٰ ترین ہے۔ وہ ح ح کے اصرار کے بغیر ہی قبول کر لیتے ہیں، جیسے اس کی توقع کر رہے ہوں۔

ہم ح ح کی مرسیڈیز میں سوار ہو جاتے ہیں۔ باس پوچھتا ہے کہ میرے پاس کس قسم کی کار ہے۔ میں لمحہ بھر سوچتا ہوں۔ کیا یہ پھانسنے والا سوال ہے؟ اگر میں جھوٹ بولوں اور کہوں کہ Renault 25، تو اسے خیال گزرے گا کہ ایک سرکاری اہلکار ہوتے ہوئے بھی خوب مزے کر رہا ہوں۔ اگر اسے سچ بتا دیتا ہوں تو میری ساس ہی کی طرح مجھے حقیر سمجھے گا۔ میں درمیانی حل اختیار کرتا ہوں: میری کار بندرگاہ پر ضروری کارروائی کے بعد چھٹنے کا انتظار کر رہی ہے۔

ح ح کی قیام گاہ خود اس جیسی دکھائی دیتی ہے: اندر پھوہڑپن اور بدذوقی، باہر نو دولتیوں والی

ٹیپ ٹاپ۔ ٹیلیوژن پر فٹ بال کا میچ دکھایا جا رہا ہے۔ ہم تماش بینوں کی تمسخرانہ ہاؤ ہو کے درمیان کھانا کھاتے ہیں۔ باس اور اس کے دونوں معاون فٹ بال کے شیدائی معلوم ہوتے ہیں، اور ح ح دلدادہ ہونے کا سوانگ رچاتا ہے۔ بس اکیلا میں ہی اس کھیل کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ میں نے غلط کیا، لیکن میں کبھی مقابلے کے کھیلوں میں دلچسپی نہیں لے سکا ہوں۔ مجھے ہجوم پسند نہیں۔ مجھے ہمیشہ ہیجان زدہ لوگوں کے پیروں تلے روندے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ خوف مجھے کم عمری ہی میں والد سے ملا ہے۔ فاس کے پرانے شہر کے گلی کوچوں میں ہونے والے مظاہروں سے انھیں ڈر لگتا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک غیور وطن پرست تھے، لیکن انھوں نے اپنے بچوں کو مظاہرے کرنے سے باز رکھا۔ اچھا ہی کیا۔ ہمارے پڑوسی کا لڑکا چمڑا رنگنے والوں کے علاقے میں کچل کر مر گیا تھا۔ آزادیِ وطن کا شہید!

میں اپنے سے کہتا ہوں کہ خوش قسمتی سے یہاں یہ میچ ہو رہا ہے۔ کم از کم بات چیت کے موضوع کی تلاش سے تو جان چھٹی۔ کیا یہ لوگ واپس دفتر جائیں گے یا معائنہ ختم شد؟ ح ح جس طرح ان سے باتیں کر رہا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کام ختم ہو گیا۔ یہ اس نے بہت اچھا کیا۔ وہ میرے مقابلے میں انتظامیہ کے طریقوں سے بہتر واقف ہے۔ میں اس کا باس ہوں، لیکن قیادت وہ کرتا ہے۔ یہی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے۔ مجھے حکم دینے سے نفرت ہے۔ یہ صرف میری اسناد کا طومار ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ ملازمت ملی ہوئی ہے۔ جبکہ وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ کبھی کالج کا منھ نہیں دیکھا۔

کمیشن کے تینوں افراد ہمارے ساتھ دفتر لوٹتے ہیں۔ اپنی چیزیں سمیٹتے ہیں، اور ہم سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ ح ح باہر تک ان کے ساتھ جاتا ہے۔ اپنی دراز سے شیواز وِسکی کی تین بوتلیں نکالتا ہے، ہر ایک کو الگ پلاسٹک کے تھیلے میں رکھتا ہے، پھر لوٹ آتا ہے، مجسم تبسم۔ ہم دونوں اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

''اچھے لوگ ہیں!'' وہ کہتا ہے۔

''اور ہم بھی اچھے لوگ ہیں۔''

شاؤش ایک اور ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف

Scanned with CamScanner

دیکھتے ہیں۔ ایک بھورے بالوں والی حسین نوجوان لڑکی داخل ہوتی ہے، سیدھی ح ح کے پاس آتی ہے اور ایک خط پکڑا دیتی ہے۔

''باس تو یہ ہیں،'' وہ اس سے کہتا ہے۔

یہ اجنبی بھی برجستہ ح ح کو ہی باس سمجھتی ہے۔ میں کسی قسم کا منصرم نظر نہیں آتا۔ میں اسے اس نظر سے دیکھنے سے باز رہتا ہوں جس سے بعض لوگ دیکھتے ہیں۔ میں خط پڑھتا ہوں۔ وہ ریاست کے نائب معتمد کی سفارش لے کر آئی ہے، جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ لڑکی کا نام دُکالی ہے، جو اس کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔ ح ح اس سے پوچھتا ہے کہ اس کا تعلق نغمہ سرا عبدالوہاب الدکالی کے خاندان سے تو نہیں۔

''اس سے کوئی رشتے داری نہیں،'' وہ دھیمے سے کہتی ہے۔

لڑکی دراز قامت ہے، اچھا لباس پہنے ہے، تھوڑا سا میک اَپ بھی کر رکھا ہے، بلاشبہ کارکردگی میں مستعد ہوگی۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس نے اپنی پرانی ملازمت کیوں چھوڑی۔ وہ خشک، کرارے لہجے میں جواب دیتی ہے:

''باس میرے ساتھ سونا چاہتا تھا... ورنہ دروازے سے باہر۔ میں نے اس کے خلاف جنسی طور پر دق کرنے کا شکایت نامہ داخل کر دیا۔''

ح ح تعجب سے سیٹی بجانے لگتا ہے۔

''تم سمجھتی ہو کہ تم سویڈن میں ہو؟''

''نہیں، لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ مراکش بدل رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے۔ امید ہے کہ آپ مقدمے کی کارروائی میں آئیں گے... مشاہد کے طور پر، ظاہر ہے۔ بلکہ شاید گواہ کے طور پر۔''

دفتر بھی بدل رہا ہے۔ پہلے ہماری سیکرٹری للاّ خدیجہ تھی۔ پچاس کے لگ بھگ عمر کی عورت جو اپنے کام میں لائق تھی، لیکن پرانے خیال کی حقیقی نمائندہ: اس کی فرانسیسی میں عربی کے لفظوں کی بھرمار ہوتی، اور وہ اپنے گھریلو مسائل کا مسلسل رونا روتی رہتی۔ ہر فرد واحد کو اس کے لونگ روم کی اَپ ہولسٹری کا رنگ معلوم تھا، اور وہ ہر وقت فون سے چپکی رہتی۔ ہمیں شکایتیں ملنے لگی تھیں، چنانچہ ہم

نے ایک بیپر (beeper) لگادی جس سے ہر آنے والی نئی کال کا علم ہو جاتا۔ اب، آنسہ دکالی کے ساتھ، نئی نسل قدم رنجہ فرما رہی ہے۔ للآ خدیجہ کی علالتی رخصت کے دوران وہ اس کی جگہ لے لے گی۔

جب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتی، میں اس کا جائزہ لیتا ہوں۔ مضبوط کاٹھی کی ہے۔ ہمیشہ لیے دیے رہتی ہے اور کبھی کوئی ذاتی بات نہیں کرتی۔ ح ح کو یہ طریقہ ناپسند ہے۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے ایک نہ ایک دن اس کی موجودگی بیزار کن بن جائے گی۔ شام کو ہم اسے فیاٹ 127 میں سوار گزرتا دیکھتے ہیں جسے ایک جوان آدمی چلا رہا ہوتا ہے، جو اس کا بھائی یا منگیتر ہوگا۔

میں نجیہ کے دروازے کی گھنٹی بجاتا ہوں۔ اِس بار بھی دروازہ اس کی ماں آ کر کھولتی ہے اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کرتی ہے۔ حسبِ معمول اندر بلاتی ہے، چائے اور مختلف میٹھی چیزیں پیش کرتی ہے۔ سوپ کی مہک آتے ہی میں اس سے ایک پیالہ حریرہ مانگتا ہوں۔ نجیہ بس اب آتی ہی ہوگی۔ وہ بچوں کے ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے۔ جب وہ بیٹی کے ہمراہ واپس آتی ہے تو بڑی کشادہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر اپنے یہاں آنے کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ اس کے جذبات مخلصانہ ہیں۔ میں معاملہ صاف کرنے کے لیے ہم دونوں کے تنہا ہونے کا انتظار کرتا ہوں۔ کھانے کے بعد میں اس کا ہاتھ تھام لیتا ہوں اور شادی کی درخواست کرتا ہوں۔ وہ ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور آنکھیں میچ لیتی ہے۔ میں اس کے لبوں کو ہولے سے چھوتا ہوں اور مجھے ایک حلاوت کا احساس ہوتا ہے جو مجھے میرے بچپن میں لوٹا لاتا ہے۔ اب بھی ہمارا تعلق ہو سکتا ہے، میں سوچتا ہوں، بشرطے کہ وہ کام ختم کر دوں جو ابھی حال ہی میں کرنا شروع کیا ہے۔ یعنی یہی چھوٹی چھوٹی سودے بازیاں۔ میں اس سے انھیں چھوڑ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ رشوتیں رد کر دوں، صورتِ حال کا رخ پلٹ دوں اور رشوت خوروں کا پیچھا کروں؟ ایک فضیحتہ کھڑا ہو جائے گا۔ مجھے باقاعدہ لڑنا پڑے گا، اور مجھے جھگڑا اتنا پسند نہیں۔ بہر صورت، میں نے فیصلہ کر لیا ہے: نہ صرف یہ کہ اب رشوت نہیں لیا کروں گا بلکہ وہ رقم بھی لوٹا دوں گا جو لے لی ہے۔

عجیب بات ہے کہ نجیہ میرے ازدواجی بکھیڑوں سے زیادہ میری راست بازی کی بابت متفکر ہے۔ اسے معلوم ہے کہ حلیمہ سے میرا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ وقت، عادت، اور واماندگی وہ سب کچھ کھا

Scanned with CamScanner

گئی ہے جو کبھی ہمارے درمیان رہا تھا۔ اب مزید صبر کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی اپنی بیوی اور بچوں کو دے دیا کروں تا کہ وہ مناسب زندگی گزار سکیں۔
کیا صرف نجیبہ کی تنخواہ گزارے کے لیے کافی ہوگی؟ میں یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرسکتا؛ خود وہی بریف کیس سے کیلکولیٹر نکال کر حساب لگانے بیٹھ جاتی ہے۔

''گھر میری ملکیت ہے۔ صرف پانی اور بجلی کی قیمت دینی پڑتی ہے۔ مجھے ماہانہ 4825 درہم ملتے ہیں اور بینک سے شوہر کی حادثاتی موت کے بیمے کے 1202۔ بقیہ حصہ بیٹی کے کھاتے میں جمع ہو جاتا ہے۔ ماں نے اپنا پرانے شہر کسی خاندان کو کرائے پر اٹھا دیا ہے اور ہر تین ماہ بعد کرایہ نکلوانے کے لیے وکیل کو انھیں باقاعدہ مقدمہ کرنے کی دھمکی دینی پڑتی ہے۔ قانونی چارہ جوئی کا خرچ نکالنے کے بعد اس سے ماہوار کوئی ایک ہزار درہم وصول ہو جاتے ہیں۔ سب مل ملا کر، سات ہزار درہم ماہانہ پر میرا اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ اگر اس میں تمھاری تنخواہ کا کچھ حصہ شامل کیا جائے، تو ہمارے پاس دس ہزار درہم ہوں گے۔ ماہانہ ایک ملین ہوں تو ہم تقریباً بورژوا زندگی گزار سکتے ہیں — لیکن فکر مت کرو، ایسا کبھی نہیں ہونے کا۔ اگر مجھ سے شادی کے خواہش مند ہو تو طلاق سے ابتدا کرو۔ یہ یاد رکھو کہ جہاں عائلی قانون (personal-status law) دوسری بیوی کرنے کی اجازت دیتا ہے، وہاں پہلی کو طلاق دینے کی بھی۔ لیکن تم ایک مہذب آدمی ہو۔ تم ناانصافی اور بے رحمی کیے بغیر وہی کروگے جو سزاوار ہے۔ ان معاملوں کو نبٹانے کے لیے تمھیں ایک ماہ دیتی ہوں۔ یقین کرو کہ تمھیں خوش کر کے مجھے خوشی ہوگی۔''

ساری زندگی مہذب لیکن قلاش ہی رہا ہوں۔ اس معاملے میں بے بس ہوں۔ مہذب، ایماندار اور باثروت ہونا ممکن ہے۔ قرآن ایسے جرأتمندوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو محنت اور کاروبار کرتے ہیں۔ بہرصورت، فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔ زمانوں پہلے ہی اس نے میرے خاندان کی قسمت طے کردی تھی۔ ہم دادا سے باپ اور باپ سے بیٹے تک بھی فقیر رہے ہیں۔ لیکن خدا ہمیشہ غریبوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ اسی نام کی ایک لبنانی فلم ہے۔ اور یہی میری رام کہانی کا عنوان بھی ہوسکتا ہے۔ بہرکیف، یہ ایک اشتعال انگیز عنوان ہے، اور اِس زمانے میں، اسلام پسندوں کے اندھے پن

Scanned with CamScanner

کے پیشِ نظر، مجھ پر آفت آسکتی ہے۔ بنیادی طور پر، خدا سب کے ساتھ ہے۔ میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں۔ جب سے میں ایماندار نہیں رہا، اس نے میری راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے ہیں۔ یہ راہ زیادہ طویل اور پیچیدہ نہیں تھی، لیکن کم از کم اس میں مجھے خجل نہیں ہونا پڑا تھا۔ فی الوقت، میں اپنے عادی راستے پر نہیں ہوں، بلکہ کئی راستوں کے سنگم پر۔ مجھے ایک مختلف راستہ نظر آتا ہے جو ایک چھوٹے سے گھر — نجیہ کے گھر — کی جانب رواں ہے، جو سکون، حتیٰ کہ کسی قدر مسرت کا ضامن ہے۔

دوسری طرف وہ راستہ دکھائی دیتا ہے جس پر ہمیشہ چلتا رہا ہوں، جس کی انتہا پر حلیمہ اور بچے ہیں۔ عجیب بات ہے، وہ کسی گھر میں نہیں، بلکہ تینوں کے تینوں باہر فٹ پاتھ پر سرخ رنگ کی آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس میں میرے لیے گنجائش نہیں۔ ایک مختصر سا اور راستہ بھی ہے، جو کسی خاص جگہ نہیں جاتا، جس کی انتہا پر نادیہ اپنی آنکھوں پر مصنوعی پلکیں لگا رہی ہے، جبکہ ٹیلیوژن یا ریڈیو پر کوئی مغنیہ اپنی تنہائی کا رونا رو رہی ہے۔ مردہ آنکھ پر پلکیں چپکانا۔۔ کیسی عجیب بات ہے! میری نظر کے احاطے میں گدھے آ جا رہے ہیں۔ ایک ننھا سا طوطا کھڑا تقریر فرما رہا ہے، اور ایک ٹنڈا مسجد کے مینار پر پھیلا ہوا لاؤڈ اسپیکر کا تار چبا رہا ہے۔

نئی سیکرٹری منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتی۔ بس اپنا کام کرتی ہے، ٹیلیفونوں کا جواب دیتی ہے، اپنی ڈیسک سلیقے سے منظم کرتی ہے، نہ عام زندگی پر کوئی تبصرہ کرتی ہے نہ ہاتھ میں جو کام ہے اس پر۔ ہمارے لیے اس کا طور طریق تعجب خیز ہے، کیونکہ پرانی سیکرٹری بڑی متجسس تھی۔ ہوسکتا ہے اِسے جاسوسی کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو؟ ح ح اس سے محتاط معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی اب پہلے سے کم باتیں کرنے لگا ہے؛ جب کوئی ذاتی فون آتا ہے تو وہ اپنی آواز نیچی کر لیتا ہے اور بعد میں خود فون کرنے کے لیے کہتا ہے۔ سیکرٹری سے کچھ بلوا لینا یا اس کے چہرے پر کچھ پڑھ لینا ناممکنات میں سے ہے۔ ایسے بے تاثر چہروں سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ کیا وہ کوئی خفیہ گماشتہ ہے؟ ح ح کا یہی خیال ہے؛ جب مسٹر صبان غیر متوقع آ نکلتا ہے، تو ہم اس کے ساتھ باہر قہوہ پینے نکل جاتے ہیں، غیر محتاط کانوں سے دور۔

Scanned with CamScanner

یہ عجیب بات ہے، میں نے تو ابھی تک صرف دو کمیشن ہی لیے ہیں، تاہم اس میدان میں میرا ردعمل ایک آزمودہ کار کا سا ہے، ح ح جیسا، جس نے اس تمام وقت میں اپنے دس فیصد کمیشن سے اچھی خاصی دولت اکٹھی کر لی ہوگی۔

یہاں کی صحافت اٹلی کی زبردست رشوت ستانی کے انسداد کی مہمات کی بابت بالکل خاموش ہے۔ خوش قسمتی سے میں ہفتے میں ایک بار فرانسیسی ثقافتی مرکز جاتا ہوں اور غیر ملکی اخبار اور رسالے پڑھ کر خود کو باخبر رکھتا ہوں۔ وہاں سیاسی جماعتوں کے سربراہ دھڑا دھڑ استعفے دے رہے ہیں، پارلیمنٹ کے اراکین کا قانونی چارہ جوئی سے استثنٰی واپس لیا جا رہا ہے، وزرا کے خلاف مقدمے کھڑے کیے جا رہے ہیں، کمپنیوں کے بلند مرتبت افسر خودکشیاں کر رہے ہیں۔ رشوت خوری کہاں نہیں ہے؟ ہمارے مقابلے میں بس فرق اتنا ہے کہ اٹلی میں اس کا تعلق زیادہ تر لیڈر لوگوں سے ہے اور بڑے پیمانے پر واقع ہوتی ہے۔ اگرچہ...

جب سے بس میں سفر کرنا بند کیا ہے، اپنی حالت کو بہتر پاتا ہوں۔ مجھے بنی آدم سے کم نفور محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ مجھے اپنے ہم وطن پہلے سے زیادہ باقدر معلوم ہوتے ہیں؛ ان کی بابت میری رائے بلند ہوگئی ہے۔ اب مجھے ان سے دھکم دھکا نہیں کرنی پڑتی، ان کی بدبوئیں اور بدمزاجیاں نہیں سہنی پڑتیں۔ آمدورفت کی عوامی سواریاں دوسرے سے دلبستگی پیدا کرنے کی ترغیب نہیں دلاتیں۔ جب میں بچہ تھا، میرے والد نے گھر کا کچھ حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا؛ ہم ساتھ ساتھ رہتے تھے، بس ایک چادر دونوں گھرانوں کی حدِ فاصل تھی۔ میری ماں کو یہ ناپسند تھا۔ کرائے دار ہم سے بھی زیادہ غریب تھے اور، خاص بات یہ کہ اچھے تربیت یافتہ نہیں تھے۔ دیہاتی لوگ تھے۔ مجھے ان کے پکوانوں کی بوباس پسند نہیں تھی۔ ان کے تین بچے تھے جو بیشتر وقت ریں ریں کرتے رہتے۔ یہ بڑا تاریک زمانہ تھا، اس نے مجھے اپنے ہمسروں کو برداشت کرنے کے لیے ٹھیک سے تیار نہیں کیا۔

وہ سفید دھبے اب میرے ہاتھوں کی پشت، بازوؤں، اور پیشانی تک پھیل گئے ہیں۔ میں سفید ہوتا جا رہا ہوں۔ لوگ مجھے تشویش سے دیکھنے لگے ہیں؛ انھیں مجھ سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

غلیظ پیسے کے استعمال کے ساتھ ساتھ میری جلد کا طبعی رنگ زائل ہوتا جا رہا ہے۔ میں اپنے گندے مال کی دھلائی کی مشین آپ ہی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ سب کو صاف نظر آتا ہے، اگرچہ دونوں باتیں صرف مجھی کو ایک دوسرے سے منسلک نظر آتی ہیں۔ دوسرے اس کسی قسم کا مرض سمجھتے ہوں گے جس کا محرک کوئی نفسیاتی صدمہ یا کوئی شدید اضطراب ہے۔ میری بھنویں تک سفیدی کے سیل کی زد میں آ گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان پر میک اَپ چڑھا رکھا ہے۔ کیا یہ متعدی ہے؟ خطرناک ہے؟ کسی ماہر سے رجوع کرنا ہی ہوگا، جس کی فیس، خیال آتا ہے، اسی گندے پیسے سے ادا کرنی پڑے گی، لیکن ظاہر ہے، اسے اس کا کیا پتا چلے گا۔ یہ شر کا شر سے علاج کرنے کا ایک طریقہ ہوا۔

ڈاکٹر معائنہ کیے بغیر ہی کہتا ہے:

''یہ برص ہے۔ جلدی مواد کے اضطراب کا معمولی سا معاملہ ہے۔ کوئی تشویشناک بات نہیں۔ رنگین عناصر کی تقسیم میں گڑبڑ ہوگئی ہے۔ سفید حصے رنگین مواد سے محروم ہو گئے ہیں اور غیر متاثر حصوں میں زیادہ مقدار جمع ہوگئی ہے۔ دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا، لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔ خیر، اب کچھ ٹیسٹ کر لینے چاہییں، کیونکہ مجھے کچھ سرخ دھبے بھی نظر آ رہے ہیں... دورانِ خون ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔''

چند دن بعد، میں ٹیسٹ کی رپورٹ لے کر اس کے پاس واپس آتا ہوں۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتا ہے، گاہے گاہے نظر اٹھا کر مجھے دیکھتا ہے۔ پھر ہونٹ سکیڑ کر کہتا ہے، ''اوہ!... عجیب بات ہے... بہت نادر ہے،'' پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور عینک اتار کر مجھ سے پوچھتا ہے:

''تم کس قسم کا کام کرتے ہو؟''

''انجینئر ہوں۔''

''قابلِ رشک منصب ہے۔''

''پتا نہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، تمھارے جسم پر پیوندکاری ہوئی ہے؟''

''کاہے کی پیوندکاری؟''

''کسی عضو کی؟... یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کیونکہ عجیب چیز واقع ہو رہی ہے۔ تمھارے

Scanned with CamScanner

برص کے ساتھ ساتھ ایک الرجی بھی ہے، جو بیرونی عضو کو قبول نہیں کرتی۔''

اچھا، سمجھ گیا۔لیکن یہ بتائیے، اس کا کوئی علاج ہے؟''

''نہیں۔ جیسے جیسے اس کے عادی ہو جاؤ گے، اس کی طرف توجہ دینا چھوڑ دو گے۔ بعض اوقات جلد کا طبعی رنگ بحال ہو جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی وجسمانی (psychosomatic) مرض ہے۔تم بہت زیادہ حساس معلوم ہوتے ہو۔ زندگی کے روشن پہلو کو دیکھا کرو۔ جو اور سب کرتے ہیں، وہی تم بھی کیا کرو۔ خون کو آسانی سے دوڑنے دو۔ بہت زیادہ پریشان کن خیالات سے اسے مکدّر نہ کیا کرو۔''

''کیسے خیالات؟''

''تم سوچتے بہت ہو گے۔''

''شاید۔''

پھر میں اسے بتاتا ہوں کہ اِدھر کئی دن سے قبض کی شکایت ہے۔

''یہ پہلے بتا دیا ہوتا۔ اب سب کچھ واضح ہوتا جا رہا ہے۔تم باہر نکالنے کے بجائے اندر روکے ہوئے ہو۔تم کسی مشکل کے دباؤ میں ہو جو تمھارے ضمیر کو احساس جرم سے پراگندہ کر رہی ہے۔ تمھیں تفریح کی ضرورت ہے جس سے اعصاب کو سکون ملے۔کوئی کھیل ویل شروع کر دو۔''

''بس اتنا ہی؟''

''لچکداری بڑھاؤ۔''

''کیا اس کے لیے شام کی کلاسیں پڑھائی جاتی ہیں؟''

''صبح شام، ہر وقت۔ اپنے کو آزاد چھوڑ دو۔ جیسی چلتی ہے چلنے دو۔ زندگی کو اپنی ناز برداری کرنے دو...''

بقیہ ڈالر بدلوانے ضروری ہیں۔ گھر چھوڑ رہا ہوں، اس لیے حلیمہ کو وافر نقدی دینی ہو گی۔کل پرسوں میرے برص کا علم ہونے پر اس کا ناک بھوں چڑھانا اس کی انسانیت کے بارے میں بہت کچھ واضح کر دیتا ہے۔اس کے پاس رحم کہاں ہے؟ اگر میں اس کے قریب آؤں تو مجھے یقیناً دھکا دے کر دور کر دے گی۔ وہ بیماری سے خوف کھاتی ہے۔کبھی کسی مریض کی عیادت کرنے نہیں جاتی۔

Scanned with CamScanner

اس امید میں علالت سے الگ تھلگ رہتی ہے کہ خود بچ جائے گی۔ شادی کے دو سال بعد کہیں جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ میری بیوی اعصاب زدہ (neurotic) عورت ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی مشکلات تک کو حسبِ حال بنالیتی ہے، اس لحاظ سے کہ انھیں بہت زیادہ اہمیت ہی نہیں دیتی۔ اس کے شہوانی ارتکازات (fixations) مجھے الجھن میں ڈال دیتے تھے، اس کی سرد مہری پر جھنجھلاہٹ ہوتی تھی، اور اس کی پیسے اور مادّی آسائشوں کی مجنونانہ ہوس میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی۔ اس کے باوجود، میں نے دو بچے پیدا کیے اور بڑی دور تک اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ یہ سب منطق سے بہت بعید ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی خیال کیا ہے کہ مرد بزدل ہوتے ہیں، خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں۔ میں نے بہت وقت ضائع کیا ہے۔ بدقسمتی سے ہوش آیا بھی تو بہت دیر کے بعد۔

کیا میں آزاد ہوں؟ بالکل، ظاہر ہے۔ مجھے 'ہوا کی طرح آزاد' کا فقرہ پسند ہے۔ میں بھی جہاں چاہوں اور جب چاہوں، جاسکتا ہوں۔ میں تو ان بدنام، بے تکلف چھوٹے چھوٹے ریستورانوں میں سے کسی میں بھی جاسکتا ہوں جہاں تاش کھیلے جاتے ہیں۔ میں بیئر منگا کر پیوں گا اور ساتھ ساتھ بھاپ سے پکائی ہوئی فول پھلی کے دانے بھی چباتا جاؤں گا۔ میں گزشتہ کل کے فٹ بال میچ پر تبصرہ کروں گا اور بغداد پر بمباری کرنے پر امریکنوں کو گالیاں دوں گا۔

ہاں، میں آزاد ہوں۔ میں چہل قدمی کرسکتا ہوں یا چاہوں تو ٹیکسی میں بیٹھ کر ساحل کی سیر، نجیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے سگریٹ نوشی کرسکتا ہوں، جوتے چمکوا سکتا ہوں، کوئی کتاب خرید سکتا ہوں، کدّو کے بھنے ہوئے بیج کھا سکتا ہوں، راہگیروں کا شمار کرسکتا ہوں، ان میں سے جو سفید لباس پہنے ہوں ان کی تعداد کا حساب رکھ سکتا ہوں، اور خاکستری پہناوے والوں کو نظر انداز کرسکتا ہوں، ان کے پیشوں کے بارے میں تخمین وظن کرسکتا ہوں، اور یہ کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں، برسرِ روزگار ہیں یا نہیں۔ میں پشتے کے کسی بھاری پتھر پر چڑھ کر سمندر کا نظارہ کرسکتا ہوں، تن تنہا، شہر کی طرف پیٹھ کر کے، کسی سمندری بگلے اور اس کی پرواز کا تعاقب کرسکتا ہوں، یہاں تک کہ برص اور قبض دونوں فراموش ہوجائیں۔ میں قبض دور کرنے کے لیے خشک آلوچے آزادی سے کھا سکتا ہوں، اگرچہ میرا معدہ اب میرا حکم کہاں مانتا ہے۔ میں پتھر سے خود کو بتدریج پھسل کر موجوں سے بغلگیر بھی ہونے دے سکتا ہوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا اور مجھے یہ خوف بھی دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں ٹھیک

Scanned with CamScanner

اسی جگہ نہ جا پڑوں جہاں شہر کی غلاظت کا نکاس ہوتا ہے۔ یہ بڑی سخت بدبودار ہوتی ہے۔ مجھے یہ سوچنے کی بھی آزادی ہے کہ یہ بدبودار نہیں ہوتی۔ دوسروں کے فضلے کے ساتھ ساتھ بہتے چلے جانا بڑی ناشائستہ حرکت ہے۔ میں نفاست کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نہیں، میں اس سے بدرجہا بہتر ہوں: آدمی کو اس حد تک اپنی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ میں عمل کرنے اور سوچنے میں پوری طرح آزاد ہوں، اور کوئی مجھے سوچنے اور خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا، جو میری واحد آزادی ہے۔ میں ہتھیار بند ہوں۔ میرے خواب ناقابلِ نفوذ ہیں اور چابی صرف میرے پاس ہے۔ مجھے اس کو چھپانے کی ضرورت بھی نہیں، یہ میرے سر کے اندر ہے۔ مجھے عمل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔ کوئی بھی نہیں؟ مجھے واسِط اور کریمہ کے چہرے نظر آتے ہیں۔ پس منظر میں نجیہ کا تاریک خاکہ (silhouette) دکھائی دیتا ہے۔ نہیں، میں آزاد کہاں ہوں؟ میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ سب کچھ بھول جاؤں گا۔ میں ہولے ہولے گھر کی طرف لوٹوں گا، جہاں حلیمہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں، رونے کی زیادتی سے نمناک آنکھوں، اپنی تلخی، اپنے مکروہ اتہامات، اور پھٹ پڑنے کے قریب اپنے غصے کے ساتھ میری منتظر نظر آئے گی۔

میں گھر لوٹوں گا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ کانوں میں روئی ٹھونس لوں گا، کتاب اٹھا کر پڑھتے پڑھتے سو جاؤں گا۔ میں لونگ روم کے ایک چھوٹے سے گوشے میں بیٹھ جاؤں گا یا باورچی خانے میں گھس کر چٹخنی چڑھا لوں گا۔ مجھے سکون مل جائے گا۔ یہ آزادی ہے، میری آزادی، بس یہی، کچھ اور نہیں۔ یہ تنگ اور مختصر سی ہے، لیکن حقیقت بس یہی ہے۔

اب جبکہ میں نکبت سے آگاہ ہو گیا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ کیا کرنا چاہیے۔ میری ساس کل مجھ سے ملنے دفتر آئی تھی۔ یہ حربہ اس نے مجھ پر دوسری مرتبہ آزمایا ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب کریمہ پیدا ہوئی تھی۔ میرا لڑکا اُس وقت تین برس کا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو متعجب کرنے کے لیے کریمہ کی نام رکھائی اور واسِط کی ختنہ کی تقریب کا چوری چھپے انتظام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حلیمہ کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ بورژوا خاندانوں میں یہ خاصا عام ہے؛ ساس نے اس نکتے کی وضاحت کرنے اور میری تنخواہ کی فرومائیگی جتانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ پیسے والوں کی فیاضی اکثر خاصی مشکوک ہوتی ہے۔ وہ پردہ پوشی کی قدرت نہیں رکھتے۔ بہرحال، اُس وقت میں نے اس کی اس

Scanned with CamScanner

بات کا برا نہیں مانا، کیونکہ اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ کل اس کی آمد کا مقصد کچھ اور ہی تھا: حلیمہ اور میرے درمیان تجدید تعلق کرانا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ خلافِ عادت ڈینگیں نہیں مار رہی تھی، یہاں تک کہ اس نے اپنی بیٹی پر اچھی خاصی تنقید بھی کر ڈالی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ وہ مجھے سمجھتی ہے اور وہ یہ صرف کریمہ اور واسطے کے خیال سے کر رہی ہے، کہ اس کی نظر میں پیسہ صرف جھاڑ جھنکاڑ ہے، اور کہ زندگی میں ماڈی راحت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ ''صرف صحت اہم ہے۔ صحت نہیں تو پیسہ بیکار ہے۔ ہمیں خدا سے صحت مند جسم اور دماغ مانگنا چاہیے۔ باقی سب بعد میں آتا رہے گا۔ صحت کے بغیر نہ خوشی ہے، نہ فرحت، نہ مستقبل...'' میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ بمشکل اسے پہچان سکا۔ میں سوچتا ہوں: ہو نہ ہو، بیمار ہو گی۔ اسے اپنا آخری وقت قریب محسوس ہو رہا ہو گا۔

میں نے نرمی سے بتایا کہ حلیمہ سے صلح کرنے کی میری کوئی نیت نہیں، کہ ہمارے درمیان خلیج بہت گہری ہے۔ وہ شکوے شکایت کے ساتھ رخصت ہوئی، لیکن جاتے جاتے ذرا سا رک کر چبھتا ہوا فقرہ کس دیا، ''خدا تم سے نبٹے گا! تمھیں اس کے ہاتھوں میں چھوڑتی ہوں۔''

تب سے میں خدا کے ہاتھوں میں ہی ہوں، اور خود کو بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ ح ح میری طرف ہمدردی سے دیکھتا ہے۔ وہ اس قسم کی مشکلوں سے واقف نہیں ہے: سچ مچ خدا کے ہاتھوں میں ہونا! کیسی زبردست نعمت ہے! میں موقعے سے فائدہ اٹھا کر تھوڑا سا اور انصاف اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہتری مانگوں گا۔ بہت زیادہ نہیں چاہیے: بس تنخواہ میں اضافہ، حلیمہ کی خاطر اور زیادہ 'کمیشن'، کہ کریمہ صحت یاب ہو جائے۔ اس کا دمہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کچھ عرصے کے لیے اسے سانس کی بیماریوں کے کسی خصوصی مرکز میں رکھنے کی بات کی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ کریمہ کا تنفس بتدریج کم ہوتا جائے گا؛ اس کا بایاں پھیپھڑا ابھی خراب حالت میں ہے۔ ڈاکٹر میرے سالوں میں سے ایک ہے۔ ہمارے تعلقات رسمی طور پر خوشگوار ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ مجھ سے معائنے وغیرہ کی فیس نہیں لیتا، اور اس بات کی طرف میری ساس اشارہ کر چکی ہے۔ غریبوں کی اہانت کر کے ان لوگوں کو آخر کیا ملتا ہے؟ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس پیسہ نہیں تو یہ میرا قصور ہے۔ میں خود کو ماحول کے مطابق نہیں ڈھال سکا ہوں۔ میں نے اسے بامصرف نہیں سمجھا کہ کچھ سمجھوتے کر لوں۔ ڈاکٹر یہ سب کہتا تو نہیں ہے، لیکن وہ یہ سوچتا ضرور ہو گا۔ ہم معاشرتی طور پر ملتے

Scanned with CamScanner

ملاتے نہیں ہیں۔ حلیمہ اور میں رات کو زیادہ کہیں نہیں آتے جاتے کیونکہ ہمارے پاس کار نہیں ہے۔ دار البیضا میں رات کے وقت ٹیکسی حاصل کرنا بڑے جوکھم کا کام ہے، سو ہم اپنی شاذ و نادر ڈنر کی دعوتوں کے لیے معذرت کر لیتے ہیں، سوائے انتہائی ضروری صورتوں کے، یعنی جب شادی بیاہ یا ماتم کا معاملہ ہو۔

آج صبح جب ڈاکٹر کا فون آیا تو میں گھبرا گیا۔ یہ پہلی بار ہے کہ اس نے مجھے فون کیا۔ وہ کریمہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس نے مجھے ایک جگہ کا پتا دیا جہاں اسے بھیج دینا چاہیے؛ اس نے یہ اضافہ کیا کہ اس پر میرے دس سے پندرہ ہزار درہم کے درمیان خرچ آئیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ رعایت دلوانے کے لیے میری مدد کرے گا، کیونکہ کلینک کا سربراہ اس کا دوست ہے۔ کریمہ کے لیے سب سے پہلے دمے کا علاج ضروری ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ اور کیا کرنا ہے۔

میں فون رکھ دیتا ہوں اور اپنی بھنویں اور پیشانی پونچھتا ہوں۔ مجھے ٹھنڈا پسینہ آ رہا ہے۔ میں دفتر چھوڑ کر جلدی سے گھر بھاگتا ہوں۔ ٹیکسی ٹریفک جام میں پھنس گئی ہے۔ میں ٹیکسی سے نکل کر پیدل چلنے لگتا ہوں۔ گھر پر حلیمہ کپڑے سی رہی ہے۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہوتی ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کریمہ کہاں ہے۔

''اسکول میں۔ کیوں؟''

''ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''ہاں، بس چند رات پہلے اس پر دمے کا دورہ پڑا تھا، جب تم باہر اپنی کسی طوائف کی بغلیں گرم کر رہے تھے۔''

''باتوں کو خلط ملط مت کرو۔''

''خوش قسمتی سے ڈاکٹر سعید یہاں موجود تھا۔ اس نے انجکشن لگا دیا۔''

''بات صاف ہو گئی۔ اس نے مجھے دفتر فون کر کے کہا کہ اسے اسپتال میں داخل کرنا ضروری ہے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ لیکن پیسہ کہاں ہے؟''

Scanned with CamScanner

''پیسہ؟ پیسے کا انتظام میں کرلوں گا۔''

میں غسلخانے میں بند ہو کر اپنا نقدی کا ڈبا، وجود اور عدم، کھولتا ہوں۔ نوٹ گنتا ہوں۔ سو سو ڈالر کی مالیت کے دس نوٹ، اور ڈھائی ہزار سے زائد درہم۔ شروع میں اتنی رقم کافی ہوگی۔ اس کے بعد قرض لے لوں گا یا ح سے پوچھوں گا کہ دستخط کرنے کے لیے اور کوئی فائل تو نہیں ہے۔ ڈالروں کو بدلوانا ضروری ہے۔ میں بینک کی اسی شاخ میں جاتا ہوں جہاں پہلے رقم کا کچھ حصہ بدلوا چکا تھا۔ ٹیلر مجھے فوراً پہچان جاتا ہے، مسکراتا ہے، اور مجھ سے اپنے پیچھے پیچھے آنے کے لیے کہتا ہے۔ میں خود کو منیجر کے سامنے پاتا ہوں، جو شاید شاخ کا سربراہ ہے۔

''کیا آپ کے پاس بدلوانے کے لیے مزید ڈالر ہیں؟'' وہ فوراً پوچھتا ہے۔

''ہاں۔ اسی لیے آیا ہوں۔''

وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک فائل پر تیزی سے نظر بھی ڈالتا جا رہا ہے۔

''میں اس رقم کی سرمایہ کاری کے لیے خود ہی آپ کو تجویزی خط لکھنے والا تھا۔ چونکہ آپ اب یہیں ہیں، اس لیے خط کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ٹیلر اضافہ کرتا ہے: ''اور ضرب المثل کے مطابق: جب پانی موجود ہو تو تیمم کی کیا حاجت!''

وہ اپنا ہاتھ آگے کر دیتا ہے اور میں اسے سو سو ڈالر کے دس نوٹ دے دیتا ہوں۔ وہ انھیں گنتا ہے، دوبارہ گنتا ہے اور ان کے نمبروں کی تحقیق کرتا ہے۔

''بالکل نئے نوٹ ہیں۔ اور ایک ہی سیریز کے۔ یہ گڑبڑ کی بات ہے۔''

میں اس کی طرف بھونچکا ہو کر دیکھتا ہوں۔

''یہ ڈالر آپ کو کہاں سے ملے؟'' منیجر پوچھتا ہے۔

''آپ کو اس سے کیا سروکار!''

''جانتا ہوں، لیکن یہی سوال آپ سے مختلف انداز میں، مختلف جگہوں پر، اور، اہم تر یہ کہ، مختلف لوگ پوچھیں گے۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ L56061450A سے L56062000A تک سیریز کے نوٹوں کی ان دنوں بہت تلاش کی جا رہی ہے، اور اسے نوٹ جمع

Scanned with CamScanner

کرنے کے شوقین تلاش نہیں کر رہے ہیں! پچھلی بار آپ نے L56061450A سے L56061460A کے دس نوٹ بدلوائے تھے، اور، گویا معجزاتی طور پر، آج کے نوٹ اسی تسلسل سے آگے بڑھ کر 70A تک پہنچتے ہیں۔ اچھا، تو اب آپ بتائیں گے کہ یہ رقم کہاں سے آئی اور کس نے دی؟''

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں، جیسا کہ کسی خراب فلم کے منظر میں ہوتا ہے، ''میرے چچا نے جو امریکہ میں رہتا ہے!''

لیکن اس آدمی سے نبٹنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ کیا پتا برانچ منیجر کے بھیس میں کوئی پولیس افسر ہو؟ میری دہشت اور خاموشی کے پیش نظر وہ اٹھا کر کسی سے رابطہ قائم کرتا ہے۔

''میرے خیال میں ہم صحیح راستے پر ہیں،'' میں اسے کہتے ہوئے سنتا ہوں۔ میں چند قدم اٹھانے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں، لیکن ٹیلر مجھے زبردستی پھر بٹھا دیتا ہے۔

''میری رقم واپس کرو!''

''معاف کریں، یہ رقم آپ کی نہیں۔ یہ چوری کی گئی ہے، شاید آپ نے ہی چرائی ہو، یا اس نے جس نے آپ کو دی۔ اس اعتبار سے آپ یا خود چور ہیں یا چور کی آڑ، جس کی سزا چار سے پانچ سال کی جیل ہے۔''

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ مدھم آواز میں اضافہ کرتا ہے:

''اگر آپ چاہیں تو ہم معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ فی الوقت، صرف ہم تینوں ہی کو اس کا علم ہے۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ آیا یہ نازک معاملہ صرف ہم تینوں تک رہے گا، ایک مشترکہ نجی بات کی طرح، ہمارا چھوٹا سا راز۔ زندگی میں آدمی کو کبھی کبھی ہارنا بھی سیکھنا چاہیے۔''

یہ پاگل ہے! دیکھتا نہیں کہ کس سے بات کر رہا ہے؟ میں نے اپنی ساری زندگی جیتنے میں نہیں گزاری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کچھ کھو بھی نہیں رہا تھا، کیونکہ میری حد سے بڑھی ہوئی ایمانداری نے مجھے کسی قسم کے خطرات مول لینے سے باز رکھا تھا۔ پہلی دفعہ جب دو پیسے بنا لیے تو کوئی دوسرا انھیں ہتھیانے کی گھات میں ہے! یہ کہاں کا انصاف ہے۔ غریبوں کے ساتھ کوئی انصاف نہیں۔ اقتدار اور ایمانداری کا کوئی میل نہیں۔ میں خود کو ابھی سے اس حال میں دیکھ سکتا ہوں کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں

پڑی ہیں اور ان تفتیش کرنے والے میں سے کسی کے سامنے ہوں جو دھمکی اور دھونس پر مبنی کارروائی کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ''تم سے اگلوانے کے لیے ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے ہیں،'' وہ مسکرا کر مجھ سے کہے گا۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ حراست کی میعاد میں کمی کر دی گئی ہے۔ پہلے اپنی کارروائی کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک زمانہ ہوتا تھا۔ ان دنوں انسانی حقوق کی انجمنوں اور ان مسلسل ٹرانے والے ملکی اور غیر ملکی صحافت والوں کی وجہ سے ہمیں اپنا کام جلدی لپیٹ دینا ہوتا ہے۔ سو یہ ہے جمہوریت: وقت کا مسئلہ۔ پہلے جو کام ہم آرام آرام سے ایک یا دو ہفتوں میں انجام دیتے تھے، اب صرف اڑتالیس گھنٹوں میں ختم کرنا پڑتا ہے!''

میں آنکھیں اٹھا کر اوپر اس دھمکی دے کر رقم اینٹھنے والے چور اچکے کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں جو مجھے پولیس کے حوالے کر دینے کی پوری پوری اہلیت رکھتا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے شک میں پڑ جاتا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھ پر اس قسم کی تہمت لگا رہا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ سب کچھ میرے چہرے پر پڑھ سکتا ہے؟ ایماندار لوگوں کو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ بس صراطِ مستقیم سے بھٹکنے کی دیر ہے اور سب کو علم ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی چغلی خود کھا دیتے ہیں، ان کے خلاف مخبری کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سوائے اس کے کہ میرے معاملے میں، مجھے پورا یقین ہے، کسی نے بینک کے ان دونوں اشخاص کو خبردار کر دیا ہے۔ وہ کون ہے؟ مسٹر صبان یا ح ح؟ لیکن کیوں؟ انتقام؟ بغض، خالص بغض؟ اب جا کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری دیانتداری، میری بے لچک طبیعت، مصالحتی طرزِ احساس کے فقدان کے باعث جانے کتنے سودے طے پانے، اور ح ح اور اس کے سازشی ساتھیوں کی جیبیں بھرنے سے رہ گئے تھے۔ اسی نے مجھے آسانی سے ہاتھ آنے والے پیسے کا مزہ چکھنے کے لیے شہ دی تھی تاکہ مجھے اس ضیاع کا اندازہ ہو جائے جو مجھے ہوا اور میری وجہ سے اسے۔ ہائے کجروی! ہائے سادیت! اور سونے پہ سہاگہ، اگر میں پکڑا گیا تو میری جگہ وہی لے گا۔ یہ ان سب کی ملی بھگت ہے: صبان، میرا اسسٹنٹ، بینک کے کارندے، اور حتیٰ کہ شاید چند پولیس افسر اور انسپکٹر۔ اس پر حلیمہ اور اس کی ماں کا اضافہ اور کر لیں تو پورا نقشہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب دھوکے کی ٹٹی ہی ہو۔ مجھے غیر ملکی کرنسی ہرگز قبول نہیں کرنی چاہیے تھی... مجھے تو کسی

Scanned with CamScanner

قسم کا پیسہ سرے سے قبول ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب، اب میں کیا کروں؟ اس میں سے کچھ انھیں دے دوں؟ احتجاج کروں اور کسی مرطوب کال کوٹھڑی میں پولیس والوں کا سامنا کروں؟ میں اس پیسے کی کوئی صفائی نہیں پیش کر سکوں گا، میں دام میں آ گیا ہوں، کسی جانور کی طرح۔ اگر ان سے معاملہ کرتا ہوں تو یہ اپنے جرم کا اقبال کرنے کے برابر ہوگا۔ میں رشوت خور ہوں، لیکن نیا نیا رشوت خور، لیکن پہلی غلط کاری کی تاریخ اور نوعیت کی بھلا کیا اہمیت ہے؟

میں کھڑا ہوتا ہوں، دفتر میں چند قدم اٹھاتا ہوں، ایک سگریٹ پھونکتا ہوں اور کھڑکی سے باہر شہر کو دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے کھڑکی میں سے باہر کی زندگی کا نظارہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں حسن اور مسرت کا تصور کرتا ہوں، اور گزرنے والوں کے رنج والم کا اندازہ لگاتا ہوں۔ ہلکے آسمانی جلاّبے میں ملبوس یہ عورت جو اپنے بچے کو پیچھے بٹھائے پرانی موٹر سائیکل پر چلی جا رہی ہے، یہ ضرور خوش ہوگی۔ یا شاید میرے جتنی ہی غریب ہوگی لیکن فی الوقت میرے جتنی فکر مند نہیں۔ نوجوان جو دیوار سے پیٹھ لگائے سکون سے دھوپ کا مزہ لے رہا ہے، اپنی قانون کی ڈگری کے باوجود اب کسی ملازمت کی پیشکش کا منتظر نہیں رہا۔ مجھے اس پر بھی رشک آتا ہے۔ لیکن وہ فربہ اندام شخص جو بریف کیس اٹھائے بھاگا جا رہا ہے، خوش نہیں ہوگا۔ اسے پسینہ آ رہا ہے؛ وہ ٹھہر جاتا ہے، اپنے سر کے گنجے حصے پر ہاتھ پھیرتا ہے، اور پسینہ پونچھتا ہے۔ وہ اچھی زندگی نہیں گزار رہا ہوگا۔ کچھ کچھ میری طرح۔ دو ایک سیاح رک کر تصویر اتارتے ہیں۔ مرد کافی دراز قامت ہے، اور عورت بھی۔ دونوں خوبصورت اور خوش ہیں۔ شاید انھیں کوئی فکر نہیں۔ وہ کسی دفتر میں بند نہیں جہاں اپنے ڈالر بدلوانے کے لیے معاملہ کرنے کے درمیان ہوں! میں بھی کبھی ایک باعزت سیاح بن سکوں گا، جس کے پاس درہم ہوں جنھیں نیویارک یا سان فرانسسکو میں ڈالروں میں بدلوا سکے؟ مجھے کریمہ اور واسط کا پھر خیال آتا ہے۔ وہ یہ تصور کرنے سے کوسوں دور ہیں کہ ان کا باپ دام میں آ گیا ہے، کسی بند گلی میں جا پھنسا ہے۔ وہ اس کے مستحق نہیں۔ میں ہار مان لیتا ہوں۔ میں سوچنا بند کر دیتا ہوں، اس اور اُس کا موازنہ چھوڑ دیتا ہوں۔ میں سپر انداز ہو جاتا ہوں۔ کیا میرے پاس کوئی اختیار ہے؟ مجھے کوئی مشورہ دینے والا نہیں، کوئی میری مدد اور حمایت کرنے والا نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ مجھے کھڑکی کے شیشے میں اپنی صورت نظر آ رہی ہے؛ میرا چہرہ کسی قدر بدلا ہوا ہے۔ اس کا سبب گرمی، تشویش، اور خوف ہوگا۔ میں خوش شکل تو کبھی نہیں رہا ہوں،

Scanned with CamScanner

لیکن یہ رڈی شیشہ میری صورت کو اور بھی بگاڑے دے رہا ہے۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ میری بینائی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں، لیکن یہ مجھے فریب بھی دے رہی ہے۔ شیشے والا چہرہ دائیں سے بائیں حرکت کرتا ہے، جبکہ میں اپنی جگہ جامد ہوں۔ کھڑکی پوری کھلی ہوئی نہیں ہے اور ہوا میرے پیکر کو مرتعش کر رہی ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو ابھی ابھی سیدھا کھڑکی سے نکل کر دھویں کی طرح غائب ہو جاتا۔ اور یہ جو مجھے ڈرا دھمکا کر پیسے اینٹھنے کی فکر میں ہیں، مخمصے میں پڑ جاتے! عدالت میں میرے اڑن چھو ہونے کی وضاحت کرنی پڑتی، جبکہ میں، غیر مرئی طور پر، عدالت کی کارروائی میں موجود ہوتا۔ میں اس طرح اپنا انتقام لیتا۔ دروازہ کھلتا ہے۔ کھڑکی کھٹاکے سے بند ہو جاتی ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو اپنے سامنے ایک لمبا تڑنگا، بے ڈاڑھی منڈا، خطرناک مشٹنڈا نظر آتا ہے۔ سو اب تین آدمی میری جان کو آئے ہوئے ہیں۔ مشٹنڈا مجھے دھکا دے کر کرسی پر بٹھا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ خفیہ گماشتہ ہے جس نے بڑے بڑے لوگوں کو حوالات کی سیر کرا دی ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔ یہ مجھے ہیبت دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں اپنی خاموشی کے ذریعے ان کی مزاحمت کرتا ہوں۔ آخر ان وحشیوں سے بات کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ میں نے ہمیشہ اپنا تصور ایک شہری ٹارزن کے طور پر کیا ہے، ایک عدل و انصاف پرست انسان، ایک نجات دہندہ کے طور پر۔ میں اپنے عضلات کو دبا کر دیکھتا ہوں۔ یہ ہمیشہ ہی چمرخ رہے ہیں۔ اور میرا سانس بھی پھول جاتا ہے۔ مجھے ہمیشہ معلوم رہا ہے کہ سگریٹ جلد میرا خاتمہ کر کے چھوڑے گی۔ اگر اس مشٹنڈے نے مجھے مکا مارا تو میں بیہوش ہو جاؤں گا۔ جب میں فوج میں تھا تو اکثر تھکا دینے والی جسمانی مشقوں سے جان بچانے کے لیے بیماری کا بہانہ کر دیتا تھا۔ علاج خانے میں بند ہو کر کتابیں پڑھتا۔ صحت کی یہ کمزوری دراصل تنہائی سے تھوڑا بہت لطف اندوز ہونے کا بہانہ تھی۔ مجھے دوسرے لوگوں کے اس قدر قریب رہنے سے نفرت رہی ہے۔ اور اب، یہ تین وحشی مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں جن کے منھ سے لہسن اور بیئر کی بدبو آ رہی ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ مجھے اس نرغے سے رسّی تڑا کر نکل جانا چاہیے۔ ابھی ابھی۔ فوراً۔ بلا مزید تاخیر کے۔ مجھے یہاں سے نکلنا چاہیے، ٹھیک ابھی۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ متلی ہونے لگتی ہے، خاص طور پر جب یہ مجھ پر جھکتے ہیں اور ان کے سانسوں کی بدبو کے بھبکوں سے میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ اب۔ میں چاہتا ہوں، میں اپنے ارادے سے طلب کرتا ہوں کہ یہ

Scanned with CamScanner

عذاب ختم ہو۔ اگر میں سارے ڈالر جلادوں تو؟ ان کی بے چینی قابل دید ہوگی! اور اگر سارے کمرے ہی کو آگ لگادوں؟ یہ مشکل ہوگا۔ لیکن یہ حکم ہے۔ دیر کرنے کی گنجائش نہیں۔ فوراً۔ کھڑے ہوکر ہر ایک کو کئی کئی چانٹے رسید کروں۔ انھیں چاہیے کہ روئیں دھوئیں اور گھٹنوں کے بل مجھ سے گڑگڑا کر التجا کریں۔ نہیں، یہ میں نہیں ہوں، یہ کوئی اور ہے۔ مجھے کسی کو گھٹنوں کے بل عاجزی کرتے دیکھنے سے نفرت ہے۔ چوتڑوں یا پیڑو پر لات مارو! خصیوں پر لات بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بیک وقت ایک شدید اور گھٹا گھٹا درد اٹھتا ہے۔ سب کے سب دوہرے ہوجائیں گے، مدد کے لیے چلّانے لگیں گے۔ میں موقعے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلوں گا اور ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑتا جاؤں گا، خوب چیخوں چلّاؤں گا، گانے گاؤں گا، ڈالر پرزے پرزے کرکے سمندری بگلوں کو کھلاؤں گا۔ لیکن دنیا کا یہی رنگ ہے۔ طاقت ان کے نصیب میں آتی ہے جو لاپروائی کو قابلِ تعریف صفت بنا دیتے ہیں، دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں، انھیں کسمپرسی کی موت مرنے دیتے ہیں، تسلی پائے بغیر اور سمجھے جانے سے محروم۔ اس وقت مجھے اپنے دوست 'ؤ' کا خیال آرہا ہے، جسے چند دن پہلے اسپتال کے پلنگ پر دیکھا تھا۔ زندگی اس کے اردگرد موجزن تھی، لیکن موت بھی وہیں موجود تھی۔ وہ اسے للکار رہی تھی، اور اس دوران نرس اس کے پھیپھڑوں کے ذرا نیچے نلکی لگا کر لیٹر پر لیٹر خون ملے پانی کی نکاسی کر رہی تھی۔ جب کوئی تین لیٹر سیال، جو اس کے پھیپھڑوں کو دبا کر سانس لینا دوبھر کیے دے رہا تھا، خارج ہوگیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بے حد قریبی دوست ہے لیکن دارالبیضا سے بہت دور رہتا ہے۔ میں نے سال بھر سے اسے نہیں دیکھا تھا اور جب ہم دوبارہ ملے تو اس یاس انگیز کمرے میں۔ جب میں اس کی لاعلمی میں اسے دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ موت اس کی پیشانی چھو رہی ہے اور اس کی گردن دبا رہی ہے، تو مجھے اپنی پریشانیاں کتنی بے مایہ نظر آئیں۔

یا عجب! ایک اور آدمی ایک بچے کو مار رہا ہے۔ لڑکا اپنے خرچ پر تشدد کا استعمال سیکھ رہا ہے؛ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی دن اپنے باپ حتیٰ کہ اپنی ماں پر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ کوئی بھی ٹھہر کر اس آدمی کو مارنے سے منع نہیں کر رہا۔ ہوسکتا ہے یہ اس کا اپنا بیٹا ہو، یا خادم۔ میں اپنے ہاتھ کو جنبش دیتا ہوں، گویا احتجاج کر رہا ہوں یا اپنی لاچاری کا اظہار۔ تینوں آدمی مجھے گھیرے ہوئے ہیں اور دھمکا رہے ہیں۔ میں پھر بیٹھ جاتا ہوں اور اپنے ڈالر لوٹا دینے کے لیے کہتا ہوں۔ بینکر بخوشی مجھے واپس کر دیتا ہے۔ میں انھیں

گنتا ہوں۔ دس بخت مارے نوٹ۔ میں انھیں موڑ مسل دیتا ہوں، نیچے یوں جھکتا ہوں جیسے کچھ اٹھا رہا ہوں، اور تیزی سے اپنے لائٹر سے انھیں آنچ لگا دیتا ہوں۔ تینوں میں سے ایک آدمی چلاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور ان پر زور زور سے پاؤں مارنے لگتا ہے۔ وہ چند نوٹ بچا لیتا ہے۔ میں کھڑا ہوتا ہوں، آزاد آدمی، اور اس دوران مغلظات کا طوفان تین متعفن منھوں سے ابلنے لگتا ہے۔ میں دروازے کی طرف بڑھتا ہوں اور کوئی مجھے جانے سے نہیں روکتا۔ باہر، موسم گرم ہے۔ میں اپنا کوٹ اتار دیتا ہوں، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا ہوں، اور آہستہ آہستہ چلنے لگتا ہوں، بھیڑ بھاڑ میں تحلیل ہو جاتا ہوں، جو آج صبح بڑی سرگرم ہے۔

کسی کتاب کے کردار کی طرح، میں اپنی زندگی کے ایک خاص مقام پر پہنچ گیا ہوں اور مقابلہ کرنے یا خود کو تباہ کر ڈالنے کے درمیان ڈول رہا ہوں۔ میں دوسروں کو تباہ کرنے پر قادر نہیں۔ جنگ آرائی، ایک نئے معرکے کا خیال، اس سے مجھے خوف آتا ہے۔ رہی خودکشی، تو یہ امکان کی حد میں نہیں آتی۔ یہ ایسا سوال ہے جو آدمی شاذ و نادر ہی اپنے سے کرتا ہے۔ میں اپنے اردگرد ایسے لوگوں سے ضرور واقف ہوں جو اعصابی دباؤ کا شکار ہیں، لیکن خودکشی کرنے والے نہیں۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا، ہمارا تاریخ کا استاد، ایک فرانسیسی جو لازمی فوجی خدمت کر رہا تھا، پھندا ڈال کر لٹک گیا تھا: ہم سب کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک دن اس نے ہمارا ہوم ورک دیکھ کر ہمیں لوٹایا اور کلاس کو قرینے سے مرتب کیا۔ اگلے دن ہم اس کا انتظار ہی کرتے رہے۔ میں چودہ سال کا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے آنسو نکل آئے تھے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کی بیوی نے اس سے جنسی بے وفائی کی تھی اور وہ یہ اہانت برداشت نہ کر سکا۔

میں کسی عجلت کے بغیر، زندگی کے احساس سے سرشار، معاملات کی روش سے پوری طرح آگاہ، چلتا رہتا ہوں۔ میں خود کو کسی مرطوب کال کوٹھڑی میں لے جایا جانا نہیں دیکھ پاتا، اور نہ جیل خانہ ہی میرے تصور میں آتا ہے۔ نہیں، آدمی پر واجب ہے کہ ہر چیز کا مقابلہ کرے — چلتے ہوئے، گفتگو کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، خواب دیکھتے ہوئے، تخلیق کرتے ہوئے، دیوانگی کی حد تک خود کو دھکیلتے ہوئے؛ یہ آزادی ہے، کوئی بیماری نہیں۔ لوگ مجھ سے ٹکرا جاتے ہیں اور کوئی معذرت نہیں کرتا۔ یہ بات کہ میں تھکا ماندہ آدمی نظر آتا ہوں، کسی کو میرا احترام کرنے کی تحریک نہیں دلاتی۔ مجھے معلوم

ہے کہ لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ میری روح میں جھانک کر دیکھیں کہ میں ایک اچھا انسان ہوں۔ انھیں کیا پروا، اور وہ اس میں حق بجانب ہیں۔ ح ح کے پاس تو روح نام کی کوئی شے سرے سے ہے ہی نہیں، اس کے باوجود اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ خیر مجھ سے بے ادبی تو کوئی نہیں کرتا، لیکن مجھے نظر انداز ضرور کیا جاتا ہے۔ میرا وجود ہی نہیں۔ بینک کے ان تین جنگلیوں سے مجھے یہ کہنا چاہیے تھا: ''تمھارے سامنے ایک ایسا شخص ہے جس کا وجود نہیں۔ محض فریبِ نظر۔ صرف ہَوا۔'' اس پر شاید انھوں نے مجھے ضرب لگائی ہوتی، صرف یہ بتانے کے لیے کہ میرا وجود ہے۔ لیکن مجھے اس ثبوت کی حاجت نہیں۔ اگر چاہوں تو اپنا قصہ پاک کر سکتا ہوں۔ یہ کہنا آسان ہے۔ کیا اب بھی مجھ میں اپنے بچوں کا سامنا کرنے کی ہمت ہے؟ کیا وہ مجھ پر شرمسار ہوں گے؟ میرے دائیں ہاتھ کی پشت سے وہ سفید دھبے غائب ہو گئے ہیں، لیکن میری پیشانی پر اور کانوں کے پیچھے ہنوز نکلے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں میں رخصت ہو جائیں گے۔

بھیڑ بھڑکے میں شامل ہوئے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ ایک ندا مجھ سے کہتی ہے، ''اپنی موت یہیں اختیار کرو، ابھی ابھی، اس جم غفیر کے درمیان، چوراہے پر، اس فقیر کے سامنے جو تمھیں نمناک آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، یہاں، اس حسین غیر ملکی عورت کی موجودگی میں جو نامعلوم کے عجائب اور ہیجان کے چاؤ میں یہاں آئی ہے، اپنی موت اختیار کرو اور، اگر ہو سکے، سڑک پار کرو، شہر کی حدود، حتیٰ کہ سرحد کے پار۔ دور، اتنی دور جو تمھارے امکان میں ہو، نیچے افریقہ میں اتر جاؤ، یا اوپر یورپ کی طرف رخ کرو، زندہ اور پُرعزم بنو؛ ذرا سا 'کمیشن' لینے سے تم آلودہ نہیں ہو گئے ہو، نہیں، بلکہ آلودہ اس لیے ہوئے ہو کہ تم نے خود کو جال میں پھنس جانے دیا، اور تم سایوں سے برسرِ پیکار ہو جو ہر قسم کے اخلاقی تذبذب سے آزاد ہیں؛ اچھا تو پھر خاموشی اختیار کرو اور اپنے پاتال میں جا بیٹھو، جہاں کوئی روشنی تمھاری بینائی سلب نہیں کر سکے گی۔''

ایک دوسری آواز، یقیناً نجیہ کی آواز، مجھ سے رقت کے ساتھ کہتی ہے: ''اب بھی وقت ہے کہ سارے معاملے یکسو کیے جا سکتے ہیں۔ تم غلیظ پیسے سے اپنی جان چھڑا لو گے، دوسری نوکری کر لو گے، اور ہم ایک نئی زندگی تعمیر کریں گے۔ تمھیں یقین ہے کہ تمھارے اسسٹنٹ نے تمھاری مخبری کی ہے، لیکن اگر تم اس پر ردِعمل نہیں کرتے تو وہ اس سے بھی آگے نکل جائے گا۔ آخر یہ بے حسی کہاں سے آئی

Scanned with CamScanner

ہے؟ جب ردعمل ظاہر کرنا چاہیے تو کرتے نہیں؛ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہو اور اپنی جیت کا موقع ضائع جانے دیتے ہو۔ تمھاری قسمت اب تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ ابھی وقت نکلا نہیں ہے...''

میں سینٹرل کیفے میں داخل ہوتا ہوں۔ چند لوگ ڈومینو کھیل رہے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ بچوں سے جوتے چمکواتے ہوئے بظاہر اخبار بینی کر رہے ہیں۔ میں بھی ایک اخبار اٹھا کر اس پر سرسری نظر ڈالتا ہوں۔ اس کی نگارشات رڈی ہیں، صفحات کو رڈی طور پر جوڑا گیا ہے، خبریں بھی رڈی، سب کچھ رڈی۔ میں اسے کرسی پر پھینک دیتا ہوں۔ ایک ہاتھ آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیتا ہے اور اس صفحے پر کھولتا ہے جس پر کراس ورڈ پزل ہے۔ میں چائے کا گلاس پیتا ہوں اور راہگیروں کا نظارہ کرنے لگتا ہوں۔ اس شہر میں ہنوز فقیروں کی بہتات ہے۔ یہ خشک سالی کی وجہ سے ہے؛ یہ لوگ دیہی علاقوں سے آتے ہیں۔ ''بارش کے بجائے ان کی برسات ہوتی ہے،'' بیرا مجھ سے کہتا ہے، یہ بھول جاتا ہے کہ پانچ سال پہلے وہ خود گداگر تھا۔ جوتے چمکانے والے بچے امریکی سگریٹ ایک ایک کر کے بیچتے ہیں۔ یہ پولیس کے مخبر ہوتے ہیں۔ لیکن مخبری کے لیے بہت کچھ ہوتا نہیں ہے، تاہم کون جانے، ضروری ہے کہ آدمی ہر جگہ کان کھلے رکھے۔ میں انسپکشن کمیشن کے ایک رکن کو پہچان لیتا ہوں۔ وہ جلابیہ پہنے ہوئے ایک عورت کے برابر چل رہا ہے۔ یہ اس کی بیوی یا ماں ہو سکتی ہے۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ دفتر لوٹنے کا وقت ہو گیا۔ یقیناً ح ح کو تشویش ہو رہی ہو گی۔ میں اس سے بینک والی واردات کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس کے بجائے خود اسے بات چھیڑنے دوں گا۔ اس کے دوستوں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ مجھے پتا چل جائے گا کہ وہ ان کے ساتھ ملا ہوا ہے یا نہیں۔

دفتر کی نئی سیکرٹری کافی جوش میں آئی ہوئی ہے۔ جیسے ہی مجھے دیکھتی ہے، بھاگ کر آتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ انسپکٹر واپس آئے ہیں۔ میں اسے اطمینان دلاتا ہوں۔ وہ اس وجہ سے گھبرائی ہوئی ہے کہ اس پر پرانے ٹائپ رائٹر کی چوری کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ وہ احتجاج کرتی ہے، رو پڑنے کے قریب ہے۔ ح ح یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ ڈائریکٹر سے ملنے گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی میں بیٹھتا ہوں، کمیشن کا ایک رکن، وہی چھوٹا سا گول مٹول آدمی، آ کر ایک کاغذ دستخط کرنے کے لیے دیتا ہے۔ یہ

Scanned with CamScanner

ان کی یہاں آمد کا صداقت نامہ ہے۔ کوئی گمبھیر معاملہ نہیں۔

گھنٹہ بھر بعد ڈائریکٹر مجھے بلا بھیجتا ہے۔

''تمھیں معطل کر دیا گیا ہے اور تم پر عوامی ملکیت خورد برد کرنے کا الزام ہے۔ جلد ہی عدالت تمھیں اس سے مطلع کرے گی۔ یہ میرا فرض ہے کے پہلے سے تمھیں متنبہ کر دوں اور اس موقعے پر اپنی ہمدردی کا اظہار بھی۔ تم ہمیشہ اچھے شہری رہے ہو اور ممتاز سرکاری کارکن۔ لیکن ہم سب کی اپنی اپنی کمزوریاں ہیں۔ اب تمھیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔''

''کا ہے کی قیمت؟''

''اپنے اڑیل پن کی۔ تمھیں دفتری سامان چرانے اور اسے جوطیہ کے جونا بازار میں بیچنے کا ملزم ٹھہرایا گیا ہے۔''

''یہ غلط بات ہے، ڈائریکٹر صاحب۔ میں نے جوطیہ میں کبھی کچھ نہیں بیچا۔''

''اگر تم اس سے بری ہو تو یہ تمھارے حق میں اور بھی اچھا ہے۔ بس تمھیں اتنا ہی کرنا ہے کہ اسے ثابت کر دو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن میں اس عمارت کی ہر چیز کا ذمے دار ہوں — کرسیاں، ٹائپ رائٹر، قلم، اور لوگ بھی۔ اگر مجھے مطلع کیا جاتا ہے کہ میرے کسی ماتحت نے ایک ٹائپ رائٹر بیچا ہے، تو اس پر کارروائی کرنا میرا فرض ہے۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ وہ ٹائپ رائٹر ریاست کی ملکیت ہے، عوامی ملکیت ہے، جسے ٹیکس دینے والوں کے پیسے سے خریدا گیا ہے، جس کا مطلب ہوا عوام کے پیسے سے۔''

''لیکن ٹائپ رائٹر میں نے مستعار لیا تھا، چرایا نہیں تھا۔''

''یوں ہی سہی۔ لیکن کمیشن کی نظر میں اس بات کے آنے کے بعد اسے لوٹا دینے کے لیے تمھارے پاس پورے اڑتالیس گھنٹے تھے، جبکہ انسپکٹر دو ماہ پہلے آئے تھے۔ ان سب باتوں کی وضاحت تمھیں ان سے کرنی ہوگی۔ یہ بے رحم اور خونخوار لوگ نہیں ہیں۔ اپنے ملک کے عدالتی نظام پر اعتماد کرو۔''

کاش میں یہ اعتماد کر سکتا، لیکن کھیل پہلے ہی سے طے ہو چکا ہے، اس میں دھاندلی کی جا چکی

Scanned with CamScanner

ہے۔ مجھے عبرت کی مثال بنایا جائے گا۔ اس کے لیے ایک میں ہی رہ گیا تھا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے، جیسا کہ میرے والد نے کہا ہوتا۔ تمھیں غریب ہونے کی سزا دی جا رہی ہے، اور تم غریب اس لیے ہو کہ ایماندار ہو، اور ایماندار اس لیے کہ تمھارے باپ نے تمھیں قانون کی پاسداری سکھائی ہے۔ ایک پرانا ٹائپ رائٹر، 1960 کا اولیویتی مارکہ! نوادرات جمع کرنے والوں کی دلچسپی کی چیز! یہ نفرت انگیز لوگ ہیں۔ میں ابھی اسے واپس کیے دیتا ہوں، لیکن انھیں وہ کب چاہیے؟ یہ تو محض ایک بہانہ ہے۔ میں تنفر ہو کر ڈائریکٹر سے رخصت ہوتا ہوں، لیکن مایوس نہیں۔ اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں، لیکن اپنے رویّے اور طور طریق بدلنے کا وقت جاتا رہا ہے۔ میں معطل تو ہو ہی گیا ہوں، اب اپنی ڈیسک پر لوٹنے کا کوئی جواز نہیں۔ میری ملازمت معطل ہو گئی ہے، اور میری تنخواہ بھی۔ میرے دستخط کی اب کوئی قیمت نہیں رہی۔ پہلے، اس کا قیاس ہزاروں لاکھوں میں کیا جاتا تھا۔ آج، صفر۔ اس سے کوئی دروازے نہیں کھل سکتے۔ اس لمحے سے میں ایک آزاد آدمی ہوں، ایک بالکل تازہ بتازہ نیا آدمی۔ میرے پاس چند نوٹ باقی رہ گئے ہیں۔

میں دوبارہ سڑک پر آ گیا ہوں۔ میں ایک حجام کی دکان پر رکتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میرے بال دھوئے اور شیو بنائے۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھتا ہوں اور وہ سفید چتے پہلے کی نسبت کم نمایاں نظر آتے ہیں۔ آدھی بھنووں کا بالکل سفید ہونا بڑا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ حجام اپنی دکانوں پر یہ سندنامے کیوں ٹانگتے ہیں؟ اِس حجام کا نام عمر ہے۔ اس کی شناختی تصویر پرچموں کے ایک پورے سلسلے سے گھری ہوئی ہے: ہو نہ ہو اس نے تولوز (Toulouse) کے کسی بین الاقوامی ٹورنامنٹ میں شرکت کی ہو گی۔ اسرائیل کے جھنڈے پر اس نے بڑے پھوہڑپن سے فلسطینی جھنڈا چپکا دیا ہے۔ اسرائیلی جھنڈا پیچھے سے جھانکتا ہوا صاف نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے ٹورنامنٹ میں شرکت کرنے پر لوگوں نے اسے لعن طعن کی ہو۔ ریڈیو پر یک سُرا گانا آ رہا ہے جو میری سماعت پر گراں گزرتا ہے۔ میری ڈاڑھی بناتے ہوئے وہ اپنے پیچھے کھڑے ہوئے کسی شخص سے باتیں کرتا جا رہا ہے، اور ترچھے زاویے سے اپنا کام کر رہا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ دماغ ان چیزوں سے ہٹ جائے جو اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ حجام فارغ ہو گیا ہے: میں پیسے دے کر رخصت ہوتا ہوں۔ یکبارگی ایک ہٹا کٹا اور خوش پوش آدمی میرے برابر سے گزرتا ہے، پھر مجھ پر دوبارہ نظر ڈالتا ہے۔ میں بھی اس کی طرف دیکھتا

Scanned with CamScanner

ہوں اور محسوس ہوتا ہے کہ اسے پہچانتا ہوں۔ تاج الدین، میرے پرائمری اسکول کے ماسٹر کا بیٹا۔ گفتگو میں وہی پہل کرتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو پچیس سال سے نہیں دیکھا ہے۔ پوشاک نفیس، جسم مضبوط؛ رفعت کی چھوٹ پڑ رہی ہے، مالدار۔ وہ مجھے بوسہ دیتا ہے اور سینے سے لگاتا ہے، کہتا ہے کہ مجھ سے مڈبھیڑ ہو جانے سے اسے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ مجھے تکلف سے مخاطب کرتا ہے۔ لیکن میں فوراً ہی اس سے بے تکلف انداز میں مخاطب ہوتا ہوں۔ وہ مجھے کچھ پینے کے لیے مدعو کرتا ہے اور خود ہی قہوہ خانے کا انتخاب کرتا ہے۔ ''یہاں نہیں۔ ساحل پر چلتے ہیں، ہوٹل ریاض السلام، جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

ہم ایک لیموزین گاڑی میں جا بیٹھتے ہیں اور شوفر اسے لے کر ہوا ہو جاتا ہے۔ میں اس مڈبھیڑ پر مسرور ہوں۔ میں یہ بتا کر رنگ میں بھنگ نہیں ملاؤں گا کہ ابھی ابھی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں اور مجھ پر عوامی ملکیت کے سرقے کا الزام ہے! وہ مجھے اپنی کمپنیوں کے بارے میں بتاتا ہے جو امریکہ اور انگلینڈ میں ہیں۔ اسے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ اس نے اتنی دولت صرف اپنی جبلتوں کی پیروی کر کے کھڑی کی ہے۔ میں نے بھی اپنی جبلتوں کی پیروی کی تھی، اور انھوں نے مجھے جن حالوں پر پہنچا دیا ہے وہ سامنے ہے! میں کہتا ہوں کہ جبلت کے ساتھ ساتھ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مسکراتا ہے اور اپنی انگلی پیشانی پر رکھتا ہے۔ ذہانت! ذہین تو میں بھی ہوں، لیکن میں کسی مرسیڈیز 500 میں سفر نہیں کرتا، اور وہ بھی شوفر والی۔ ہم ہوٹل کے تالاب کے برابر اپنے مشروب پیتے ہیں اور وہ مجھے اپنی مراکش چھوڑنے کے بعد کی زندگی کا قصہ سناتا ہے۔ اس نے صفر سے ابتدا کی تھی، اور اب صاحب ثروت ہے۔ امریکی بن گیا ہے، محض کاغذی طور پر نہیں، بلکہ اپنی طرزِ فکر میں۔ وہ اب مستعد کارکردگی کی بات کرتا ہے، نفع یابی کی، محنت، سنجیدگی، جوکھم، خطرات، وسائل کے انضمام کی... وہ امریکہ کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے جو مجھے ہنسا دیتی ہے، اس میں سارے ہی کلیشے در آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ کلیشے نہ ہوں۔ وہ سرمایہ کاری کے لیے وطن لوٹا ہے لیکن لوگوں کی غیر سنجیدگی کا شاکی ہے۔

''تم جانو میرا وقت قیمتی ہے،'' وہ کہتا ہے، ''اور یہاں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں، مجھے انتظار کروایا جاتا ہے۔ مراکشیوں کو احدی پن فرانسیسیوں سے ورثے میں ملا ہے۔ افسوس! پیسہ، بذاتہ،

دلچسپی کا باعث نہیں، یہ تو بس ایک علامت ہے۔ ولولہ خیز بات اس کی ملکیت نہیں، بلکہ وہ طرح طرح کے ذرائع ہیں جن سے اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ مالدار تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن پیسے سے زیادہ طاقتور ہونا، یہ سب کے بس کی بات نہیں۔ تمھیں یاد ہوگا، میں غریب تھا، میں مالدار بھی رہا ہوں، اور کئی بار میرا دیوالہ بھی نکلا ہے۔ پیسہ صرف ایک علامت ہے۔ یہاں، لوگ احمقانہ طور پر اپنی دولت کی نمائش کرتے ہیں۔ پیسے کو ہدف کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو بس ایک وسیلہ ہے، ایک علامت۔ میری بات یاد رکھو!''

کوئی گھنٹہ بھر اپنے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔

''وزارتِ ترقیات میں ملازم ہوں۔ فی الوقت علالتی رخصت پر ہوں۔ آرام کر رہا ہوں۔''

وہ مجھے طبی معائنے کے لیے اپنے ساتھ نیویارک لے چلنے کی پیشکش کرتا ہے۔ کیا مجھ سے مذاق کر رہا ہے؟ شاید نہیں۔ ایسے لوگ جنھوں نے دولت کے انبار لگا لیے ہوں، اکثر دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں؛ گویا اپنی کامیابی پر معاف کر دیے جانے کے خواہش مند ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی پیشکش قبول کرلوں اور اس کے ساتھ امریکہ جاؤں۔ اس کا سیکرٹری بن جاؤں گا، لیکن مجھے انگریزی بولنا نہیں آتا۔ افسوس! ورنہ ہمت کرلیتا۔ یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔ میں نے بھی اس علامت کے ذرہ برابر کی جستجو کی تھی؛ میرے کہاں کام آئی۔ میں جانے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں؛ وہ مجھے روک کر دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کے لیے اصرار کرتا ہے۔

''مجھے گھر والوں کو آگاہ کرنا ہوگا،'' میں کہتا ہوں۔

وہ بریف کیس سے ٹیلیفون نکال کر مجھ سے نمبر پوچھتا ہے۔

''میرے گھر فون نہیں ہے۔ تین سال پہلے عرضی دی تھی۔ لائنیں دستیاب نہیں ہیں۔''

''میں شوفر بھیج کر تمھاری بیوی کو کہلوا دیتا ہوں کہ تمھیں رکنا پڑ گیا ہے۔''

''نہیں، تکلیف نہ کرو۔''

وہ مجھے کابستان میں مدعو کرتا ہے۔ مچھلی تازہ اور ہلکی پکی ہوئی ہے، فرانسیسی وائن بڑی عمدہ ہے۔ میں بچے کی طرح کھاتا ہوں۔ سمندری غذا سے بھری پلیٹ سامنے ہو تو پھر میں دنیا و مافیہا سے

Scanned with CamScanner

غافل ہوجاتا ہوں، اپنی الجھنوں اور دکھوں سے۔ ہم شراب پیتے ہیں۔ ہنستے ہنساتے ہیں۔ اپنی بازیافتہ دوستی کے متعدد جام تجویز کرتے ہیں۔ یہ عین راحت اور سعادت ہے۔ وہ امریکہ کی باتیں کرنا چھوڑ دیتا ہے، لیکن میں اسے ابھی تک یہ نہیں بتاتا کہ مجھ پر کیا واردات گزری ہے۔ وہ مجھے متعدد ملاقاتی کارڈ دیتا ہے۔ اس کے کئی فون نمبر ہیں، فیکس نمبر، اور پتے۔ وہ ہاتھ سے ایک اور ٹیلیفون نمبر کا اضافہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

''اس نمبر پر فون کر کے تم کہیں بھی اور کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو؛ یہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ ترقی اسے کہتے ہیں، ہے نا ناقابلِ یقین بات؟ یہ ایک ذاتی نمبر ہے، اور، اس کے علاوہ، اگر اس کوڈ کا اضافہ کرو، تو کال کے اخراجات میرے ذمے۔ اچھا، تو یہ طے ہوگیا، تم مجھے فون کیا کروگے!''

میں اسے کیا بتانے کے لیے فون کروں گا؟ کہ میں پاتال کے منہ پر کھڑا ہوں، کہ مجھے خودکشی کی تحریک محسوس ہوتی ہے؟ حلیمہ اور اس بدذات ح ح کے ہاتھوں اپنی پریشانیوں اور رنج والم کی کہانی سنانے کے لیے؟ اس میں کسی علامت کا شائبہ تک نہیں! میں کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ وہ اپنے شوفر سے کہتا ہے کہ میں جہاں جانا چاہوں وہاں پہنچا دے، اور خود قیلولہ کرنے ہوٹل لوٹ جاتا ہے۔

میں پرتعیش کار میں سوار ہوتا ہوں، سگار تقریباً ختم ہوگیا ہے، اور شوفر سے کہتا ہوں کہ ساحل والی سڑک سے چلے۔ شراب اور سگریٹ کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی اور ہی دنیا میں ہوں، بادلوں میں، دارالبیضا اور اس کے دلدّروں سے کہیں دور پرے۔ میں کچھ مدہوش ہوں۔ مجھے فرحت محسوس ہورہی ہے اور جانتا ہوں کہ نشے کا اتار بڑا سخت ہوگا۔ میرا امریکی دوست اب تک خراٹے لینے لگا ہوگا جبکہ وہ طلسماتی فون نمبر اسے خواب کی گہرائیوں میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا، خواب جو سنہ پچاس کی دہائی کے قدیم شہر میں واقع ہورہا ہوگا، جب ہم گولیاں اور لٹو کھیلا کرتے تھے۔ ساحل کی سیر کے بعد میں شوفر سے اوران اسٹریٹ پر اتارنے کے لیے کہتا ہوں۔

گھر پر کوئی نہیں ہے۔ میں صوفے پر پڑ کر سو جاتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

میرا امریکی دوست بس یہاں سے گزر رہا تھا۔ اب کہیں دور ہوگا۔ میں خود بھی ہر شے سے بہت دور ہوں، اپنے دفتری کام سے، اپنی ذمے داریوں سے، اپنے ضمیر اور خود اپنے آپ سے۔ مجھے ہر چیز اجنبی نظر آتی ہے۔ اپنی ذات سے اجنبی ہونا بڑی کارآمد شے ہے۔ اس دوسرے اجنبی کی طرح، میں دن دہاڑے کوئی جرم کرسکتا ہوں اور میرا اس سے زیادہ نہیں بگڑے گا۔ سوائے اس کے کہ میری ماں ابھی تک زندہ ہے اور فاس کے قدیم شہر کے بوسیدہ گھر میں میری آمد کی متوقع ہے، جہاں ہر شے ڈھیر ہوئی جارہی ہے، جہاں گرتے ہوئے پتھروں کا انبار لگ گیا ہے۔ فاس ایک زخم ہے۔ جب کبھی میں اس شہر کی طرف رواں سڑک پر جارہا ہوتا ہوں، مجھے اپنے اندر ایک برہمی ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ میرے بچپن کے شہر کا جسم مسخ شدہ ہے اور روح واماندہ۔ یہ بس سیاحوں کے کام کا رہ گیا ہے، جو یہاں کاریگروں کو تانبے کا کام کرتے دیکھ کر عالمِ کیف میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ یہاں قرونِ وسطیٰ، یا کم از کم ماضی، میں واقع چلتی پھرتی تصویریں کھینچتے ہیں۔ میں وہاں خود کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہوں جتنا اِس وقت۔ خوش قسمتی سے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں گفتگو کرنے یا جواب دینے کا اہل نہیں۔

میں کریمہ کے کمرے میں جا کر ٹائپ رائٹر کو تلاش کرتا ہوں۔ یہ وہاں نہیں ہے۔ نہ واسط کے کمرے میں۔ یہ غائب ہوگیا ہے۔ ہوسکتا ہے حلیمہ نے پھینک دیا ہو۔ آہ — وہ بچوں سمیت لوٹ آئی ہے۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس صوفے میں گٹھڑی بنا رہتا ہوں۔ بچے مجھے بوسے دے کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ حلیمہ مجھے فکرمندی سے دیکھتی ہے۔ کہتی ہے کہ اپنے بھانجے کی ختنہ کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ میری بلا سے۔ میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ کچھ بھی ہو، مجھے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہیے۔ بولا تو سب کچھ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ مجھے ہر وقت خود پر قابو نہیں رہتا۔ بعض اوقات بلا سوچے سمجھے بڑی ہولناک باتیں کہہ جاتا ہوں اور پھر ان کے اثر کو زائل ہونے میں مہینے لگ جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ خاموش رہوں۔ یہ زیادہ دانشمندانہ، اور بعض اوقات زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ میں حلیمہ سے ٹائپ رائٹر کا پوچھتا ہوں۔ کہتی ہے کہ وہ اسے واسط کے بستر کو سہارا دینے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ پلنگ کا ایک پایہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ یاددہانی کراتی ہے کہ ٹائپ رائٹر یکسر زنگ آلود ہوگیا ہے اور کسی

Scanned with CamScanner

کام کا نہیں رہا۔ میں واسط کے کمرے میں جا کر جھک کر دیکھتا ہوں۔ ٹائپ رائٹر کے اوپر لاروس (Larousse) کی پرانی ڈکشنری رکھی ہے، جو پلنگ کو متوازن رکھنے کے لیے سہارے کا کام دے رہی ہے۔

جب میں کھڑا ہونے لگتا ہوں تو ٹائپ رائٹر کے شکم سے کاغذ کے پرزے نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں جو الفاظ سے پُر ہیں۔ میں قریب آتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ پرانی ڈکشنری اور ٹائپ رائٹر کے درمیان ایک عمودی نلکی کی شکل کا ایک شگاف پڑ گیا ہے، اور ٹائپ رائٹر اس نلکی میں سے گزرنے والے حروف کو لفظوں، حتیٰ کہ پورے پورے جملوں کی شکل میں جمع کرتا جا رہا ہے۔ یہ جادو ہے۔ میں فرش پر بیٹھ کر ان پرزوں کو جمع کرنے لگتا ہوں۔ جملے بنانے کے لیے ایک خاص ترتیب کی ضرورت ہے: ''جھینگر آنسوؤں کی لکیر میں کبھی داخل نہیں ہوتے...''؛ ''چین قریب ہے''؛ ''قصر سرخس کے بستر پر لیٹ گیا''؛ ''سورج اور بارش اسکول ماسٹر کی طربوش میں...''؛ ''ہماری تسلی کی حاجت ناقابلِ سیری ہے۔'' میں مسکرا دیتا ہوں اور ٹائپ رائٹر کو اپنی کہانیاں گھڑنے کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اسے اب واپس لوٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب، جبکہ اشیا طعنہ زنی کر رہی ہیں اور ہم سے محوِ کلام ہیں، میرے ساتھ کوئی سنگین بات نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ٹائپ رائٹر میں کسی شریر جن کا مسکن ہے اور اسی لیے انسپکٹر اسے واپس لینا چاہتے ہیں۔ کون جانے، یہ کسی دن سچ مچ کے نوٹ بنانے لگ جائے؛ ڈکشنری کو اتنا ہی کرنا ہوگا کہ کچھ نمبر اس میں ڈال دے۔ یہ سنہری حروف والا ٹائپ رائٹر بن جائے گا۔

ایک غیر معمولی غنودگی اچانک مجھ پر غالب آ گئی ہے۔ مجھے چند گھنٹوں کے لیے یہاں سے چلا جانا چاہیے، جتنی دور ممکن ہو سکے، بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے کہ آیا کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں ماندگی اور تھکن سے گرا جا رہا ہوں۔ گویا میں یہی چاہتا تھا۔ میں یہاں نہیں ہوں۔ مجھ پر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو آپ کو نظر آ رہا ہے۔ میں کوئی نہیں ہوں۔ کوئی نہ ہونا بہت آسان ہے۔ بس اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ قاہرہ یا کلکتہ چلے جائیں اور خود کو بھیڑ بھاڑ میں تحلیل کر دیں۔ وہاں میں ایسا غیر ملکی ہوں گا جو اپنی راہ گم کر بیٹھا ہو۔ لکھوکھا آدمیوں میں سے ایک، ایک بے اہمیت وجود۔ بغل میں

Scanned with CamScanner

ٹائپ رائٹر دبائے میں خود کو کلکتہ میں گم کر سکتا ہوں۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں کوئی سیلانی مراسلہ نگار ہوں، ایک صحافی جسے کسی کام پر بھیجا گیا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ مجھے سکون سے مرجانے دیں گے، فٹ پاتھ کے کسی گوشے میں۔ میں نہ پہلا ہوں گا نہ آخری۔ ایک زرد بوسیدہ سا ٹرک میری لاش اٹھالے جائے گا، جو ہنوز ٹائپ رائٹر سے چمٹی ہوگی، میری بدبختی اور میری نجات کی شے، اور ہم دونوں کو ایک مشترکہ قبر میں ڈال دے گا۔

مجھے ان حقیر بے بضاعت افسروں کا سامنا کرنا پڑے گا، ان کے سوالوں کا جواب دینا ہوگا، ان کی بات سننے کا دکھاوا کرنا پڑے گا اور ان کی تضحیک اور سفاکی کو جھیلنا پڑے گا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجھے تادیبی کمیٹی کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا یا جج کے۔ یہ انتظامیہ پر منحصر ہے۔ مجھ سے پردہ پوشی کا کام لیا جارہا ہے اور یہ مجھے معلوم ہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ مجھ پر دیانتداری کا جو بھوت سوار ہے اس کے باعث مجھے ہمیشہ آڑ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن انتظامیہ آخر کیا چاہتا ہے؟ یہ ثابت کرنا کہ وہ ایماندار ہے اور جو ریاستی مال کی چوری کرتے ہیں ان کی کھوج لگاتا ہے اور انھیں سزا دیتا ہے؟ میں چاہے دم نکلنے تک ان سے کہتا رہوں کہ یہ ٹائپ رائٹر میں نے صرف مستعار لیا تھا، یہ استعمال نہیں کیا جارہا تھا، اور کہ انھیں الٹا میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ خوامخواہ راہداری میں روڑا اٹکا رہا تھا، لیکن یہ بے نتیجہ رہے گا۔ ح ح کو کتنی بار اس سے ٹھوکر لگی تھی! ایک بار تو یہاں تک کہ اس کے پیر کی انگلی حرف A اور Z کے درمیان پھنس گئی تھی اور ان حروف نے اسے کاٹ کھایا تھا — آخر کار اس نے اسے ایک لات رسید کردی تھی۔ چلیے، انتظامیہ کے اصل مقصد کی طرف رجعت کریں: ولایہ کی سٹی کاؤنسل والوں کو اس دفتر میں میری موجودگی پسند نہیں۔ میں جدید آدمی نہیں ہوں، زمانے کا ساتھ نہیں دیتا، اور اپنے اردگرد والوں کو اس زمانے اور اس کی عنایات سے مستفیض ہونے سے باز رکھتا ہوں۔ میں ہی مشین کو رواں چلنے سے روکے ہوں۔ بظاہر اسی لیے وہ مجھے، بقول میرے طنجہ والے دوست کے، 'ریت کا ذرہ' کہتے ہیں۔ لیکن انصاف کہاں ہے؟ ٹھیک انصاف ہی کے نام پر مجھ پر آج عوامی ملکیت کو خورد برد کرنے کا الزام لگایا جارہا ہے! جب میں نجیہ کو بتاؤں گا کہ ایک دقیانوسی ٹائپ رائٹر کے باعث ریاست میری طلبی کررہی ہے تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ کہے گی کہ میں تہمت کی اصل وجہ، یعنی ایک ریاستی کارندے کی رشوت خوری پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہوں۔ خود میں

نے بھی یہی خیال کیا ہوتا۔ لیکن معاملہ یہ نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ میں اس کے بارے میں بلا تاخیر کیے اس سے بات کروں، ابھی، فوراً۔ ایک طرح کی جنونی بے صبری مجھے کھائے جا رہی ہے۔ میں ٹھنڈے پانی والے نلکے کے نیچے سر رکھ دیتا ہوں اور چند منٹ تک وہیں رہنے دیتا ہوں۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو سوچتا تھا کہ جب سر دھوتا ہوں تو اپنے افکار کو بھی دھو کر صاف کر رہا ہوتا ہوں۔ شیمپو کے استعمال سے برے تصورات اور گھناؤنے خیالات دور بھاگ جائیں گے۔ میں اس کا پوری طرح قائل تھا اور بعد میں خود کو مطمئن محسوس کرتا تھا۔ آج میں اپنے بالوں میں پانی کی خنکی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں کہ کوئی چیز یا کوئی شخص اس افراتفری کو دور بھگانے پر قادر ہو جس سے میرا سر اتنا بوجھل ہے۔

جب میں نجیہ کے گھر پہنچتا ہوں تو اسے بیٹی کو اسکول کا دیا ہوا کام کرتے ہوئے دیکھنے میں مشغول پاتا ہوں۔ میں حارج نہیں ہونا چاہتا۔ لونگ روم میں بیٹھ جاتا ہوں اور اخبار پڑھنے لگتا ہوں جو اتنی بری طرح لکھا گیا ہے کہ طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ میں اندر کے صفحوں پر متفرقات کی سرخیوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ ظاہر ہے، میرے معاملے کی خبر بھی یہیں ٹھیک بیٹھے گی۔ یہ سیاسی خبر نہیں ہے، اس کا جرائم سے بھی تعلق نہیں ہے۔ تو پھر یہ ٹھیک کیا ہے؟ معمولی سی خطا؟ تصرّفِ بے جا؟ غبن؟ رشوت؟ حقیقت میں یہ 'انتقام' زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اخبار میں ایسا کوئی زمرہ نہیں۔ اگر ہوتا تو جانے کتنے ہی قصیے اس ضمن میں درج ہونے کے قابل ہیں! کسی کو چاہیے کہ خاص ایمانداروں کی چھوٹی سی اقلیت کے لیے اخبار جاری کرے — یہ لوگ اس کے مستحق ہیں۔ کیونکہ صرف ایماندار ہونا کافی نہیں؛ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ مسلسل ثابت کرتا رہے کہ وہ چور نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی عزت اور استقامت کی مدافعت کے لیے اپنی الگ یونین یا کارپوریشن بنائیں۔ لیکن ان سے بعید نہیں کہ اس تحریک میں اپنا آدمی داخل کر دیں اور ہم سے اس کا بطور خازن انتخاب کروا دیں اور وہ ایک دن سارا مال لے کے چمپت ہو جائے! یہ ایک اور فساد ہوگا۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب ہم باہر گئے ہوئے تھے اور چور گھر میں گھس آئے تھے۔ انھوں نے کھڑکی کی سلاخیں آری چلا کر کاٹ دی تھیں، شیشے توڑ دیے تھے، اور میری والدہ کے زیورات، ریڈیو، فانوس، ٹیلیفون، حتیٰ کہ ایش ٹرے بھی لے اڑے تھے۔ جب میرے والد شکایت لکھانے

پولیس تھانے گئے تو انھیں گھنٹوں انتظار کروایا گیا۔ آنے جانے والے جب انھیں وہاں راہداری میں بنچ پر بیٹھے دیکھتے تو رحم کھا کر کہتے، ''اللہ غفور ورحیم ہے!'' جب بالآخر شکایت درج کرنے والے افسر سے ملاقات ہوئی تو ان سے ان کی زندگی کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ ان کے کاروبار، ان کے بچوں، ہر چیز کے بارے میں، چوری کے سوا ہر چیز کے بارے میں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور سپاہی سے بولے کہ شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے، کہ وہ چور نہیں ہیں بلکہ ان کے گھر چوری ہوئی ہے، اور یہ کہہ کر لوٹ آئے۔ کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی۔ جب گھر پہنچے تو ہم سے کہا، ''اس ملک میں چورا چکوں کو بچایا جاتا ہے، رشوت خوروں کو شہ دی جاتی ہے، اور ایمانداروں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے!''

میں اخبار ایک طرف ڈال دیتا ہوں۔ آخر کار نجیبہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ وہ اچھی عورت ہے۔ وہ اپنی کٹھن زندگی کو متوازن رکھنے میں کامیاب رہی ہے؛ میں اس پر تعجب کرتا ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ اس سے محبت ہے۔ وہ مجھے آسودگی بخشتی ہے، اگرچہ کبھی کبھار مجھے ہلا کر بھی رکھ دیتی ہے۔ مجھے حلیمہ کا خیال بھی آتا ہے، اس کی جوڑ توڑ کا، اس کے اوچھے پن کا۔

میں تصور کرنے لگتا ہوں اور اس کا تصور کرتا ہوں۔ مجھے بس یہی ایک کام اچھی طرح کرنا آتا ہے۔ اتنا تصور کرتا ہوں کہ دوسروں کی تکلیف مجھے محسوس ہونے لگتی ہے، میں اسے اپنی تکلیف بنالیتا ہوں، اپنے آنسوؤں کا اضافہ کرتا ہوں، اور کسی گرے ہوئے بچے کی طرح پھر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ میں حلیمہ کا تصور کرتا ہوں کہ وہ میرے بغیر ہے، ایسے شوہر سے ہمیشہ کے لیے نجات پا چکی ہے جو اسے سرفراز کرنے سے قاصر ہے، اس کی آنکھوں کو دنیا کے نظاروں سے بھرنے سے عاجز ہے۔ میں اسے الماری میں کپڑے الگ کرتے دیکھ رہا ہوں، ایک ٹوکری میں میری قمیصیں ڈال رہی ہے جن کے کالر گھس گئے ہیں، میرے دو عدد سوٹ، میری فرسودہ ٹائیاں، اور میرے جوتے جن میں کئی بار پیوند لگ چکے ہیں۔ میں تصور کرتا ہوں کہ وہ خانوں کو ہر اس چیز سے پاک کر رہی ہے جو اسے میرے وجود کی یاددہانی کرا سکے۔ میں اسے تھکا ہوا دیکھتا ہوں، روتے ہوئے، اس کا سر کپڑے سینے کی مشین کی میز سے ٹکا ہوا ہے، زندگی اور تقدیر کو کوسنے دے رہی ہے جس نے اسے ایک قابل احترام لیکن قلاش اور عزم سے تہی آدمی کی بانہوں میں لا پھینکا ہے۔ میں اسے بچوں کو اس قسم کی کوئی حماقت

Scanned with CamScanner

آمیز کہانی سناتا ہوا تصور کرتا ہوں: ''وہ ایک چڑیل کے دام میں آ گیا تھا جس نے اسے ہم سے جدا کر دیا... اب وہ مسجدوں کے سامنے کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ تمھارا باپ ایک غیر ذمے دار شخص ہے۔ وہ ایک طوائف کے پیچھے ہمیں چھوڑ گیا، جس نے اسے کوئی برا جادوئی سیال پلا دیا تھا۔ اس کی یادداشت غائب ہوگئی ہے اور وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہ سب کچھ گنوا بیٹھا ہے، اپنی ملازمت، اپنی عزت اور اپنی توقیر۔ وہ مر گیا ہے۔ یا بلکہ اگر مر چکا ہو تو یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ اگر بفرضِ محال وہ لوٹ بھی آئے، تو وہ ایک بالکل مختلف آدمی ہوگا۔ خوش قسمتی سے میری ماں اتنا بھیج دیتی ہے کہ ہماری بسر اوقات ہو جاتی ہے...''

میں اسے تصویر کے اس حصے کو کالے کپڑے سے ڈھانپتے ہوئے دیکھتا ہوں جس میں مَیں شامل ہوں، چادروں کو بدلتے ہوئے جن میں میری بو باس ہے، اُن یادوں میں تحریف کرتے ہوئے جن میں ہم خوش تھے۔ میں کچھ اس طرح بول رہا ہوں جیسے عالمِ بالا میں پہنچ گیا ہوں۔ بول رہا ہوں اور ان تصویروں پر، جنھیں اپنے سامنے صاف دیکھ رہا ہوں، اعتبار نہ کرنے پر انھیں دور بھگا رہا ہوں۔ میں اپنی ساس کو اطمینان کا سانس لیتے دیکھتا ہوں، جو ساتھ ساتھ ذہنی طور پر حساب لگا رہی ہے کہ میری غیر متوقع عدم موجودگی اسے کتنا زیرِ بار کرے گی۔ میں اسے اس کی بابت اپنے داماد سے بات کرتے دیکھتا ہوں، جو تاش کھیلتے ہوئے یوں ظاہر کرتا ہے جیسے غور سے سن رہا ہو۔ ان کی زندگیاں جمی جمائی ہیں: سہل اور گرم خیز، فاسد اور بے فکر، خود غرض اور پر مسرت۔ وہ جائیداد کی قیمتوں کے گرنے اور درہم کے استحکام کی باتیں کرتے ہیں۔ یورپ کی باتیں اور اس کی کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا، اطالوی عدالتی نظام پر کیا جنون سوار ہو گیا ہے۔ وہاں کے یہ سب صنعت کار اور سیاست دان جنھیں رشوت ستانی کے الزام میں دھڑا دھڑ احوالات کی سیر کرائی جا رہی ہے! یہ تو خودکشی کے مترادف ہے، ان میں سے ایک کہتا ہے۔ خالی خولی جھانسے بازی ہے، ایک دوسرا کہتا ہے۔ میں انھیں اپنے جسموں کے بارے میں مطمئن پاتا ہوں، جن کا وہ حتی المقدور خیال رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے میرا وجود نہیں۔ میں خاندان کا رکن نہیں ہوں۔ میں تو صرف ایسی عورت کا شوہر ہوں جو جوانی میں حماقت سے غلطی کر بیٹھی تھی، اور اب اسے اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ بس اتنا ہی ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ میں کہاں کام کرتا ہوں اور کیا کام کرتا ہوں۔ میں ایک بے بضاعت غیر اہم تنخواہ دار ہوں جو ان کے حلقۂ

نظر میں نہیں آتا۔ تو اس پرشکوہ حلقۂ نظر میں آنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ٹینس یا گولف کھیلنے لگوں، گیندیں اٹھاتا پھروں، لان کی صفائی ستھرائی کروں، خدمت گذار کی طرح مشروبات پیش کروں، کاروں کی رکھوالی کروں؟ آخر الامر وہ مجھے پیتل کا ویسا ہی بلاّ عنایت فرمادیں گے جو کاروں کے خدمتگار اپنی سرمائی وردیوں پر لگا لیتے ہیں تاکہ خود کو ان بے لائسنس بھک منگوں سے الگ کر سکیں جو ہر جگہ ہر ایک کے سامنے دستِ سوال پھیلا دیتے ہیں۔ ہاں، بالکل۔ جب کوئی بھلائی کرتے ہیں تو جتا بھی دیتے ہیں۔ دوسروں کی سبک سری کرنا ان کے لیے بڑی قدرتی بات ہے؛ یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ وہ ایک بے حیثیت آدمی کے معاملے میں خود کو ہلکان کرتے پھریں گے، ایک ایسا آدمی جو غور و فکر کرتا ہے، عمل کرتا ہے، غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے، اور زخمی جانور کی طرح ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے یا ان کے والدین نے بہت پہلے ہی سے ہر چیز کا نقشہ بنا لیا ہوتا ہے۔ اول، ہوشیار رہو، اپنے کو آڑ میں رکھو، پشت کے وار سے بچتے رہو، اور پھر، گاہے بگاہے، دائیں بائیں دیکھ سکتے ہو، جیب سے ایک آدھ سکہ تلاش کر کے زمین پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دے دو۔ بے اہم آدمیوں کے جم غفیر سے فٹ پاتھ اور گلی کوچے اَٹے پڑے ہیں۔ خدا کے خوف سے خیرات کرو، اس ڈر سے کہ کہیں تمھیں باہر کھلے میں سردی اور برسات میں کسی بنچ پر آسرا تلاش نہ کرنا پڑ جائے، کسی دن جب زندگی زندگی نہیں رہے گی، جب مشین کی چرخی میں ریت کا ایک ذرہ اٹک رہا ہوگا، لاشوں کے انبار میں جا شامل ہونے کے خوف سے، جن کے کفن چوہے کھا چکے ہوں گے، جو یومِ حساب کا لامتناہی انتظار کھینچ رہے ہوں گے۔ وہ آٹے کی بوریوں کی طرح خود کو ایک دوسرے پر پڑا ہوا دیکھتے ہیں، ان کی روحیں کوچ کر چکی ہیں لیکن ان کے کان کھلے ہوئے ہیں۔ پھر وہ اپنا نذرانہ دیتے ہیں، دو تین دعائیں پڑھتے ہیں، اور اپنی راہ ہو لیتے ہیں۔ میں صرف ان کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ اور میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے اس کے ماورا بھی دیکھتا ہوں۔ بعض اوقات میں قیاس آرائی کرتا ہوں، تصور کرتا ہوں، تھوڑا بہت اپنی طرف سے اختراع کرتا ہوں۔

کیا مجھے آئینے کی حاجت ہے جس میں یہ دیکھ سکوں کہ کیا کچھ میرا منتظر ہے؟ سب کچھ ممکن ہے۔ حلیمہ اپنا موقف بدل سکتی ہے اور دلیری سے میرا دفاع شروع کر سکتی ہے۔ کم از کم ایک بار چیزوں کا صحیح صحیح حساب کر سکتی ہے، جن کلمات کی ضرورت ہے وہ کہہ سکتی ہے، وہ اشارہ کر سکتی ہے جس

کا دیر سے انتظار ہے۔ وہ جسے ٹیلیوژن پر میلو ڈرامے دیکھنے سے عشق ہے، اپنے بے جا قصوروار ٹھہرائے گئے شوہر کو بچانے کے لیے خود بھی ایسے ہی ڈرامے میں اداکاری کر سکتی ہے۔ اور ہاں، ٹھیک ٹھیک مجھے کس چیز کا قصوروار قرار دیا جا رہا ہے؟ 'عوامی ملکیت کی خورد برد' کا! میں ایک بوسیدہ ٹائپ رائٹر مستعار لے آیا تھا جس میں مکڑی نے اپنا جال بُنا ہوا تھا۔ کیا یہ عوامی ملکیت ہے؟ انتظامیہ کی رو سے، ہاں۔ فہرست میں ٹائپ رائٹر کا وجود ہے، دفتری ساز و سامان کے مکمل کھاتے کے صفحہ 32 پر۔ ہر چیز اس کھاتے میں ہے، حتیٰ کہ اسٹیپلر، پنسل تراش، اور بلاٹنگ پیپر بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ٹائپ رائٹر مستعار لیا تھا (اسے رکھے رہنے کی میری کوئی نیت نہیں تھی!) کیونکہ یہ کوئی کام نہیں آ رہا تھا اور راہداری کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ پھر میں اس کا وجود ہی بھول گیا۔ کریمہ اسے استعمال نہیں کر رہی تھی؛ زنگ لگ جانے کے باعث اس کی کلیدیں حرکت نہیں کر رہی تھیں۔ جب تک دل نہ بھر گیا اس سے کھیلتی رہی۔ لیکن جج لوگ ان تمام تفصیلات پر ہنسیں گے، جس سے میرا مقدمہ اور بھی کمزور ہو جائے گا۔

سب جانتے ہیں کہ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ پورے بیس سال تک میں رشوت خوری اور ترغیبات کی مزاحمت اور ان کے خلاف تن تنہا اپنی پوری طاقت کے ساتھ لڑتا رہا ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں سے فقیرانہ زندگی گزروائی۔ تکلیف ہم سب نے اٹھائی، لیکن ہمارے ضمیر صاف رہے۔ دو بار دباؤ کے آگے جھک گیا۔ میں نے دو 'کمیشن' لیے۔ غلیظ پیسے کو چھوا اور سفید چتّوں کی یورش میں آ گیا۔ اب یہ چتّے زائل ہوتے جا رہے ہیں۔ پیسے نے میری انگلیاں جلا ڈالیں۔ میری زندگی کو تہہ و بالا کر ڈالا، میرے اوہام تباہ کر دیے، میری نیند غارت کر دی۔ اور اب یہاں مجھ پر خطا کاری کا الزام تراشا جا رہا ہے۔

میں ڈائریکٹر اور ح ح کو باہم وِسکی کی چسکیاں لیتے اور بیچارے بھلے آدمی مراد کی بابت گفتگو کرتے ہوئے تصور کرتا ہوں، جو دفتری سامان چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ میں انھیں اپنی ٹائیاں ڈھیلی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، اطمینان سے جسم پھیلاتے ہوئے، اور دو لڑکیوں کو بلاتے ہوئے کہ آ کر ان کے ساتھ فحش فلمیں دیکھیں۔ وہ اپنی چھوٹی سی جنسی محفلیں ح ح کے چھوٹے سے فلیٹ میں منعقد کر رہے ہیں، جہاں ہر آسائش مہیا ہے۔ ایک دن وہ مجھے وہاں لے گیا تھا، یہ دکھانے

کے لیے کہ میں کیا کچھ گنوا رہا ہوں، کہ ذرا سی لچکداری پیدا کرلوں، تھوڑی بہت موافقت پر مائل ہو جاؤں، تو کیا کچھ مل سکتا ہے۔ فرش پر دو تین فحش رسالے پڑے ہوئے تھے اور بستر کے قریب تپائی پر سو سو درہم کے نوٹوں کا انبار۔ میں انھیں اس فلیٹ میں دنیا و مافیہا سے بے فکر ہو کر مجامعت کرتے دیکھتا ہوں، فلیٹ جس کی دیواروں پر کارک سے استرکاری کی گئی ہے تاکہ شور سے ہمسایوں کے سکون میں خلل نہ پڑے۔

انھوں نے چند سودے کیے ہیں اور مالدار ہو گئے ہیں، لیکن اگر میں ان کی راہ کا روڑا نہ بنتا تو اور زیادہ مالدار ہو سکتے تھے۔ انھوں نے بس ریت کے ذرے کو جھٹک دیا ہے۔ لیکن وہ جو چاہتے تھے وہ اس ذرے کو قطعی طور پر جھٹک دینا تھا۔ چنانچہ یہ ٹائپ رائٹر کا کھٹراگ۔ میں جج کو سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، اور وہ مجھ پر ازالہ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ میرا کیا جاتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ چند ماہ کی قید کا حکم لگ جائے گا، اور وہ بھی جس کا نفاذ اچھے چال چلن پر روک دیا جائے؟ انتظامیہ کی جانب سے سرزنش؟ برطرفی کا گلابی پروانہ، اخراج، میرے شہری حقوق کی ضبطی، یعنی کسی عہدے کے لیے انتخاب لڑنے اور ووٹ دینے کی ممانعت؟ میرے خلاف کسی وقت بھی سارے آلات متحد ہو سکتے ہیں، اور وقت کا انتخاب عدالت اور اربابِ حلّ وعقد کریں گے۔ میں مشین کو مجھے کچل دینے کے لیے حرکت کرتے اور اپنی سمت میں بڑھتے ہوئے تصور کرتا ہوں۔ اگر میں یہیں بیٹھا رہوں، کچھ نہ کروں، اپنے گرد جال کے تنگ ہونے کا منتظر رہوں تو یہ سب تصور کر سکتا ہوں، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

اُس شام، میں نجیہ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ بعد میں، وہ لمبا سانس لیتی ہے اور مجھ سے کہتی ہے:

''آدمی کا معصوم ہونا ہی کافی نہیں۔ اور نہ حق پر ہونا۔ قانون اپنی پوری سختی کے ساتھ کبھی لاگو نہیں کیا جاتا۔ جب تک تمھارا قصہ رشوت دینے اور رشوت لینے والوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیتا، تب تک غیر دلچسپ ہے۔ تم نے اس معاملے میں ایک کردار انجام دیا تھا۔ تم مال واپس کر کے اس ملک کی رشوت ستانی کو عدالت میں گھسیٹ کر لا سکتے ہو۔ لیکن اس کے لیے تمھیں بڑے چوڑے اور مضبوط شانوں کی ضرورت ہوگی، تمھیں فردِ واحد سے کہیں زیادہ ہونا پڑے گا، تمھیں اور بہت کچھ

Scanned with CamScanner

درکار ہوگا... لیکن ہماری آواز سنائی نہیں دیتی، یہ بہت دور تک نہیں جاتی۔ ہمیں یہ قدرت حاصل نہیں کہ ان موٹی چمڑی والے گھمنڈی وحشیوں کے خلاف جنگ آزما ہوں جو ہمیں اپنے قہقہوں کے طوفان سے پیس دینے پر قادر ہیں۔''

پھر میں اسے اولیوتّی ٹائپ رائٹر اور لاروس ڈکشنری کے عشق کی کہانی سناتا ہوں۔ وہ ہنس دیتی ہے۔ وہ انھیں دونسلی جوڑا قرار دیتی ہے جو باہم بڑے طلسماتی کارنامے انجام دینے کا اہل ہے۔ وہ مشورہ دیتی ہے کہ مجھے اپنے بدبخت حادثات کی کتھا ٹائپ رائٹر کو سنانی چاہیے۔ اسے پورا یقین ہے کہ وہ ہمارے وقتوں کی افتاد اور ناانصافیوں کی حکایت تیار کردے گا۔ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو اس کا قائل ہوجاتا ہوں۔ ظاہر ہے، پلنگ، ڈکشنری، اور خاص طور فرانسیسی زبان کے بھاری بھرکم بوجھ کے نیچے دبا ہوا یہ ٹائپ رائٹر اس بندگلی سے فرار کی کوئی نہ کوئی راہ سجھانے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ مجھے کوشش کر دیکھنی چاہیے، پتا لگانا چاہیے کہ اس نے گزشتہ کل سے آج تک کیا کچھ اُگلا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ واسط کا ہوم ورک کررہا ہو۔

اولیوتّی اور لاروس کی محبت کی کہانی میرا خفیہ چمن ہے، میری لذت کا سرچشمہ، میرے تخیل کی پرواز، میری تفریح۔ جب سے ان کا تعلق خاطر مجھ پر منکشف ہوا ہے، میں روزانہ واسط کے کمرے کا پھیرا لگاتا ہوں، دروازے کی چٹخنی چڑھا دیتا ہوں، فرش پر بیٹھ کر رات ان دونوں نے جو لکھا ہوتا ہے اسے پڑھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ شروع میں جملے پراگندہ ہوتے تھے۔ ایسے لفظوں کا ملاپ ہوتا تھا جن سے اکثر ناقابلِ فہم فقرے مرتب ہوتے تھے۔ گاہے بگاہے ٹائپ رائٹر کے بطن سے کسی کتاب کا عنوان نکل آتا تھا۔ میں ان الفاظ کو اکٹھا کر کے جوڑتا ہوں اور ایک نظم بنالیتا ہوں:

خندہ زنی ظالم ہے
جب روح تکلیف میں ہو
جب خواہش بیتاب ہو
اور آسمان سے دھواں اٹھ رہا ہو...

کمرہ چھوڑنے سے پہلے میں ٹائپ رائٹر میں ایک سفید کاغذ ڈال کر اطمینان کرلیتا ہوں کہ وہ اچھی طرح کام کررہا ہے۔ اس راز کا کسی کو علم نہیں۔ میں اکثر اپنے سے کہتا ہوں کہ جب عجیب وغریب

Scanned with CamScanner

باتیں رونما ہوں تو انھیں بے تامل قبول کر لینا چاہیے، ان کی تفسیر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ ذہانت دنیا کو سمجھنے کا نام ہے، اپنے آپ کو حیران کر دینے اور یہ پہچاننے کی صلاحیت ہے کہ اشیا کی پیچیدگی ان کے ابہام کی وضاحت نہیں کرتی۔ وہ جو مطلق وضاحت کا مطالبہ کرتے ہیں غلطی پر ہیں اور اپنے کو وہم میں ڈالے ہوئے ہیں۔

خیر، اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں بس دنیا کا خواب ہی دیکھ سکتا ہوں، کہ اسے بدل نہیں سکتا۔ خواب دیکھنا انمل بے جوڑ مخلوقات اور اشیا کو ملا جلا کر کوئی مبتذل یا معمولی یا حیرت انگیز کہانی بُننے کے مترادف ہے۔ میں صرف شوپنہاور کے خیالات دہرا رہا ہوں، جس کے لیے ''زندگی اور خواب ایک ہی کتاب کے صفحات ہیں؛ ان صفحوں کو ترتیب وار پڑھنا زندگی ہے؛ بے ترتیب پڑھنا خواب۔''

ایک مدت تک اشیا کو ترتیب وار برتنے کا خواہشمند رہا ہوں۔ اب، اولیویتی اور لاروس کے معاشقے کی بدولت میں خوابوں اور بدنظمی پر زیادہ بھروسا کرنے لگا ہوں۔

یکبارگی مجھے تعطیل کے ان دنوں کی خاموش بے کیفی کی حسرت محسوس ہو رہی ہے جب صرف میں تھا جسے کسی بھیڑ کا ابراہیم کے بیٹے کی قربانی کی یاد میں ذبح ہونا لطف انگیز نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میرے والدین کے گھر میں ایک سادہ سی تصویر میں ایک فرشتے کو ہاتھوں میں بھیڑ اٹھائے آسمان سے اترتا اور کہن سالہ، باریش ابراہیم کی سمت میں بڑھتے ہوئے دکھایا گیا تھا، جس کا چاقو بیچارے نوجوان کے گلے پر رکھا ہوا تھا۔۔۔ اس منظر میں دل بہلاوے کی کوئی بات ہی نہیں تھی سوائے شاید فرشتے کے، جو نہ مرد تھا نہ عورت، جو آسمان میں، کچھ کچھ سُپر مین کی طرح، اڑتا پھر رہا تھا، وہ سپر مین جسے آگے چل کر ہم فلموں میں کسی بیوہ یا یتیم کا انتقام لیتا ہوا دیکھنے والے تھے۔ یہ خاموش بے کیفی ایسی ذہنی کیفیت ہے جو ایک نوع کے سکون سے مشابہ ہے، جب کرنے یا ثابت کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ہر چیز سست رفتاری سے حرکت کرتی ہے جبکہ دوسرے بڑی تیزی سے دوڑ بھاگ رہے ہوتے ہیں، ہنس رہے ہوتے ہیں، بات کرنے کے بجائے چلّا رہے ہوتے ہیں، بہت زیادہ اور بہت تیزی سے کھا رہے ہوتے ہیں، ساتھ ساتھ ہونے پر خوش ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے

ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، نفرت کرتے ہیں، اور یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے اپنی موجودگی سے اجتماعی سعادت میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔

جب میں بچہ تھا تو جا کر بالکونی میں پناہ لیتا اور ریشم کے کیڑوں کی دیکھ بھال میں لگ جاتا جنھیں جوتے کے ڈبے میں پال رہا تھا۔ صحنوں اور انگنائیوں سے خوشی منانے کی آوازیں اور بلاّ گلاّ اٹھتا رہتا، جواب کچھ مدھم اور متغیر ہو گیا ہوتا۔ اس دوران مجھ پر بے کیفی چھائی رہتی اور میں بے اہمیت دن سپنوں کے دھارے میں بہتا چلا جاتا۔

مجھے بیتے ایام کی حسرت نے آج کیوں آلیا ہے؟ میں پھر وہی بالکونی والا بچہ بن جانا چاہتا ہوں جو اپنی دنیا میں سمٹ رہا ہو، جہاں کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ ہم سب کو بچپن کی بالکونی پر اپنے گوشۂ عافیت کی حاجت ہے، جہاں ہم پہنچ سے دور ہوتے ہیں، گویا تقریباً معدوم ہوں۔

نجیہ گھر جا کر بیوی سے بات کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ درست کہہ رہی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ زمانہ ہوا کہ حلیمہ اور میرے درمیان لفظوں کا رابطہ نہیں رہا ہے۔ ایک جنگ سی چھڑی ہوئی ہے، جس نے ہمارے باہمی تعلقات کو سیندھ لگا دی ہے۔ کتنی ہی بار جی چاہا ہے کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دوں؛ اور ہر بار خود کو باز رکھا ہے۔ بہر حال، گھریلو تشدّد اکثر کمزور کا ہتھیار ہوتا ہے۔ جانتا ہوں کہ میں کچھ کمزور ہوں، تاہم مزاحمت کرتا ہوں۔ جب وہ بولتی ہے تو چلّا رہی ہوتی ہے۔ جب اپنی مدافعت کرتی ہے تو بدنیتی سے؛ وہ جھوٹ بولتی ہے اور کوسنے دیتی ہے۔ یہ سب مناسب تعلیم و تربیت کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اس کی ماں نے صرف ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کر اس کی پرورش کی ہے: اپنی خود غرضی کی تسکین کرنا اور کمزوروں کو کچل ڈالنا۔ میرا جی اس سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا؛ میری واحد مدافعت لاتعلقی ہے۔ میں اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ٹائپ رائٹر کے پیغامات کی رمز کشائی کروں گا۔ یہی میرا دل بہلاوا اور میرا راز ہوگا۔ عدالتی مشین کے سرگرم عمل ہونے سے پہلے ابھی میرے پاس چند دن باقی ہیں۔ اول تادیبی کمیٹی بیٹھے گی، اس کے بعد معاملے کو عدالت تک پہنچائے گی۔ مجھے صرف تنبیہ ہی کی گئی ہے۔

اولیوتی اور لاروس میں کل رات ضرور تو تو میں میں ہوئی ہوگی۔ الفاظ پڑھے نہیں جا رہے

اور کاغذ مڑا تڑا ہے۔ میں نیچے جھک کر دیکھتا ہوں کہ گدے کا کوئی اسپرنگ تو نہیں نکلا ہوا ہے اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں چوہوں نے اپنا خفیہ بل بنا رکھا ہے۔ چوہے کاغذ خور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈکشنری میں سوراخوں کی بھرمار ہے؛ صرف ٹائپ رائٹر ہی اس سے دلکش جملے نہیں بنا رہا ہے۔ میں دو ایک کورے کاغذ چڑھانے کی کوشش کرتا ہوں اور، واہ کیا کہنے، زود بین سخن گوئی شروع کر دیتے ہیں۔

''موسموں کے ساتھ غداری کی گئی ہے، خیالات کی کمر پر ماندگی کی گھڑیاں... خواب جنھیں اُڑی ہوئی نیند نے اس آدمی کے لیے لکھا ہے جس کا بڑھتی ہوئی دیواریں پیچھا کر رہی ہیں...''

مٹائے ہوئے لفظ، نمبروں اور نقطوں کا طومار۔ میں ٹائپ رائٹر کو ایک پرانا چینی کپڑا اڑھا دیتا ہوں اور حلیمہ اور بچوں کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے ٹیلیوژن دیکھنے لگتا ہوں۔ تصویریں ایک کے بعد ایک گزرتی رہتی ہیں لیکن میرے ذہن میں کوئی ایک بھی نہیں ٹھہرتی۔ یہ کسی نامعقول فلم کی طرح ہے جس کی ریلیں الٹی چل رہی ہوں۔ مجھے ان لاکھوں مراکشیوں کا خیال آتا ہے جو میری طرح بیٹھے ٹیلیوژن دیکھ رہے ہیں، خود سے کوئی سوال کیے بغیر پردے کی تصویروں کو جذب کر رہے ہیں۔ شاید ہمارا ٹیلیوژن اسی لیے بنا ہے۔ دراصل، میں نظر جمائے رکھتا ہوں لیکن دیکھتا کچھ نہیں۔ گارا۔ اندھیاؤ۔ ایک دوسرے میں گھستے ہوئے بے اَنت عکس۔ پھر میں اپنے محبوب مشغلے میں منہمک ہو جاتا ہوں: خیال آرائی۔ میں اپنا تصور کرتا ہوں۔ تنہا۔ نہ بیوی نہ بچے۔ حلیمہ کے بغیر، میں خود کو شادمان اور آزاد محسوس کرتا ہوں۔ کریمہ اور واسط کے بغیر، رنجیدہ۔ لیکن کیا وہ خوش ہیں؟ لڑکا زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ وہ سڑک کے کھمبے کی روشنی میں امتحانات کی تیاری کر رہا ہے: اس کی زندگی کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں۔ وہ بہت محنت کرتا ہے اور کم دستیاب ہوتا ہے۔

کریمہ سب کچھ سمجھتی ہے اور زیادہ غیر محفوظ ہے۔ اور یہ خاص اسی کی خاطر ہے جو میں گھر لوٹ آیا ہوں۔

خود عائد کردہ تنہائی خود غرضی کی سنگین قسم ہے، ایسے لوگوں کی پناہ گاہ جو اس چہل پہل سے لاتعلق ہوتے ہیں جسے ہم اکثر غلطی سے زندگی سمجھ لیتے ہیں۔ دانستہ چاہی گئی تنہائی خود کو بری طرح گرنے اور، اس سے بھی زیادہ بری طرح، رنج و محن اٹھانے سے خود کو بچائے رکھنے کے لیے پیچھے ہٹنے

Scanned with CamScanner

کا نام ہے۔ لیکن کیا آلام کے بغیر زندگی کرنے کی خواہش ایک تضاد نہیں؟ شادی کے شروع شروع میں میں زندگی، موت اور مسرت کے بارے میں اپنے خیالات میں حلیمہ کو شریک کرتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سب ایک طرح کی دیوانگی تھی۔ اس کے حساب سے ہر چیز صاف سیدھی ہے۔ تو پھر زندہ رہنے کے لیے اتنی محنت کیوں کی جائے؟ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ میری دوست، محرم و دمساز نہ رہی۔ دفتر میں بھی میں اتنا ہی تنہا ہوتا۔ کس سے بات کرتا؟ کس کو اپنی مایوسیوں میں شریک کر سکتا تھا۔ مجھے وہ شام یاد آتی ہے جب میں نے اس کو شوپنہاور کا یہ خیال پڑھ کر سنایا تھا: ''...لذت گہرائیوں میں مدفون تلخ گاد کے اوپر کی باریک پرت ہے: فرحت اسیر ہے، بہترین جذبات ایک قبیح کیڑا چھپائے ہوتے ہیں، عامیانہ پن سوگ کی فاقہ کشی ہے، عظمت شہادت ہے، گمنامی ایک قہر، عادت وہ ناگزیر طاعون جو ساری لذت کی شدت کو کم، لیکن درد کی کاٹ کو تیز تر اور شدید کر دیتا ہے۔''

مجھے ابھی تک اس پر اس کی بے ساختہ تمسخر آمیز ہنسی سنائی دیتی ہے، اور وہ اپنی مدافعت میں اپنی ماں کا شدید حقیقت پسندانہ فلسفہ دہراتی ہے: ''کمزور کے لیے زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے، ایسے غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں کی جانی چاہیے جن کی غربت ان کا کیا دھرا ہے۔ آدمی کو لڑنا آنا چاہیے۔ جھجکنے والے قابلِ افسوس نہیں، فلسفہ بگھارنے اور شاعری کرنے والوں پر ضائع کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں۔ زندگی بے رحم ہے اور آدمی کو بھی بے رحم ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے میں حسبِ ضرورت بے رحم نہیں۔ مجھے تم پر افسوس ہوا کرتا تھا، تم اتنے کھوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ میری غلطی تھی کہ افسوس کرتی تھی۔ تم جیسے لوگوں کے لیے تنہا رہنا بہتر ہے۔ وہ غائب ہو جائیں تو کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ پھر تمھارے وجود و عدم سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ تم نے تعلیم حاصل کی، ڈگریاں اکٹھی کیں، ایک کتاب خانہ جمع کر رکھا ہے جس کی اپنے بچوں سے زیادہ پروا کرتے ہو، اور دفتر میں کام کرتے ہو جہاں تمھارا ماتحت سارے فائدے بٹورتا ہے۔ تم دستخط کرتے ہو، وہ 'کمیشن' لے اڑتا ہے، خوشنما مکان بنواتا ہے، اپنی بیوی بچوں کو چھٹیاں منانے باہر لے جاتا ہے...''

مجھے اس کی آواز پسند نہیں۔ میں اس آواز کی صفت بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ درشت آواز؟ نہیں۔ بعض اوقات ناگوار طور پر اونچی ضرور ہوتی ہے، اور بعض اوقات بیٹھی بیٹھی سی۔ یہ عجیب و غریب ہے، یہ ایسی آواز ہے جو چرچراتی ہے، خراش ڈالتی ہے، اور کانوں کو زخمی کرتی ہے۔ یہ میری

کھال تک کو سرسرا دیتی ہے۔ یہ جو پہنچا رہی ہوتی ہے خود بھی اس سے متاثر ہوتی ہے، اتنی ہی ناخوشگوار جتنے وہ خیالات جن کا اظہار کرتی ہے۔ یہ بے آہنگ ہے۔ یہ ایسی آواز ہے جو اس کے مزاج سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن حلیمہ کا مزاج کیا ہے؟ ایک زمانے سے میں نے خود کو یہ سوال اٹھانے سے منع کر رکھا ہے۔ ایسی چیز کے بارے میں سوال کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے جس کے بارے میں آدمی کو پہلے سے معلوم ہو کہ بری یا ضرر رساں ہوگی؟ لوگوں کی توجہ ان کے قصور اور غلطیوں کی طرف دلانا بیکار بات ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خود میں کوئی تبدیلی لانا بدترین قسم کا عذاب ہے۔ کوئی بھی خود کو بدلنا نہیں چاہتا۔ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک صبح حلیمہ اس عزم کے ساتھ بیدار ہوگی کہ اپنا برتاؤ بدل دے گی، اپنے خیالات بدلنے کو تو خیر جانے دیجیے۔ عامیانہ پن بڑا نرم و گداز بستر ہے۔ اس کا عادی ہو جانا آسان ہے؛ اس کے اندر پُرلطف خواب آتے ہیں اور آدمی خود کو دوسروں سے بہتر اور قوی تر محسوس کرتا ہے۔ حلیمہ غلط آدمی کے پلے بندھ گئی اور اس پر برہم ہے۔ خود مجھے بھی غلط بیوی، غلط زندگی ملی ہے۔ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچا ہے اور ابھی تک نہ کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ جب میں اپنی موت کی شکل چننے کا سوچتا ہوں، میرا اپنے کو بدلنے کا ارادہ بڑی منہ زوری سے ابھر آتا ہے۔ مجھے جن حالات میں زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا ہے وہ مجھے افسوسناک معلوم ہوتے ہیں، اور جب میں اپنے جسم کو تباہ کر ڈالنے کا خیال کرتا ہوں تو ایسا نہیں ہے کہ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا، بلکہ حلیمہ کی طرح زندہ رہنا نہیں چاہتا، اپنے ماتحت اور باس کی مثال کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کیا وہ اتنی اہمیت دینے کے لائق ہیں؟ کیا ان کے قے آور عامیانہ پن کی سڑاند اس قابل ہے کہ جس کے لیے مرا جائے؟ میں خوب جانتا ہوں کہ "لذت گہرائیوں میں مدفون تلخ گاد کے اوپر کی باریک پرت ہے۔" تو پھر دوسروں کو بدلنے کی کوشش ہی کیوں کی جائے؟

مجھے نادیہ کا خیال آتا ہے، کانچ جیسی آنکھ والی لڑکی۔ میں اس عجیب مڈبھیڑ کا سوچتا ہوں، جیسے پچاس کی دہائی کی کسی بلیک اینڈ وائٹ فرانسیسی فلم کا کوئی منظر۔ اُس عورت کی زندگی میں درد کی ایک تہہ مضمر ہے۔

میں اس کا اپنے نسوانی ہم کیفیت کے طور پر تصور کرتا ہوں۔ ہمارے زخم مختلف سہی، لیکن ہمارے دکھ درد ایک ہی راہ سے ہماری روحوں تک پہنچتے ہیں۔ ہم بستری کے وقت وہ آنکھیں موند

لیتی ہے، اور خود کو آہستہ آہستہ اور مٹھاس کے ساتھ سپرد کرتی ہے۔ اسے گھٹنے سمیٹ کر میرے پہلو سے لگ جانا اور خاموشی سے رونا بھلا لگتا ہے۔ اسے جماع سے زیادہ خفیف لمس اچھا لگتا ہے۔ ''جس قدر ممکن ہو مجھے ہولے ہولے چھوتے رہو،'' وہ کہتی ہے، ''یہاں تک کہ تمھارے ہاتھ اور انگلیوں کی پوریں تھک جائیں۔ مجھے آہستہ آہستہ سہلاتے رہو، مجھے اس کی کتنی زیادہ ضرورت ہے، تم میری ہی طرح ہو، مجروح، ٹھہرو نہیں، میری جلد کو زندگی دو، میرے پھیپھڑوں کو ہوا دو۔ میرا جسم تمھارے لیے ہے، اسے شادماں کرو۔ تمھارے ہاتھ نرم اور مضبوط ہیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنے جسم کو میرے جسم کے اوپر پڑا رہنے دو۔ اپنے عضو کو میرے کولھوں کے بیچ آرام کرنے دو۔ ہلو جلو مت۔ اسے گرم ہو جانے دو۔ اپنے ہونٹ میری گردن کی پشت پر رکھ دو۔ میں تمھاری ہوں۔ میری پیٹھ کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ اپنی زندگی کو بھلا دو۔ جو میں کر رہی ہوں، وہی تم بھی کرو، اپنے ذہن کو تمام دلدّر سے پاک کر دو۔ ہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں، کیونکہ ایک دوسرے جیسے ہیں، اور مختلف بھی۔ مرد میری توہین کرتے رہے ہیں اور ایک زمانے سے میں نے ان سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ایک سال ہونے کو آ رہا ہے کہ میری جماع کی خواہش ناآسودہ رہی ہے۔ خوش قسمتی سے میں تم سے بالکل اسی طرح باتیں کر رہی ہوں جس طرح اپنے سے کرتی ہوں۔ اکثر میں نے خود کو سہلایا ہے اور لذت آمیز ندامت محسوس کی ہے۔ مجھے سہلاؤ، مجھے لذت اور صرف لذت پہنچاؤ۔ پھر میں تمھارے اوپر ہو جاؤں گی، تم اپنی آنکھیں بند کر لو گے اور میرا منھ تمھارے جسم کے چپے چپے کی پیمائی کرے گا۔ پھر میں تمھارا رس اندر اتار لوں گی اور تمھارے پہلو میں سو جاؤں گی۔ تم چلے جاؤ گے، میری نیند میں مخل ہوئے بغیر، ایک خواب کی طرح، دن کو رات کا نذرانہ۔''

رشوت نے میری ساری زندگی بدل کر رکھ دی ہے؛ اس کی وجہ سے میری نادیہ سے ملاقات ہوئی، اسی کی وجہ سے یہ مجھے میری خالہ کی لڑکی کی آغوش میں لے آئی اور ہمیشہ کے لیے حلیمہ اور اس کے ریوڑ کے بارے میں میری آنکھیں کھول دیں۔ اب شکایت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھ پر تو کوئی غلیظ رقم لینے کا شبہ بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔ وہ تو صرف ایک ازکار رفتہ ٹائپ رائٹر کا قصہ پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ شاید دفتری سامان کی چوری—— میرے معاملے میں، مستعار لینا —— ایک دستاویز پر دستخط

Scanned with CamScanner

کر کے اس کے عوض 'کمیشن' لینے اور اسے مخفی رکھنے سے زیادہ سنگین معاملہ ہے۔ سو مجھ پر آشکار ہوا کہ ح ح سالوں سے میرے دستخط بیچ رہا تھا۔ وہ ٹھیکیداروں سے معاملہ پٹا رہا تھا، جبکہ میں روح اور ضمیر کی پوری طمانیت سے بیٹھا دستخط کر رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ کیوں اس بچولیے سے خلاصی چاہتا ہے۔ وہ اپنی کجروی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے: وہ بالآخر میری استقامت کو ڈھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حلیمہ اور اس کی ماں کا دباؤ بھی اس میں شامل تھا۔ میں نے کچھ پیسہ لیا۔ دو دفعہ ثمرِ ممنوعہ کا ذائقہ چکھا۔ مجھے اس میں کسی قدر لطف بھی آیا، پھر مجھے پچھتاوے نے آلیا۔ میں نے پیچھے مڑنے کی کوشش کی، اور ٹھیک اسی وقت دام کا منھ کھٹ سے بند ہو گیا۔ ٹائپ رائٹر کا معاملہ غیر متعلق ہے۔ یہ محض ایک بہانہ ہے، ایک علامت، ایک اشارہ۔ میں اسے واپس بھی نہیں کر سکتا۔ اگر میں انھیں بتاؤں کہ ٹائپ رائٹر اور لاروس کے درمیان کیا معاملہ ہو رہا ہے تو وہ مجھے پاگل سمجھیں گے۔ میں نے اسے اپنے تک محدود رکھا ہے، اپنی فینٹسی کے لمحوں کے لیے بچا رکھا ہے۔ وہ میرا کیا حشر کریں گے؟ اگر میں نے بڑے بڑے 'کمیشن' لیے ہوتے تو معزز آدمی بن گیا ہوتا۔ لیکن اپنی رشوت خوری کے باوجود، میں چھوٹا ہی رہا۔ اور چھوٹوں کو پاؤں کے نیچے مسل دیا جاتا ہے۔

اگر مجھے جیل ہو گئی تو اپنے ساتھ اولیوتی اور لاروس کو لیتا جاؤں گا۔ میں ان کو اپنی کہانی سناؤں گا اور وہ اسے لکھ دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کو ایک غیر معمولی ناول میں ڈھال دیں گے۔ ضروری بات یہ ہے کہ میری صورتِ حال واضح ہو۔

❋

میری کہانی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کے انجام کا علم نہیں۔ جیسے جیسے واقعات رونما ہو رہے ہیں، میں لکھتا جا رہا ہوں، شاید اسی لیے یہ بیان صیغۂ حال میں ہے۔ شاید لکھتے ہوئے حقائق کوئی ان دیکھا موڑ لیں، شاید لفظ خود اسی کے حساب سے عمل کرنے لگیں۔ اگر اس کہانی کے اختتام پر میں آزاد نظر آؤں تو یہ انھیں لفظوں کی اعانت کے سبب ہو گا۔ فی الحال، میں انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے دفتر لوٹنے یا سرحد پار کرنے کا حق نہیں ہے۔ ملک سے باہر نکلنے کے لیے مجھے اپنے ڈائریکٹر کی منظوری

Scanned with CamScanner

درکار ہوگی۔ وہ مجھے ڈرا رہے ہیں، میرا امتحان لے رہے ہیں۔ یہ سارا گورکھ دھنداح کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ میں اتنا سادہ لوح جو ہوں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ بینک والوں نے مجھے کیوں ڈرایا دھمکایا اور بلیک میل کرنا چاہا تھا۔ وہ اس کے دوست ہیں، اس کے ہم ساز باز۔ ٹائپ رائٹر کا قصہ سمجھ میں آ گیا ہے۔ اس بوسیدہ شے کو مجھے ہرگز مستعار نہ لینا چاہیے تھا، جو کسی کام نہیں آ رہی تھی۔ اس طرح ح ح مجھے علامتی اشارے کر رہا ہے: ٹولی میں شامل ہو جاؤ، روڑے اٹکانا بند کرو، پیسہ بناؤ اور مجھے بھی بنانے دو، اور بھی زیادہ؛ لیکن اگر میں راست باز رہنے پر مصر رہا تو وہ اس کی قیمت مجھ سے ادا کروا کے چھوڑے گا۔ اس کے اپنے وسائل ہیں۔

میں حرکت نہیں کر رہا۔ آرام کرسی میں بیٹھا ہوا ہوں جس کے اسپرنگ میری پیٹھ اور کولھوں میں چبھتے جا رہے ہیں، اور مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ یہ ٹیلیوژن کی تصویروں کا نتیجہ ہے؛ میں پروگرام کے خاتمے تک انتظار کروں گا اور ہو سکتا ہے اس وقت میں آزاد ہو جاؤں۔ بازو اٹھانا مشکل ہو رہا ہے؛ وہ کسی وزنی چیز کی طرح واپس نیچے گر جاتا ہے، اور اتنی ہی دقت مجھے ٹانگیں ہلانے میں بھی پیش آ رہی ہے۔ میں شل ہو گیا ہوں۔ میں حلیمہ، کریمہ، اور رواسط کو پکارتا ہوں۔ میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ یہ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح ہے، کہ جب تم چیختے ہو تو کوئی نہیں سنتا کیونکہ حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہیں رہی ہوتی۔ میں سگریٹ کے ایک ٹوٹے کو لبوں تک لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ناممکن۔ ٹیلیوژن پر اب تلاوتِ قرآن کا وقت ہو رہا ہے۔ میں پردے پر آیات کو پڑھ کرتے دیکھتا ہوں۔ یہ 'سورۃ التغابن' ہے: ''وہ وہی ہے جس نے تم (سب) کو پیدا کیا، سو بعض تم میں سے کافر ہیں اور بعض تم میں سے مومن، اور اللہ تمھارے (سارے) اعمال کو دیکھ رہا ہے [...] اور جو لوگ کافر رہے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تھے، یہ لوگ دوزخی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور برا ٹھکانہ ہے۔''[6]

نجیہ کیوں آ کر مجھے نہیں بچا لیتی؟ نادیہ مدد کے لیے میری پکار کیوں نہیں سنتی؟ کیا میں 'برے ٹھکانے' پہنچ چکا ہوں؟ صرف شعلے نہیں ہیں۔ پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ مجھے قومی ترانہ سنائی دیتا ہے۔ میں سلامی دینے کے لیے اپنا بازو اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ناممکن۔ ہو نہ ہو، یہ میری ڈانوا ڈول

6 قرآن، 9,2:64؛ ترجمہ: عبدالماجد دریابادی۔

حب الوطنی ہے جو انتقام لے رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے کیلیں ٹھونک کر جامد کر دیا گیا ہے۔ تصویریں کوچ کر گئی ہیں، اب صرف دھندلے سے پیکر تراشتی ہوئی لکیریں ظاہر ہو رہی ہیں۔ میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ح ح کو اپنے سرمئی سوٹ میں دیکھ رہا ہوں۔ گمان گزرتا ہے کہ اپنے باس کو بھی پہچان رہا ہوں، وہ بھی سرمئی سوٹ پہنے ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے یہ لوگ عدالت کے کمرے میں ہیں، لیکن یہ صرف فریبِ خیال ہے۔ میں قطعی طور پر گھر میں ٹیلیوژن کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں اور اسے بند کرنے سے لاچار ہوں۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نجیہ یا نادیہ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں منتظر ہوں کہ کوئی آئے، حتیٰ کہ پولیس ہی آجائے، بس اتنا ہو کہ وہ مجھے اس کرسی سے نجات دلا دے۔ مجھے بائیں طرف کی دو پسلیوں کے درمیان ایک اسپرنگ کھسکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوسرا اسپرنگ دائیں طرف کی پسلیوں میں پھسل پڑتا ہے۔ میں پھنس کے رہ گیا ہوں۔ آہستہ آہستہ خون، پیٹ اور ٹانگوں سے ہوتا ہوا، فرش پر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگتا ہے۔ میں کرسی کے بازو کو اپنی پوری طاقت سے دباتا ہوں اور اسپرنگوں سے خود کو کھینچ کر آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تقریباً کامیاب ہوتا ہوں، لیکن پھر پیچھے گر جاتا ہوں، میرا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا ہے، تھکن سے چور۔ یہ طاقت جو مجھے نیچے دبائے ہوئے ہے، کہاں سے آگئی ہے؟ یہ خوف ہے، بزدلی ہے، غربت ہے۔ میں ساری زندگی کنارے کھڑا رہا ہوں، حدِ اوسط کی جستجو میں، وہ چیز جو سب کو خوش کرتی ہے، وہ کنکنی ترجیح جو کسی کو ضرر نہیں پہنچاتی، ایک وفاق جس میں کوئی تشدد، کوئی سفاکی، کوئی جوش و ولولہ نہیں ہوتا۔ مجھے ہمیشہ فیصلے کرنے، معاملات طے کرنے میں دشواری پیش آئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی یا کوئی اور میرے بجائے فیصلے کرے۔ میں جس قدر ممکن ہو سکا، رشوت خوری کی مزاحمت کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن دباؤ کے آگے ڈھیر ہو گیا۔ اسی لیے آج میری یہ حالت ہے۔ مجھے تنازعے اور لڑائی جھگڑے پسند نہیں۔ میں حماقت کی حد تک امن پسند واقع ہوا ہوں۔ اب میں یہ جان گیا ہوں۔ کیا یہ اپنی نکتہ چینی کرنے کا وقت ہے؟ میں اکیلا ہوں، مجبور ہوں، معاشرے سے الگ تھلگ۔ شاید ٹیلیوژن کے پردے کے پیچھے حلیمہ ہے، وہاں سے میرے عذابوں کا نظارہ کر رہی ہے۔ لیکن میرے بچے کہاں ہیں؟ واسط سڑک پر بجلی کے کھمبے کی روشنی میں بیٹھا ہوگا۔ کریمہ اپنی نانی کے گھر سو رہی ہوگی۔ اور میں خود کو تھوڑی سی امید دلانے کے لیے بیٹھا

ان سب خیالوں میں محو ہوں۔ میں خواب میں ہوں۔ لیکن ایسا کیونکر ہے کہ میں خواب میں خواب دیکھ رہا ہوں، کہ میں خود کو خواب دیکھتا اور تکلیفیں اٹھاتا ہوا دیکھ رہا ہوں، اس آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے جس میں ظالم ہاتھوں نے مجھے مجبوراً ٹھونس دیا ہے، اور ایک غیر مرئی طاقت شعلوں کی آمد تک مجھے روکے ہوئے ہے؟

کچھ دیر پہلے میں نے خودکشی کے امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ خودکشی کرنے والے پر لعنت برتی ہے۔ اس کی سزا صرف جہنم ہی نہیں ہے، بلکہ مسلسل خودکشی کیے جانا۔ شریعت تو یہی کہتی ہے۔ میں اپنا اس آدمی کے قالب میں تصور کرتا ہوں جو پھندا ڈال کر خودکشی کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا ہو، اور جو بار بار یہی فعل دہرا رہا ہو، مضبوط رسّی، ایک چوکی، کہیں کوئی آنکڑا ڈھونڈتا ہوا۔ ایک ہاتھ، ہر بار ایک مختلف ہاتھ، میری طرف رسّی بڑھا رہا ہے۔ کبھی یہ حلیمہ کا ہاتھ ہوتا ہے، کبھی اس کی ماں کا۔ اور چوکی ح ح لا کر دے گا، اور یقین دلائے گا کہ بڑی مضبوط ہے۔ اور باس بتائے گا کہ آنکڑا کہاں ہے۔ یہ تمام ہاتھ مل کر چوکی پر چڑھنے میں میری مدد کریں گے، رسّی میری گردن میں ڈال کر اسے ایک موٹی سی کیل سے باندھ دیں گے۔ چوکی کو لات مار کر کھسکانے والی حلیمہ ہوگی۔ وہ یہ اپنی پوری قوت سے، بڑے تشدد کے ساتھ کرے گی۔ رسّی میری گردن کو اینٹھ دے گی اور حلیمہ آکر اطمینان کرے گی کہ میں مر گیا ہوں۔ سب سے پہلے وہ میری پتلون کی میانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھے گی کہ عضو ایستادہ ہے یا نہیں؛ بظاہر پھانسی لگے کا عضو لمحۂ مرگ میں تن جاتا ہے۔

اگلے دن میں انھیں لوگوں کے ہاتھوں اسی آزمائش سے دوبارہ گزروں گا، اتنے فرق کے ساتھ کہ اس بار کاری ضرب لگانے والا ح ح ہوگا، جو پھانسی سے ذرا پہلے حلیمہ کے ساتھ جفتی کرے گا، اور ڈائریکٹر اس منظر کی فلم اتار رہا ہوگا۔

نہیں، جہنم اس سے بھی کہیں زیادہ بدتر ہوگا۔ باقی رہی خودکشی، تو اپنی بیوی اور دشمنوں کو میں یہ تحفہ تو کبھی نہیں دینے کا۔

میں جس حالت میں ہوں، مجھے ہر چیز سے ڈر لگتا ہے، خاص طور پر مذہبی وعیدوں سے۔ مجھے چیزیں صاف نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ ایسا لمحہ نہیں جب شک میں پڑا جائے یا بغاوت کھڑی کی

جائے۔

اور یہ سب اس لیے کہ میں تھک گیا ہوں، بری طرح نڈھال ہو گیا ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے گہری نیند سو جاتا ہوں۔ میں خود کو چاند کی ساحرانہ روشنی میں عریاں پاتا ہوں، سفید زمین پر چل رہا ہوں، میرا سایہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ کبھی کبھی مجھ سے آگے نکل جاتا ہے اور بولنے لگتا ہے۔ اس کی ہر بات میری سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس کے اشاروں کنایوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ مجھے کسی شخص یا کسی چیز سے خبردار رہنے کو کہہ رہا ہے۔ مجھے ایک مکڑی چاند سے نیچے اترتی نظر آتی ہے، لیکن مجھے خوف نہیں آتا۔ میں آگے بڑھتا جاتا ہوں، تاآنکہ میرا سایہ سامنے آ کر مجھے اور آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ معاملے کا تعلق مکڑی سے ہے جو اس دنیا سے اپنی غذا کشید کرتی ہے؛ سال میں ایک مرتبہ نیچے اترتی ہے، چاند رات کو، دو چار مایوس روحوں کو دبوچ لیتی ہے، اور دن کی اولین روشنی کے ساتھ روپوش ہو جاتی ہے۔ میں اپنے سے پوچھتا ہوں: کیا تم تیار ہو؟ اور میرے بجائے میرا سایہ چلّا کر جواب دیتا ہے، ''نہیں،'' جس سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

❋

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ حلیمہ کی آواز ناخوشگوار ہے۔ لیکن میں اس کی آواز کی بلندی کا ذکر کرنا بھول گیا تھا، اتنی بلند کہ مُردوں کو جگا دینے پر قادر۔ میں اپنی عجیب نیند کی گہرائیوں میں بھی اسے سن سکتا ہوں۔ حلیمہ بولتی کہاں ہے، چنگھاڑتی ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے، دنیا میں اس کے وجود کا اپنا انداز۔ اس کی آواز کی قوت اس کو شکست دے دیتی ہے اور بعض اوقات اس کا بھانڈا اپھوڑ دیتی ہے۔ وہی مجھے آرام کرسی سے کھینچ کر نکالتی ہے۔ اٹھا کر آئینے کی طرف اچھال دیتی ہے۔ میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ یہ دھچکا اوسان خطا کر دینے والا ہے۔ میں ہاتھ اٹھا کر سر کو ٹٹولتا ہوں تو وہاں گومڑ محسوس ہوتا ہے۔ تھوڑا سا خون بھی رِس رہا ہے، لیکن میرے پاس اسے پونچھنے کی مہلت نہیں۔ اس کے غضبناک منھ سے بار بار، اور ہر بار پہلے سے زیادہ بلند، ایک گرجدار ''باہر نکلو!'' خارج ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو کہتی ہے وہ تقریباً ناقابل فہم ہے، لیکن مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسی پرانی کہانی کی جگالی ہو رہی

Scanned with CamScanner

ہے، انھیں لفظوں کا ورد ہو رہا ہے، جیسے ''نالائق، زار و نزار، قابلِ افسوس، میری زندگی برباد کرنے والا، توپ کا گولہ اور زنجیر، ناکس، کمزور، مفلس، کمینہ، بخیل، لوگوں کی خندہ زنی کا ہدف...'' گالیوں کے ہر فشار کے درمیان، اس کے باوجود کہ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور میرے اعضا شل ہو کر رہ گئے ہیں، مجھے مرناؤ کی فلم آخری آدمی یاد آ جاتی ہے،[7] جس میں ایمیل جانگز نے بڑی موثر اداکاری کی ہے، وہی اداکار جس نے فلم نیلا فرشتہ (*The Blue Angel*) میں پروفیسر کا کردار ادا کیا تھا۔ ایک آدمی ایک بڑے پر تعیش ہوٹل میں قلی گیری کرتا ہے۔ ایک روز اسے بلا وجہ نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ بیوی بچوں کو یہ بتانے سے معذور کہ نوکری جاتی رہی ہے، وہ حسبِ سابق ہر صبح وردی پہن کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی جگہ لینے والے کو کام کرتے دیکھتا رہتا ہے۔ مجھے فلم بالکل یاد نہیں رہی، لیکن اس آدمی کا پیکر جو اپنی عزتِ نفس کے پیچھے بھاگ رہا ہے، ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے، میں بھی دفتر جانے کا سوانگ کرنے لگوں۔ امید ہے کہ اتنی پستی میں نہیں جا گروں گا۔ میں انھیں آخری قہقہہ نہیں لگانے دوں گا؛ میں اپنی بیوی کو صحیح ثابت نہیں کروں گا، نہ کریمہ کو رُلاؤں گا۔

اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے میں سڑکیں ناپنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ باہر کی فضا اچھی ہے۔ میں شاہراہ کی سمت میں چل پڑتا ہوں۔ شاید واسط سے کسی کھمبے کے نیچے ملاقات ہو جائے، ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی ہے۔ میرا دل پیدل چلنے کو، تنہا ہونے اور خاموش رہنے کو چاہ رہا ہے۔ میں چاہوں تو کسی واجبی سے ہوٹل میں سادہ سا کمرہ بھی لے سکتا ہوں، ایک صاف ستھرا ہوٹل، بغیر ستاروں والا، ایک ہوٹل جس کا نام 'ٹرمینس' ہو، ویسا ہی جو ہر شہر میں ریلوے اسٹیشن کے آس پاس پایا جاتا ہے۔ لیکن میں گاڑیوں کے پٹری بدلنے کی آواز نہیں سننا چاہتا۔ میں پہیوں کی چرچراہٹ، لوہے سے لوہے کے رگڑ کھانے کا شور نہیں سننا چاہتا۔ یہ آوازیں میرے سکون میں مخل ہوں گی اور مجھے اپنی بیوی کی آواز یاد دلا دیں گی، جو حقیقت میں اب میری بیوی نہیں رہی لیکن جواب بھی سر پر سوار ہے،

---

7 جرمن فلم ساز فریڈرک وِلہلم مُرناؤ (Frederich Wilhelm Murnau)۔ انگریزی مترجم نے فلم کا نام آخری قہقہہ (*The Last Laugh*) دیا ہے لیکن اصل فرانسیسی میں عنوان *Le Dernier des hommes* یعنی آخری آدمی ہے، جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

کیونکہ میں کمزور ہوں اور اس سے سارے بندھن توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ مجھے اس کا خوف ہے کہ تحقیر اور بھی زیادہ ہوگی، اور بھی زیادہ صریح اور شرمناک۔ میرے خوف بالکل معقول نہیں ہیں۔ یہ بس ہیں، میرے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں، گردن دبوچ کر گلا گھونٹ دیتے ہیں کہ آواز بند ہو جاتی اور دم نکل جاتا ہے۔ خوف ایک مرض ہے جو باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتا ہے۔ یہ ابتدائی اسکول کے زمانے سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اگر مجھے اپنے بیٹے کو اس کا ورثہ دینا پڑ جائے تو آپے سے باہر ہو جاؤں گا۔ خیر، فی الوقت تو وہ میرے خیال میں خوف کا شکار نہیں ہے، بلکہ دلیر اور ہوشیار ہے۔ وہ ایسا بیٹا ہے جسے نشوونما پاتے ہوئے میں بمشکل ہی دیکھ سکا ہوں۔ وہ ہمیشہ سے آزادہ رو رہا ہے۔ میں اس کے بارے میں متفکر نہیں ہوں۔ میری طرح وہ بھی ایک صحتمند برہمی پال رہا ہے۔ ناانصافی قبول کرنے کا انکاری ہے اور توہین و تحقیر کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ وہ ایک بہتر دنیا کے حصول کے لیے لڑے گا۔ وہ قید و بند توڑ دینا چاہتا ہے؛ علم حاصل کرنے کا پیاسا اور آزادی کا متوالا ہے۔ معلوم نہیں آگے چل کر کیا کرے گا۔ کوئی بین الاقوامی امدادی کام کرنے کو کہہ رہا تھا، جس سے ایسے بچوں کی مدد ہو سکے جو بڑوں کی بدسلوکی کا نشانہ بنے ہوں۔ کہہ رہا تھا کہ کام کی شروعات ہمارے محلے سے کرے گا۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ اس ملک میں لوگوں نے بہت زیادہ بچے پیدا کر لیے ہیں، لیکن پھر ان کی مناسب دیکھ بھال اور پرورش نہیں کرتے۔

میں تھوڑی اور چہل قدمی کروں گا۔ بلیاں، جیسا کہ ان کی شبانہ عادت ہے، سڑک کے کنارے پھیلے کوڑے کی خاطر ایک دوسرے سے دھینگا مشتی کر رہی ہیں۔ ہر طرف سے تعفن اور غلاظت کی بو آ رہی ہے۔ کوئی شخص دیوار کے سامنے کھڑا موت رہا ہے۔ یہ کوئی نکما بھک منگا نہیں ہے۔ وہ اپنی میانی کی زِپ بند کرتا ہے، پھر سائیکل پر سوار ہو کر رات میں گم ہو جاتا ہے؛ شاید اس آدمی کا مقصدِ حیات محلے کی عمارتوں کے پتھروں پر چھڑکاؤ کرنا ہے، اور اسے ہر گلی میں جانا ہوتا ہے۔ شہر کا یہی حال ہے، غریبوں کے علاقے غلاظت سے اَٹے ہوتے ہیں اور انھیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے، اور اونچے درجے کے رہائشی علاقے صاف ستھرے اور نک سک سے درست ہوتے ہیں۔ ایک منی ٹیکسی میرے قریب آ کر رفتار گھٹا دیتی ہے۔ ڈرائیور کھڑکی سے آگے جھک کر ایک کمرے اور لڑکی کی پیشکش کرتا ہے۔ وہ مجھے کوئی سیاح سمجھ بیٹھا ہے۔ میں نا کر دیتا ہوں۔ وہ سر پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ لڑکی کا

Scanned with CamScanner

نام شہرزاد ہے اور یہ کہ وہ سیدھی الف لیلہ و لیلہ سے نکلی چلی آ رہی ہے۔ میں مسکرا دیتا ہوں۔ وہ اس کا سراپا بیان کرنے لگتا ہے: آنکھیں سمندر کی طرح بسیط، چھاتیاں آسمان کی طرح بھری بھری، لمبے لمبے بال۔۔۔ پھر مایوس ہو کر ہوا ہو جاتا ہے۔ میں اس عورت کے بارے میں سوچتا ہوں۔ وہ حقیقت میں کیسی ہوگی؟ تھل تھل یا بس عام سی؟

مجھ پر آشکار ہوتا ہے کہ اس شہر میں بہت کم عوامی باغ ہیں۔ عمارتیں تعمیر کرنے کی خاطر درخت کاٹ دیے گئے ہیں۔ اگر پیڑ پودے اور پھول پھلواری کہیں ہے تو یہ صرف جائیداد کے سٹے بازوں کے گھروں کے اردگرد۔ میں کسی بنچ پر بیٹھ کر ان سب باتوں کو سوچنے سے آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔ لیکن بنچ کہیں نہیں ہے، چنانچہ میں چلتا رہتا ہوں۔ میں اب ساحل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی ہے۔ سمندر کی آواز مجھے فرحت پہنچاتی ہے۔ میں سمندر کی کف دار سفید موجوں کے سامنے کھڑے ہو کر سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔ ایک بنچ موجود ہے، لیکن مجھے خنکی محسوس ہو رہی ہے۔ سگریٹ بڑی تیزی سے ختم ہونے لگتی ہے۔ فاصلے میں ایک کشتی چلی جا رہی ہے۔ میں پھر محوِ خرام ہو جاتا ہوں۔ میں تنہا ہونے پر بڑی طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔ اچانک مجھے ایک خوش آدمی ہونے کا مختصر لیکن بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس بڑی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ میں حقیقت سے فرار کر رہا ہوں۔ میں ہر اس شے کو جو مجھے روکے ہوئے ہے، الوداع کہتا ہوں؛ مجھے تو اب اپنے بچوں کے چہرے بھی یاد نہیں رہے۔ میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ ایک اجنبی بن گیا ہوں۔ یہ بھیانک اور بہجت انگیز احساس ہے۔ ہرچہ بادا باد! مجھے کوئی فکر نہیں۔ صوفیوں کی طرح، میں دنیا کو 'تیاگ' دے رہا ہوں۔ میں مائل پرواز ہوں۔ معدوم ہو گیا ہوں۔ میں اب اس بے درد اور عامیانہ دنیا کا حصہ نہیں رہا۔ اس کے ماورا چلا گیا ہوں۔ میرے پاؤں اب زمین کو نہیں چھو رہے اور میرا سر بادلوں میں ہے۔ میرے جسم کو ہوا اٹھائے لیے جا رہی ہے، میرے ہر طرف لفظ اور یک صوتی پیکر پھیلے ہوئے ہیں۔ میں خود کو بالکل محفوظ محسوس کر رہا ہوں اور دنیا میں لوٹ جانے کی کوئی حاجت نہیں۔

یہ شہر بازگشتوں سے بھرا ہوا ہے۔ چند بازگشتیں، فضا میں، ہوا کی لہروں پر سوار، ہمیشہ موجود ہوتی ہیں۔ میں ان کے بیچ سے، ان کی سنسناہٹ کو سنتا ہوا گزرتا ہوں۔ میں بازگشتوں کی دیوار سے جا ٹکراتا ہوں، ایک کہنہ دیوار جس میں کسی اور عہد کی آوازیں محبوس ہیں۔

Scanned with CamScanner

بڑے شہروں کی کچی آبادیوں میں عورتیں خمیدہ آئینوں کے سامنے نماز پڑھتی ہیں۔ان کی دعائیں شیشے سے ٹکرا کر راکھ ہو جاتی ہیں، ان کے گھٹنوں پر بکھرنے لگتی ہیں۔ وہ زندگی کو ایک حیران سی مدہوشی کے عالم میں محسوس کرتی ہیں، ان کے اعتقادات کی بنیاد لوبان کے دھویں پر ہوتی ہے۔ بلندی پر، جہاں میں محوِ پرواز ہوں، مجھے ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور میں ہنس دیتا ہوں۔ آسمان کچھ نہیں دیتا، بارش بھی نہیں؛ وہ ان چہروں سے خست اور لاتعلقی برتتا ہے جو اس کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ کیسی عجیب سزا ہے کہ آدمی اس حد تک صاحبِ تمیز ہو کہ معاشرے کے گھناؤنے پن کے لیے غیر متوقع جواز ڈھونڈ نکالے۔ صدی کے گھناؤنے پن، انسانوں کے گھناؤنے پن، موت کے گھناؤنے پن!

کیا رات مجھے عظیم ترین فکر سے نجات دلا رہی ہے، یا موت مجھے میرے وزنی بوجھوں سے آزاد کر رہی ہے؟

محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ٹھوس زمین پر قدم رکھنے ہی ہوں گے۔ سپیدۂ سحر نکل آیا ہے۔ روشنی نرم ہے۔ فضا ذرا سی خنک ہے۔ میں نجیبہ کے یہاں جا کر ہاتھ منھ دھوؤں گا۔ وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ کسی کی نیند میں مخل ہوئے بغیر میں نیم بستہ کھڑکی سے اندر داخل ہوتا ہوں۔ میں خوب کھولتے ہوئے اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہوں۔ خود کو مختلف محسوس کرتا ہوں، جیسے بالکل نیا آدمی۔ آئینہ دیکھتا ہوں اور بمشکل اپنے کو پہچان پاتا ہوں۔ وہ سفید چتے غائب ہو گئے ہیں؛ صرف گنے چنے میری بغلوں کے نیچے باقی ہیں۔ یہ دھچکے کے بعد ایک طرح کا انذار تھے۔ اب میں نے دھچکے اور امتحان کی طاقت توڑ دی ہے۔ میں نجیبہ کی الماری کھنگالتا ہوں جس میں وہ اپنے شوہر کے کپڑے رکھتی ہے۔ ایک دیدہ زیب سوٹ، سفید قمیص، اور بڑی انوکھی سی ٹائی مستعار لیتا ہوں۔ میں ایک نئے آدمی کے قالب میں خود کو بدلتا ہوں۔ جوتوں کو چمکاتا ہوں، وجود اور عدم کھول کر باقی ماندہ نوٹ نکالتا ہوں۔ قہوہ تیار کرتا ہوں اور نجیبہ کو لا کر دیتا ہوں۔ اپنے شوہر کے کپڑوں میں مجھے دیکھ کر وہ کچھ متعجب سی ہے؛ خوفزدہ سی، لیکن پھر مسکراتی ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں نے دفتر واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اسے مجھ پر ٹھیک سے یقین نہیں آ رہا۔ وہ کہتی ہے کہ وہ میری ماں نہیں ہے۔ میں اسے چومتا ہوں اور اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہوں۔ اس کا جسم گرم ہے۔ وہ بستر پر کھڑی ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

میں اپنا سر اس کے پیٹ پر رکھ دیتا ہوں اور اس کے ہاتھ بڑھ کر مجھ سے لپٹ جاتے ہیں۔ وہ میری طرف جھکتی ہے اور مجھے اس کے رخسار پر آنسو کا ایک قطرہ نظر آتا ہے۔ میں خود سے کہتا ہوں کہ مجھے اس کے شوہر کا سوٹ نہیں پہننا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں، مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں۔ زمانہ ہوا وہ مر چکا ہے۔ ایک نئی زندگی بغیر کسی تامل یا پچھتاوے کے شروع ہو رہی ہے۔ ٹھیک اسی لمحے مجھے اپنی موت کا خیال آجاتا ہے۔ یہ عام سی موت ہوگی۔ مجھے ان کیڑوں کا خیال آتا ہے جو میرا جگر، میرے پھیپھڑے، میرا دل چاٹ جائیں گے۔ مجھے اپنے والد کا خیال آتا ہے، جو اب قبر میں ہڈیوں کا ڈھیر ہوں گے۔ یہ سارے پیکر محض چند لمحات میں میرے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ جب میں نجیہ کے نم ہونٹ چومتا ہوں تو میرے دل میں زندہ رہنے کی بڑی شدید خواہش ابھرتی ہے۔

میں باہر آ کر دفتر جانے کے لیے ٹیکسی لیتا ہوں، اور اترنے پر ڈرائیور کو خاصی بخشش دیتا ہوں۔ شاؤش مجھے دیکھتے ہی سپاہی کی طرح اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یوں سلامی دیتا ہے جیسے میں کوئی عالی مرتبت افسر ہوں۔ ایک سیکرٹری مسکرا کے کہتی ہے، ''بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں، مسٹر مراد!''

ایک ہمکار رک کر ہاتھ ملاتا ہے۔

دفتر میں داخل ہونے پر ایک پرانا ٹائپ رائٹر فرش پر رکھا نظر آتا ہے۔ ''آپ یہ پرانا دلدّر کیوں اٹھا لائے ہیں؟'' نئی سیکرٹری پوچھتی ہے۔ ''اس قابل نہیں تھا کہ اتنی تکلیف کی جائے۔''

میں حیران رہ جاتا ہوں۔ میں کچھ واپس نہیں لایا۔ میں مسکراتا ہوں لیکن کچھ کہتا نہیں۔ میں جھک کر اسے قریب سے دیکھتا ہوں۔ یہ اولیوٹی ٹائپ رائٹر نہیں ہے، بلکہ ریمنگٹن۔ وہ سارا معاملہ محض ان لوگوں کی ملی بھگت تھی۔ میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ ڈیسک پر فائلیں سلیقے سے لگائی گئی ہیں۔ سیکرٹری آگاہ کرتی ہے کہ میری عدم موجودگی میں تعمیری اجازت ناموں کی درخواستیں دھڑا دھڑ آتی رہی ہیں۔

ح ح وارد ہوتا ہے، متبسم اور گرمجوش۔ وہ میرا بوسہ لیتا ہے، جیسا کہ مراکش میں مردوں کا دستور ہے۔ اس سے بھی بڑی خوشگوار خوشبو آ رہی ہے۔

''اچھا، تو اب طبیعت بحال ہو گئی ہے نا؟ ہفتے بھر کا آرام کیسا رہا؟ تمھیں واقعی اس کی ضرورت تھی۔ باس اور میں یہی کہہ رہے تھے، 'اسے کچھ ٹھہر جانا چاہیے، بہت کام کرتا ہے، حد سے باہر

نکل گیا تو ہمیں اس کی خدمات سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا!'''

میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وہ تبصرہ کرتا ہے کہ ٹائپ رائٹر راستے میں آ رہا ہے اور سیکرٹری سے کہتا ہے کہ اٹھا کر عقبی الماری میں رکھ دے۔

جب ہم تنہا رہ جاتے ہیں، ح ح میری طرف دیکھتا ہے، اور مسکرا کر کہتا ہے:

''قبیلے میں آنا مبارک!''

❊❊

زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی

(نظمیں)

تنویر انجم

صفحات:160

Rs.350

❄

بے یقین بستیوں میں

(نظمیں)

علی اکبر ناطق

صفحات:94

Rs.150

❄

تبادلہ

(ناول)

وبھوتی نرائن رائے

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

صفحات:219

Rs.200

❄

Scanned with CamScanner

مارگریٹ ایٹ وُڈ

عورت جسے کھایا جا سکتا ہے

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص:

فہمیدہ ریاض

Scanned with CamScanner

1

میں جانتی ہوں جب میں جمعے کی صبح اٹھی تو ٹھیک ٹھاک تھی، بلکہ عام دنوں سے زیادہ خود کو موجود محسوس کر رہی تھی۔ ناشتے کے لیے باورچی خانے میں پہنچی تو اینسلے وہاں موجود تھی، نہایت مضمحل اور نڈھال۔ اس نے کہا کہ پچھلی رات وہ ایک واہیات پارٹی میں جا پھنسی تھی۔ وہاں دندان سازی کے طالب علموں کے علاوہ دوسرا کوئی بھی نہ تھا۔ اس پر وہ اتنی مضمحل ہوئی کہ خود کو تسلی دینے کے لیے بہت زیادہ پی گئی۔

''تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ کس قدر نم آلود!'' اس نے کہا۔ ''بیس مرتبہ لوگوں کے منھ کے اندر کے بارے میں بک بک کرنا! اف! آہ! اور سننے والوں پر بس تب اثر ہوا جب میں نے یہ قصہ سنایا کہ ایک بار کس طرح میرے منھ کے اندر چھالا پڑ گیا تھا جس میں پیپ پڑ گئی تھی۔ اس پر ان کی رال ٹپکی۔ یا خدا! لوگ دانتوں کے علاوہ جسم کے کسی دوسرے حصے پر بھی تو نظر ڈالتے ہوں گے؟''

پچھلی رات کے نشے کی کسالت اس پر چھائی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری طبیعت مسرور ہوگئی۔ میں نے خود کو بے حد صحتمند محسوس کیا۔ جھٹ پٹ اس کے لیے ایک گلاس میں ٹماٹر کا رس انڈیلا۔ اس کے لیے فروٹ سالٹ بھی فوراً بنا دیا اور اس کی باتیں سنتے ہوئے ہمدردی کے ہنکارے بھرتی رہی۔

اینسلے بجلی سے چلنے والے ٹوتھ برش کی کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اسے ناقص ٹوتھ برشوں کو چیک کرنا ہوتا ہے۔ نوکری عارضی ہے۔ دراصل وہ انتظار کر رہی ہے کہ کسی آرٹ گیلری میں کوئی اسامی نکلے اور وہ ملازمت بدلے۔ آرٹ گیلریاں تنخواہ تو اچھی نہیں دیتیں، لیکن وہ مصوروں اور فنکاروں سے ملنا چاہتی ہے۔

اس نے اپنے لمبے سرخی مائل سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اینسلے کی بھنویں تو سمجھیے کہ ہیں ہی نہیں، آج ابھی تک اس نے پنسل سے بنائی نہیں تھیں۔ اس نے بھنویں چڑھائیں (بلکہ وہ جگہ

چڑھائی جہاں ماتھے پر بھنویں ہونی چاہیے تھیں)۔

''میں تو جی جان سے یہی ظاہر کیے جا رہی تھی کہ کتنی دلچسپ گفتگو ہے۔ میں نے انھیں ذرا پتا نہ لگنے دیا کہ میں کیا کام کرتی ہوں۔ یہ پروفیشنل لوگ اس کا بہت برا مانتے ہیں کہ آپ ان کے پیشے کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔ جیسے پیٹر!''

پیٹر کا حوالہ میں نے سنا ان سنا کر دیا۔ جب اینسلے کی طبیعت ٹھیک نہ ہو تو وہ پیٹر میں کیڑے ڈالنے لگتی ہے۔ وہ دونوں مل چکے ہیں اور ایک دوسرے کو پہلی ملاقات میں ناپسند کر چکے ہیں۔ اینسلے نے پیٹر کی رائے کو ''چلتی پھرتی'' کہہ کر اس کی بے عزتی کی تھی۔ پیٹر نے اس کا بدلہ فوراً لیا تھا اور اینسلے کی رائے کو ''غیر مہذب'' کہہ کر اینسلے کی بے عزتی کر دی تھی۔

مجھے دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی، میں فوراً چل دی۔ دروازہ اینسلے نے بند کیا۔ ہم شہر کے ذرا بہتر، نیم اشرافیہ علاقے کی ایک عمارت میں تیسری منزل پر رہتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری منزل سے سیڑھیاں اترتی، دروازے کے پاس پہنچی تھی کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یعنی مالکہ مکان نے اپنے درشن دے دیے۔ موٹے موٹے اودے مخمل کے پردے کے پیچھے اس کی بیچاری بچی پیانو بجا رہی تھی جیسے سزا پوری کر رہی ہو۔

مالکہ مکان بے داغ باغبانی کے دستانے پہنے تھی اور کھرپی ہاتھ میں تھی۔ (نہ جانے اتنی صبح باغ میں کسے دفنا رہی تھی۔)

''گڈ مارننگ مس میک الپائن،'' اس نے کہا۔

''گڈ مارننگ!'' میں نے کہا اور مسکرائی۔ نہ مجھے، نہ اینسلے کو کبھی اس کا نام یاد رہا۔ میں نے دروازے سے سڑک کی طرف دیکھا تاکہ وہ مجھے جانے دے، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''کل رات میں باہر گئی ہوئی تھی،'' اس نے کہا۔ مجال ہے کہ کبھی سیدھی بات کہہ دے۔ ہمیشہ بات گھما پھرا کر کہتی ہے۔ ''مجھے ایک میٹنگ میں جانا تھا۔'' میں نے اپنا وزن ایک پیر سے دوسرے پر منتقل کیا تاکہ اسے احساس دلاؤں کہ میں جلدی میں ہوں۔ ''مجھے بچی نے بتایا کہ رات دوبارہ آگ لگ گئی تھی۔''

جسے ''بچی'' کہا جا رہا ہے وہ پندرہ برس کی موٹی نوجوان لڑکی ہے۔ اب وہ بھی اس مخملی

Scanned with CamScanner

دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ میرے خیال میں لڑکی تو نارمل ہے لیکن سر پر سبز ربن کے پھول عجیب لگ رہے تھے۔

''دیکھیے، آگ تو نہیں لگی تھی،'' میں نے کہا۔

''اوں ہوں،'' مالکہ مکان نے کہا۔ ''بچی نے بتایا کہ عمارت دھویں سے بھر گئی تھی۔''

''دھواں؟'' میں نے کہا۔ ''دراصل اینسلے پورک چاپ بنا رہی تھی۔ تو دھواں...''

''اوہ!'' اس نے کہا۔ ''پلیز ان سے کہیے کہ آئندہ اتنا دھواں نہ پھیلایا کریں۔ بچی ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔''

اس طرح کی شکایتیں وہ مجھ سے ہی کرتی ہے۔ اینسلے سے بات نہیں کرتی۔ شاید وہ اسے اشرافیہ میں شمار نہیں کرتی، جبکہ میں اس کی نظر میں ''باعزت شہری'' ہو سکتی ہوں۔ فرق شاید ہمارے لباس سے پڑتا ہے۔ میرے لباس کے بارے میں اینسلے کا کہنا ہے کہ میرے کپڑے ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی خفیہ مشن پر بھیس بدل کر جا رہی ہوں اور کوشش ہے کہ کسی کی نظروں میں نہ آؤں، جبکہ اینسلے چمکدار گلابی اور اودے، بسنتی، روشنی پھینکنے والے کپڑے پہنتی ہے۔

مالکہ مکان سے جان چھڑا کر باہر نکلنے والی تھی کہ اینسلے آ پہنچی۔ میں اتنی جلدی کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔

اس نے نارنجی اور گلابی اسکرٹ پہن لی تھی، بالوں کا جوڑا بنا لیا تھا۔ کام پر جاتے ہوئے وہ جوڑا بنا لیتی ہے ورنہ اس کے گھنے گھنگھریالے سرخ بال کمر پر جھولتے رہتے ہیں۔

یہ مکان ہم دونوں نے کرائے پر لیا تھا۔ جب پہلی بار مالکہ مکان سے بات کرنے پہنچے تھے تو میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بات میں کروں گی۔ ''تم چپ بیٹھی رہنا اور معصوم لگنا...'' اینسلے کو معصوم لگنے میں شدید مہارت ہے۔ وہ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں کو پنگ پانگ کی گیندوں کی طرح گول بنا سکتی ہے۔ رنگ بالکل سرخ و سفید ہے اور چھوٹی سی ناک ہے۔ وہ بالکل، بچی یا نوعمر لڑکی نظر آنے پر قدرت رکھتی ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں مالکہ مکان نے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ ''بچی'' کی معصومیت کو مجروح کرنے والا کوئی قدم برداشت نہیں کیا جائے گا۔ بحیثیت اس کے کرایہ دار ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا

Scanned with CamScanner

نہیں، یہ براہ راست بتانا اس کے نزدیک مہذب اشرافیہ کو زیب نہیں دیتا تھا، مستقل اشارے کنائے کرتی رہتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہمیں لگتا تھا کہ ہمیں کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں۔ شراب وغیرہ کی بوتل بھی ہم یوں چھپا کر لاتے تھے جیسے سرکے یا چٹنی کی بوتل گروسری کے تھیلے میں رکھی ہے، لیکن اینسلے کا کہنا تھا کہ ہمارے پیچھے وہ ہمارے اپارٹمنٹ میں آ کر ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی ہے۔

''حد درجے کی ٹوہی ہے،'' اینسلے نے آتی ہوئی بس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خاموش راتوں میں آپ اس کے لکڑی کی دراڑوں سے تاک جھانک کرنے کی آواز سن سکتے ہیں۔''

اینسلے میری دوست کی دوست تھی۔ ہم دونوں کو مکان کی تلاش تھی، اس لیے ہم نے مل کر مکان کرائے پر لیا۔ دونوں کا گزارا ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ گھر کا آدھا کام وہ کرتی اور آدھا میں۔ خرچہ بھی آدھوں آدھ تقسیم کرتے۔

بس سے اترتے ہوئے اینسلے نے کہا، ''تین ڈالر ہوں تو دے دو۔ اسکاچ ختم ہو گئی ہے۔'' میں نے تین ڈالر دے دیے۔ خرچ تو اس کا بھی آدھوں آدھ تھا لیکن استعمال اسے اینسلے ہی زیادہ کرتی تھی۔ دس برس کی عمر میں میں نے ایک چرچ اسکول کے لیے کچھ تصویریں بنائی تھیں جن میں شراب پینے کے مضر اثرات کی عکاسی کی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ شراب کا پہلا گھونٹ لیتے ہی رنگین چاک سے بنے ہوئے ''خبردار'' کی تنبیہ دماغ میں ٹریفک لائٹ کی طرح جلنے بجھنے لگتی ہے اور زبان پر چرچ کے سادہ شربت کا ذائقہ جاگ اٹھتا ہے۔ میری یہ کمزوری پیٹر کو بھی نہیں بھاتی۔ وہ چاہتا ہے کہ میں پینے میں اس کا ساتھ دوں۔

دفتر جاتے ہوئے میں اینسلے کی ملازمت پر رشک کھاتی رہی۔ وہ ایرکنڈیشنڈ دفتر میں کام کرتی تھی۔ میرا دفتر ایک پرانی عمارت میں تھا۔ اینسلے ٹھاٹ سے کہتی، ''آج کل بی اے کے بعد اور نوکری بھی کون سی ملتی ہے۔'' مگر میں اس کا کام زیادہ بہتر کر سکتی تھی۔ اینسلے کا کام اس کے لیے عارضی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد اسے کیا کرنا ہے جبکہ میں ایسا کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

2

مسز بوگ نے مجھے بہت خوشگوار لہجے میں مخاطب کیا۔ ''میری این!'' انھوں نے نہایت محبت

Scanned with CamScanner

اور شفقت سے کہا۔ میرے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔ مسز بوگ انٹرویو لینے والے شعبے کی انچارج ہیں۔ اس محبت بھری آواز کا مطلب میں خوب سمجھتی تھی، جو اس وقت ان کے حلق سے برآمد ہوتی تھی جب وہ کسی کارکن سے ایسا کام لینا چاہتی ہوں جو اس کے فرائض سے بعید ہو، اور یہی ہوا۔

''ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ ہم اگلے ہفتے بیئر کا سروے کرنے والے ہیں۔ پتا ہے نا، کون سا؟ وہی جس میں ٹیلی فون کرنا ہوتا ہے۔ تو فیصلہ یہ ہوا ہے کہ سروے سے پہلے ایک آزمائش کر لی جائے، یعنی اس ویک اینڈ پر... کلائنٹ سوالنامے کے بارے میں کچھ پریشان ہیں۔ تم چھٹی والے دنوں میں کہیں جا تو نہیں رہیں؟''

''کیا اسی ہفتے ضروری ہے؟'' میں نے تقریباً خواہ مخواہ پوچھا۔

''ہمیں منگل تک معلومات ملنی اشد ضروری ہیں۔ تم بس سات آٹھ مردوں سے بات کر لو۔ ٹیسٹ کے لیے اتنے کافی ہوں گے۔''

میں دیر سے دفتر پہنچی تھی۔ اس غلطی نے انھیں شیر کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا، ''کل کر لوں گی۔''

''اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ تمھیں اوور ٹائم ملے گا،'' چلتے چلتے مسز بوگ نے کہا۔ کیا وہ طنز کر رہی تھیں؟ ان کی آواز اس قدر شکر یلی ہوتی ہے کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ اتنے میں ٹیلیفون بجا۔ دوسرے سرے پر جانی پہچانی آواز تھی لیکن بالکل خلافِ توقع۔

''کلارا!'' میں نے خوشی سے کہا۔ کتنے دنوں سے میں نے بیچاری کی خیریت بھی نہیں پوچھی تھی۔ ''کیسی ہو؟''

''برا حال ہے۔ پوچھنے کا شکریہ،'' کلارا نے کہا۔ پھر بولی، ''اچھا سنو، تم آج شام میرے ہاں ڈنر پر آسکتی ہو؟ میں اس چار دیواری سے باہر والا کوئی چہرہ دیکھنے کے لیے ترس رہی ہوں۔''

''کیوں نہیں! اس سے بہتر اور بھلا کیا ہو سکتا ہے!'' میں نے جس اشتیاق کا مظاہرہ کیا وہ نصف سچا بھی تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کلارا کے گھر کھانا گھر کی بکواسیات سے تو بہتر ہی ہوگا۔ ''کتنے بجے تک آجاؤں؟''

''ارے بھئی جب بھی آؤ۔ اس گھر میں ہم کوئی ایسے وقت کے پابند تو ہیں نہیں،'' اس نے تلخی سے کہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو میں آنے کا وعدہ ہی کر بیٹھی ہوں۔ میرا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اس ڈنر کا مطلب کیا ہوگا؟ کلارا اکتائی ہوئی ہے۔ ایک تو مجھے اکتاہٹ مٹانے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ایک رازدار دوست کا کردار ادا کرنے کے لیے، یعنی مجھے کلارا کے مسائل کا بیانیہ سننا ہوگا جس کے لیے میں کوئی خاص خواہش محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ''تو کیا میں... اینسلے کو بھی اپنے ساتھ لا سکتی ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''یعنی اگر وہ آج شام اور کچھ نہ کر رہی ہو ... تب۔'' میں نے خود کو تو بس یقین دلایا کہ میں چاہتی ہوں، اینسلے بھی کچھ غذائیت والی چیزیں کھا لے، صرف کافی پیتی رہتی ہے کمبخت، لیکن خفیہ طور پر میرا مقصد یہ بھی تھا کہ آنے والی شام کا تھوڑا سا بوجھ اس کے کاندھوں پر بھی منتقل کر دوں۔ وہ اور کلارا بچوں کی نفسیات پر باتیں کر لیں گی۔ اینسلے نفسیات کی گریجویٹ ہے۔

''ضرور لے آؤ۔'' کلارا نے کہا۔ ''جتنے زیادہ، اتنے خوش، ہمارا تو یہی اصول ہے۔''

میں نے اینسلے کو دفتر میں فون کیا اور احتیاط سے پوچھا کہ وہ شام کو کچھ کر تو نہیں رہی۔ اینسلے نے مجھے بتایا کہ اس نے ڈنر کی دو دعوتیں مسترد کی ہیں۔ ''ایک تو وہی ٹوتھ برش سے قتل والے مقدمے کے گواہ کی طرف سے تھا اور دوسرا دندان سازی کے ایک طالبعلم کا تھا۔ اسے تو میں نے جھڑک دیا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ پچھلی پارٹی میں اس نے کہا تھا کہ مصور آئیں گے۔ اس کی تو میں اب صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''تو پھر تم شام کو کچھ نہیں کر رہی ہو؟'' میں نے صورت حال کو یقینی بنانے کے لیے پوچھا۔

''نہیں... اگر کوئی بہتر بلاوا آ جائے تب کی بات دوسری ہے۔''

''تو پھر میرے ساتھ کلارا کے گھر کیوں نہیں چلی چلتیں؟''

میرا خیال تھا وہ احتجاج کرے گی، لیکن اس نے بالکل سکون سے یہ دعوت منظور کر لی۔ میں نے اس سے طے کر لیا کہ دفتر کے بعد دونوں سب وے اسٹیشن پر ملیں گے۔

میں تمازت اور دُھول کی سنہری دھند میں فٹ پاتھ پر سب وے اسٹیشن کی طرف چل دی۔ تقریباً ایسا لگ رہا تھا جیسے میں زیرِ آب چل رہی ہوں۔ مجھے دور سے اینسلے اپنے چمکتے لباس میں نظر آ گئی۔ جب میں اس کے پاس پہنچی تو ہم دونوں دفتری عملے کی قطاروں میں شامل ہو گئے، جو اب کام ختم کر کے اپنے اپنے گھروں یا شام کی ملاقاتوں کے لیے ایسکلیٹروں پر سوار سب وے کے

زیرِ زمیں خنک غاروں میں اتر رہے تھے۔ ٹرین آئی تو پھرتی سے ہم دو سیٹوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، گو سیٹیں ساتھ نہ مل سکیں۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے۔ حسبِ معمول میں اپنے سامنے جھولتے بدنوں کے بیچ سے سب وے کی دیواروں پر چسپاں بڑے بڑے اشتہار پڑھتی چلی گئی۔ جب ہم اپنے اسٹیشن سے باہر کھلی ہوا میں نکلے تو حبس کچھ کم تھا۔

کلارا کا گھر شمال کی طرف کچھ بلاک آگے تھا۔ ہم خاموشی سے چلتی رہیں۔ اینسلے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ نہ وہ سمجھ سکتی ہے کہ میرے مسئلے کا حل دُوسری ملازمت نہیں۔ مجھے پیٹر کا خیال آیا۔ آج مجھے اس کے ساتھ ڈنر کھانا تھا لیکن اس کے آخری کنوارے دوست نے آج شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ پیٹر کے لیے اتنا بڑا صدمہ تھا کہ اس نے اس شادی میں اکیلے ہی جانے کی ٹھان لی۔ وہ اپنا غم اکیلے جھیلنا چاہتا تھا۔ بالآخر میں نے اینسلے سے پوچھا ''اب کیسی طبیعت ہے تمھاری؟''

''افوہ! اس طرح تو مت پوچھو،'' اس نے کہا۔ ''کیا میں کوئی بیمار ہوں میری این؟''

اس جواب پر میں کچھ کٹ سی گئی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

کلارا کے گھر کی بالشت بھر لان کی گھاس کئی ہفتوں سے نہیں کٹی تھی۔ دہلیز کے پاس ایک سر کٹی گڑیا پڑی تھی اور بچے کی پرام میں اون کا بھالو تھا جس کی روئی باہر نکلی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد جو نے دروازہ کھولا۔ بال الجھے ہوئے، ہونقوں کا سا حلیہ۔ اس نے قمیض کے بٹن بند کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''ہائے جو!'' میں نے کہا۔ ''آ گئے ہم... کلارا کیسی ہے؟''

''ہائے!'' اس نے ہمیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اندر آ جاؤ، کلارا پیچھے بیٹھی ہے۔''

گھر میں فرش پر بکھری ہوئی طرح طرح کی چیزوں سے بچتے بچاتے ہم پچھلے حصے میں پہنچے جہاں دودھ کی، بیئر کی، وائن اور اسکاچ کی، غرض ہر طرح کی خالی بوتلیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ ان کے درمیان کلارا بید کی ایک گول کرسی میں بیٹھی تھی، پیر دوسری کرسی پر رکھے تھے اور تازہ ترین بچہ وہاں تھا جہاں پہلے ''گود'' ہوا کرتی تھی۔ کلارا اتنی دبلی پتلی ہے کہ حمل حد سے زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ ساتویں مہینے میں وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی سانپ نے تربوز نگل لیا ہو۔ اس حلیے میں اس کا

زرد بالوں کے حلقے میں گھرا ہوا سر تک پہلے سے چھوٹا لگ رہا تھا۔

''اوہ ہائے!'' اس نے تھکاوٹ سے کہا۔''ہیلو اینسلے! کتنا اچھا ہوا کہ تم بھی آ گئیں۔ یا خدا! کتنی گرمی ہے۔''

ہم نے اس بات سے فوری اتفاق کیا اور کلارا کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں نے اور اینسلے نے بھی جوتے اتار دیے۔ کلارا تو پہلے ہی ننگے پاؤں تھی۔

اب ہم سب بچی کو دیکھنے لگے جو ٹھنک رہی تھی۔

جب کلارا نے مجھے فون کیا تھا تو ایسا لگا تھا کہ وہ کسی سلسلے میں میری مدد چاہتی ہے، لیکن اس لمحے مجھے واضح احساس ہوا کہ میں اس کی مطلق مدد نہیں کر سکتی اور نہ اسے مدد کی توقع ہے۔ میں اس کی حالت کی محض گواہ بن سکتی تھی، یا سیاہی چوس کاغذ کی طرح اس کی بوریت کو کچھ کم کر سکتی تھی۔ شاید!

بچی نے ٹھنکنا بند کر دیا تھا۔ اب وہ عاؤں عاؤں کر رہی تھی۔ اینسلے بیٹھی گھاس کی پتیاں توڑ رہی تھی۔

کلارا نے کہا:''میری این، ذرا اسے گود میں لے لو۔ میرے بازو اب ٹوٹنے والے ہیں۔''

اینسلے نے فوراً کہا:''میں لیے لیتی ہوں۔''

کلارا نے بچی کو اپنے جسم سے علیحدہ کیا جیسے کسی چپکی ہوئی چیز کو اکھاڑتے ہیں۔''جاؤ جونک! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے اس کے ہزاروں دہانے ہیں۔ آکٹوپس کی طرح!''

اینسلے نے بے ڈھنگے پن سے بچی کو گود میں لیا اور تجسس سے اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ دونوں کے چہرے ایک دوسرے سے کتنے ملتے ہیں۔ بچی بھی اینسلے کے چہرے کو تک رہی تھی۔

''تم لوگ کچھ پیو گی؟''

''ہاں ہاں!'' ہم نے اکٹھے کہا۔

''ابھی جو باہر آتا ہے تو کہیں گے، کچھ لا دے،'' کلارا نے کہا۔''چلو باتیں کرو، کیا خبریں ہیں؟''

''کوئی خاص نہیں'' میں نے کہا اور دماغ پر زور ڈالا کہ کلارا کی طبیعت میں شگفتگی لانے کے لیے میں اس سے کیا باتیں کر سکتی ہوں۔ دفتر کا یا سیر و تفریح کا ذکر کرنے سے تو اسے اپنی موجودہ

بے حس و حرکت حالت کا زیادہ احساس ہوگا۔ اس کا سارا دن چھوٹی چھوٹی جزئیات سے نمٹنے میں گزر جاتا ہے جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

''تم ابھی اسی اچھے سے لڑکے کے ساتھ ہو، کیا نام تھا؟'' کلارا نے کہا۔

''پیٹر؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی کو کہہ رہی ہے،'' اینسلے نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''ہاں! اس نے میری این پر قبضہ کر لیا ہے۔''

اب وہ پالتی مارے بیٹھی تھی تا کہ سگریٹ سلگا سکے۔

کلارا نے کہا: ''اور لین سلانک واپس آ گیا ہے۔''

''ارے واقعی کیا؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ایک ہفتہ پہلے،'' کلارا نے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' اینسلے نے پوچھا۔

''کالج کے زمانے کا ہمارا دوست،'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تمھارے کام کا آدمی نہیں ہے۔''

کلارا نے کہا: ''وہ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ وہاں ٹیلی وژن میں چلا گیا۔ ویسے تو اچھا ہے مگر عورتوں کے لیے وہ کافی بھیانک ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو ورغلاتا ہے۔ کہتا ہے سترہ برس سے اوپر کی لڑکی اس کے لیے بڑھیا ہے۔''

اینسلے نے اپنا سگریٹ راکھ میں مسلتے ہوئے کہا: ''اچھا؟ اس قسم کے مرد کس قدر بور کرتے ہیں۔''

کلارا میں اس ذکر سے کچھ جان پڑی۔ آنکھیں چمکا کر بولی، ''تم جانو، میرے خیال میں تو وہ کسی ایسے ہی لفڑے کی وجہ سے انگلینڈ سے واپس آ گیا ہے۔ ارے بھئی، وہ ملک چھوڑ کر گیا ہی اس وجہ سے تھا۔''

''ہوں!'' میں نے بغیر کسی تعجب کے ہنکارا بھرا۔

اینسلے نے ہلکی سی چیخ مار کر بچی کو لان پر رکھ دیا۔ ''اس نے میرے اوپر پیشاب کر دیا۔'' بچی زور زور سے رونے لگی۔ میں نے اسے احتیاط سے اٹھایا اور کلارا کی گود میں دھر دیا۔ میں یقیناً مدد کرنا

Scanned with CamScanner

چاہتی تھی لیکن ایک حد تک۔

''اوہ!'' کلارا نے کہا۔'' بچے پیشاب کر دیتے ہیں۔'' وہ بچی کو گود میں جھلانے لگی۔'' گندی بچی! امی کی دوست پر دھار ماردی؟ اتنی گرمی میں ربڑ کا جانگیہ نہیں پہنانا چاہتی تھی۔ ویسے اینسلے، گھبراؤ مت۔ یہ فوراً دھل جائے گا، یعنی تمھارا ڈریس۔''

اتنے میں جو تولیہ کمر سے باندھے ہوئے باہر آیا۔ وہ برتن دھورہا ہوگا۔ اس نے کہا:'' کسی نے آرتھر کو دیکھا، کہاں ہے؟''

اب آرتھر کی ڈھنڈیا پڑی۔ جہاں دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے وہاں سے آرتھر مٹی میں لت پت برآمد ہوا۔

کلارا نے یونیورسٹی کے دوسرے برس میں جو سے شادی کی تھی۔ جو اس سے سات برس بڑا تھا اور گریجویشن کرنے والا تھا۔ دونوں میں سخت عشق تھا۔ جب آرتھر پیدا ہوا تو کلارا خوشی اور حیرت میں غرق رہی۔ دوسرا حمل اس لیے ٹھہرا کیونکہ ضبطِ تولید کے لیے کلارا صرف کیلنڈر پر بھروسا کرتی تھی، کیونکہ وہ مانعِ حمل گولیوں کے استعمال کو ناپسند کرتی تھی۔ ''میں تو اپنے جسم کے فطری ہارمون کے توازن کو اوپر نیچے کبھی نہ کروں!'' وہ کہتی۔ لہٰذا تیسرا حمل بھی ٹھہر گیا اور اس جوڑے کی یہ حالت ہوگئی۔ اب کلارا کہتی تھی، ''اس والے کے بعد میں گولیاں کھاؤں گی۔''

کھانا تیار کر کے جو نے میز پر لگا دیا۔

کلارا آرتھر کے منھ میں چمچہ بھر بھر کر ٹھونسنے کی کوشش میں لگی رہی۔ جو بچی کو جھلا جھلا کر کھانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ہم رخصت ہوئے۔

گھر پہنچ کر میں نے لین کو فون کیا۔ اس کا نمبر میں نے کلارا سے لے لیا تھا۔

''کب مل رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''جب تم کہو۔ فوراً ملو!'' لین نے خوش ہو کر کہا۔'' کلارا نے بتایا، تمھاری کوئی روم میٹ بھی ہے؟''

''ہاں، مگر تمھارے کام کی نہیں ہے،'' میں نے کہا۔

اینسلے ہمارے بڑے سے چیسٹر فیلڈ صوفے پر بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

''کیا عمر زیادہ ہے؟ تمھاری طرح؟'' وہ میری عمر کو ایک مذاق سمجھتا تھا جس پر خوب ہنسا جائے۔ میں ہنسی۔ ''کل رات ملتے ہیں۔'' مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ وہ پیٹر کا دھیان بٹانے کے لیے بہت اچھا رہے گا۔ میں نے اسے ایک ریستوران کا پتا بتا دیا۔

''تم سے ملانے میں اپنے دوست پیٹر کو بھی لاؤں گی،'' میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

اینسلے نے پوچھا،''لین تھا نا فون پر؟ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟''

میں اسے بتائے بغیر نہ رہ سکی۔ ''معمولی سا ہے۔ تمھیں اچھا نہیں لگے گا۔ بال بھورے گھنگھریالے ہیں۔ ہورن رمڈ چشمہ لگاتا ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ایسے ہی...'' اینسلے نے کہا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے اس نے پکارا،'' کچھ پیئیں؟''

''نہیں تھینکس!'' میں نے کہا۔ ''میرے لیے سادہ پانی لے آؤ۔'' اینسلے اپنے لیے اسکاچ اور برف اور میرے لیے پانی کا گلاس لیے ہوئے آئی۔ فرش پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا:

''میری این... میں تمھیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔''

اس کا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ میں پریشان ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''میرے بچہ ہونے والا ہے۔''

میں نے جلدی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ اینسلے سے حساب میں غلطی کی ایسی توقع مجھے نہیں تھی۔

''سچ کہو!'' میں نے کہا۔

اینسلے ہنسنے لگی۔ اس نے کہا،''ابھی حمل تو نہیں ٹھہرا! میرا مطلب ہے کہ میں حمل ٹھہراؤں گی۔ حاملہ ہونے کا میرا ارادہ ہے۔''

میری جان میں جان آئی لیکن میں کچھ چکرا گئی۔ میں نے کہا،''یعنی تم شادی کرنے والی ہو؟'' جہاں تک میں سمجھ پائی تھی اینسلے شادی کے سخت خلاف تھی۔

''مجھے معلوم تھا تم یہی سمجھو گی!'' اینسلے نے محظوظ ہو کر کچھ حقارت سے کہا۔''نہیں، شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ یہی تو بچوں کا مسئلہ ہے۔ ان کے والدین تعداد میں دو ہوتے ہیں۔ کلارا اور جو کے

گھر کا حال دیکھ لو۔ کیا بچے کو ایسے ماحول میں رہنا چاہیے؟ ان میں ابھی سے کتنی نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوگئی ہوں گی! اور تم نے دیکھا، کلارا آرتھر کو اپنا دودھ بھی نہیں پلاتی۔''

''اس کے دانت نکل آئے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''بچوں کے دانت نکل آئیں تو کون اپنا دودھ پلاتا ہے؟''

''یہ سب فضول کی باتیں ہیں،'' اینسلے بولی۔ ''شرط لگالو، ضرور اینسلے کے میاں نے آرتھر کا دودھ چھڑوایا ہوگا۔ جنوبی امریکہ میں مائیں کہیں زیادہ عرصے تک بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ شمالی امریکہ کے مرد ماں اور بچے کی اکائی کو بلاروک ٹوک عمل میں آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں لگتا ہے کہ ان کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب تو جو بھی بچے کو بوتل دے سکتا ہے۔ عورت کا بس چلے تو وہ جب تک ممکن ہو، بچے کو اپنا دودھ پلاتی جائے۔ میں تو یہی کروں گی۔''

مجھے محسوس ہوا کہ بحث پٹری سے اتر گئی ہے۔ ہم ایک بالکل عملی کام کے بارے میں نظریات میں الجھ چکے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اینسلے پر ذاتی حملہ کرنا چاہیے۔

''اینسلے! تم بچوں کے معاملے میں قطعی نابلد ہو۔ بچے تو تم کو خاص اچھے تک نہیں لگتے۔ میں نے تم کو یہ کہتے ہوئے خود سنا ہے کہ بچے گندے ہوتے ہیں اور بہت شور مچاتے ہیں۔''

''دوسروں کے بچے،'' اینسلے نے کہا۔ ''اپنے بچے کی دوسری بات ہوتی ہے۔''

اس امر سے میں انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اب میں حیران و پریشان ہوگئی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کے منصوبے کی مخالفت کے لیے میرے پاس کیا جواز ہے۔ میں نے حقیقت پسند رویہ اپنانے کی ٹھانی۔

''ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم بچے کا کروگی کیا؟''

اینسلے نے مجھ پر نفرت بھری نظر ڈالی۔ ''ہر عورت کے کم از کم ایک بچہ ہونا چاہیے۔''

مجھے لگا ریڈیو پر اشتہار آرہا ہے۔ ''ہر عورت کے پاس کم از کم ایک ہیئر ڈرائیر ہونا چاہیے۔''

اینسلے کہے جارہی تھی، ''بچہ ہونا سیکس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس سے عورت کی نسوانیت کی نہایت گہری تکمیل ہوتی ہے۔'' وہ انتھروپولوجی کی سستی پیپر بیک کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے کالج میں قدیم سماجوں پر کورس بھی ہوتا تھا۔

Scanned with CamScanner

''اچھا! تو کیا تم بچے کو پالو گی؟'' میں نے کہا اور کمرے پر نظر دوڑائی۔ میں سوچ رہی تھی کہ فرنیچر کو ادھر اُدھر کرنے میں کتنا وقت، توانائی اور پیسہ خرچ ہوگا۔ زیادہ تر فرنیچر میرا تھا، کچھ میرے رشتے داروں نے دیا تھا۔ صوفہ میں نے سالویشن آرمی سے خرید کر نیا کپڑا چڑھالیا تھا۔

''کیوں نہیں پالوں گی؟'' اینسلے نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''ہوں!'' میں نے کہا۔ ''مطلب یہ ہوا کہ تم ایک ناجائز بچہ پیدا کرو گی۔''

''میری این!'' اینسلے نے احتجاج کیا۔ ''تم اندر سے کتنی دقیانوسی ہو۔ یہ بورژوا اصطلاح کیوں استعمال کر رہی ہو؟ پیدائش جائز ہوتی ہے۔ یہ پورا معاشرہ اس قدر دقیانوسی ہے، اور تم بھی!''

یہ الزام سن کر میں کٹ کر رہ گئی۔ میں نے پھر ہمت کر کے کہا، ''لیکن اگر معاشرہ ایسا ہے تو بچہ اسی میں تو رہے گا۔ کیا تم خودغرضی سے کام نہیں لے رہیں؟ کیا بچہ ان تعصبات کو جھیلنے پر مجبور نہیں ہوگا؟''

''تو آخر یہ معاشرہ تبدیل اور کیونکر ہوگا؟'' اینسلے نے ایک مجاہد کی سی تمکنت سے کہا۔ ''چند افراد کو تو رہنمائی کرنی ہی پڑے گی۔ میں سب کو سچ بتاؤں گی۔ مجھے علم ہے کہ بعض حلقوں میں مجھے پریشانی کا سامنا ہوگا، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ کافی لوگ رواداری سے کام لیں گے۔''

چند لحظوں تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بنیادی نکات کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ بالآخر میں نے کہا، ''ٹھیک ہے، ظاہر ہے تم نے ہر پہلو پر غور کر لیا ہے، لیکن... ایک باپ کا بھی تو انتظام کرنا ہوگا۔ اب تم کسی پودے کی طرح کلیاں تو نکالنے سے رہیں۔''

اینسلے نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا۔ ''میں اس پر بھی غور کرتی رہی ہوں۔ باپ کو اچھے خاندان کا اور قبول صورت ہونا چاہیے، اور اتنا سمجھدار بھی کہ مجھے شادی کرنے پر مجبور کرنے کے لیے بلہ نہ اٹھائے۔''

3

دوسرے دن میں انٹرویو کے لیے چل پڑی۔ مجھے ایسے سات آٹھ مردوں کی تلاش تھی جو ہفتہ وار ایک مخصوص مقدار میں بیئر پیتے ہوں اور میرے سوالوں کا جواب دینے پر آمادہ ہوں۔ گھر کے نزدیک کی گلیاں تو ممنوع سمجھیے۔ میں اپنے پڑوسیوں سے یہ نہیں پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ ہر ہفتے کتنی بیئر

پیتے ہیں۔ یہ ویسے بھی اسکاچ کا علاقہ تھا۔ یہ لوگ مالکۂ مکان کو بھی نہ بتا دیں کہ میں شراب کے بارے میں ان سے سوال پوچھتی رہی ہوں۔ اس لیے میں بس میں بیٹھ کر دوسرے محلے میں جا پہنچی۔

میں نے پہلے دروازے کی گھنٹی بجائی اور چہرے پر کاروباری مگر دوستانہ مسکراہٹ طاری کر لی۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا، ''گڈ مارننگ،'' میں نے کہا۔ ''میں سیمور سروے کی جانب سے آئی ہوں۔ ہم ایک جائزہ مرتب کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے شوہر چند منٹ مجھ سے بات کر سکتے ہیں؟''

''کیا تم کچھ بیچ رہی ہو؟'' اس نے میرے کاغذوں اور پنسل کو گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ ہم تو مارکیٹ سروے کرتے ہیں،'' میں نے اسے یقین دلایا،'' تا کہ اشیائے فروخت کو بہتر بنایا جا سکے۔''

''سوالات کس چیز کے بارے میں ہیں؟'' عورت نے پوچھا۔

''وہ دراصل بیئر کے بارے میں ہیں،'' میں نے بتایا۔

یہ سنتے ہی عورت کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ مجھے لگا کہ وہ انکار کرنے والی ہے، لیکن کچھ توقف کے بعد اس نے میرے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

میں اس بے حد صاف ستھرے گھر میں داخل ہوگئی۔ ہر طرف فرنیچر پالش اور صفائی پوڈر کی مہک پھیلی تھی۔ عورت ایک پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔ اندر سے چپکے چپکے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ پھر کمرے سے ایک دراز قد مرد نمودار ہوا جس کے چہرے پر خشونت کے آثار تھے۔ اس کے بال بھوسلے تھے اور اتنی گرمی میں بھی اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ عورت اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''نوجوان خاتون!'' اس نے سختی سے کہا،''تم شریف معلوم ہوتی ہو اس لیے میں تمھاری تو خبر نہیں لوں گا۔ تم ایک قابلِ نفرت مقصد کے لیے ذریعے کے طور پر استعمال کی جا رہی ہو۔ مہربانی سے یہ دستاویزات اپنے مالکان کو دے دینا۔ کون جانے، ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جائے۔ شراب کی تشہیر و ترغیب خدا باپ کے احکامات کے خلاف ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے پمفلٹ لے لیے اور ہکلائی،'' ہمارا بیچنے سے تعلق نہیں۔ یہ مارکیٹ سروے...''

''ایک ہی بات ہے،'' اس نے اور بھی سختی سے کہا۔'' ایک ہی بات... جو میرے ساتھ نہیں وہ

Scanned with CamScanner

میرے خلاف ہیں۔ خدا باپ نے یہ کہا تھا۔ انسانی مصائب اور ذلت کے سوداگروں کے سیاہ چہروں پر سفیدی پوتنے کی کوشش مت کرو۔ انھیں خود بھی پڑھ لینا۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم اپنا دہن کبھی الکحل سے آلودہ نہیں کرتیں لیکن ترغیب شیطان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ شاید یہ بیج راستے میں ضائع نہ ہو اور نہ بنجر زمین پر گرے!''

یہ کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ میں بدحواس ہو کر گھر سے باہر نکلی۔ اب میرے کاغذات میں شراب کے خلاف پمفلٹ بھی شامل ہو چکے تھے۔

دو تین مکانوں سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے کاغذات پر نظر ڈالی۔ اب بھی مجھے ایک دو انٹرویوز کی ضرورت تھی۔ حالانکہ اب میں تھک گئی تھی پھر بھی، فرض شناسی کے مارے اور کسی طرح اس پورے سلسلے کو اس کے انجام تک پہنچانے کی کوشش میں میں نے ایک مکان کی گھنٹی بجائی جس پر ''چھ'' لکھا ہوا تھا حالانکہ قطار کے مطابق اس کا نمبر ''ایک'' ہونا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک کمسن سا لڑکا مجھے تک رہا ہے۔ مجھے وہ پندرہ سالہ معلوم ہوا۔ اس نے انگلی سے ایک آنکھ ملی۔ لگتا تھا وہ سوتے سوتے ابھی اٹھا ہے۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اس نے قمیض نہیں پہن رکھی تھی۔ اس کی پسلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ جسم کا رنگ پرانی چادروں کی طرح مٹ میلا سفید تھا۔ ماتھے پر گھنے کالے بال بکھرے تھے۔ اس نے خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک ضدی اداسی کا سایہ تھا جیسے اس نے جان بوجھ کر اس تاثر کو اپنا لیا ہو۔

چند لمحوں تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے کیونکہ مجھ سے شروعات نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک میرا سوالنامہ اس قدر غیر متعلق محسوس ہوا۔ ساتھ ہی وہ مجھے کسی دھمکی کی طرح لگا۔ آخر میں نے پوچھا، جبکہ مجھے اپنا لہجہ بالکل بناوٹی لگ رہا تھا:

''ہیلو! آپ کے ابا جان گھر پر ہیں؟''

وہ بغیر کسی تاثر کے میرے چہرے کو تکتا رہا، پھر بولا، ''وہ مر چکے ہیں۔''

''اوہ!'' میں نے کہا اور پھر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ وہ بھی اسی طرح کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ شاید وہ اتنا بھی کم عمر نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے تھے اور ہونٹوں کے گرد شکنیں تھیں۔ اچانک میں نے کہا:

''کیا تم واقعی پندرہ برس کے ہو؟'' گویا اس نے مجھے اپنی عمر خود بتائی ہو۔

''میں چھبیس برس کا ہوں،'' اس نے ماتمی لہجے میں کہا۔ یہ سن کر میں اچھل پڑی۔ میں نے فوراً سرعت سے کاروباری مکالمات ادا کیے کہ میں سیمور سروے سے ہوں اور کچھ فروخت نہیں کر رہی۔ صرف مارکیٹ سروے... تاکہ اشیا بہتر... اور کیا وہ بتا سکتا ہے کہ وہ اوسطاً ہر ہفتے کتنی بیئر کا صارف ہے۔ یہ رہا چارٹ۔ اس پر نمبر پڑے ہیں۔ زیادہ، بہت زیادہ، معتدل، بالائی معتدل، درمیانہ، کم، بہت کم، بالکل نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس نے چارٹ پر نظر ڈالی اور آنکھیں میچ کر کہا، ''نمبر چھ!''

''اس کا مطلب ہے میں آپ سے سوال پوچھ سکتی ہوں۔''

''اندر آجائیے،'' اس نے کہا۔

میں ایک مکعب کمرے میں داخل ہوئی جو درمیانے سائز کا تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ ایک طرف راہداری دوسرے کمروں کی طرف جا رہی تھی۔ دیوار پر کوئی تصویر نہیں تھی۔ فرش پر نہایت عمدہ ایرانی غالیچہ بچھا تھا۔ ایک پوری دیوار پر بک شیلف لگے تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پورا کمرہ کاغذوں، کتابوں، پنسلوں سے اس طرح بھرا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کرسیوں اور صوفوں پر بھی کاغذ، قلم اور کھلی کتابیں رکھی تھیں۔

میں نے ایک کرسی سے کاغذ ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تاکہ بیٹھ سکوں، لیکن لڑکے نے گھبرا کر مجھے روک دیا۔

''آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتیں۔ یہ ٹریور کی کرسی ہے۔ وہ نوٹس لے رہا ہے۔''

دوسری کرسی کسی فشر نامی شخص کی نکلی، اور وہ بھی نوٹس لے رہا تھا۔

''پھر کہاں بیٹھوں؟'' میں نے بیک وقت متانت اور دوستانہ خوش مزاجی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''زمین پر... یا باورچی خانے میں۔ یا میرے کمرے میں بستر پر بیٹھ سکتی ہیں۔''

آخر انٹرویو شروع ہوا۔ میں نے سوالنامہ نکالا اور اسے ایک نمبر بتایا جسے ملانے پر وہ اشتہاری

Scanned with CamScanner

نغمہ سن سکتا تھا۔ نمبر لے کر وہ غائب ہو گیا۔ جب وہ کافی دیر تک واپس نہیں آیا تو میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ریسیور کان سے لگائے، منہ ٹیڑھا کیے بے آواز ہنسے جا رہا ہے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''نغمہ سن رہا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''بہت خوب! نہایت پر لطف۔ کیا میں اسے اکثر سن سکتا ہوں؟ یعنی اس طرح فون پر؟''

''اچھا! اب میں اس کے چند کلمات دُہراؤں گی۔ آپ مجھے بتایئے گا کہ ان سے آپ کے ذہن میں کیا تصور جاگتا ہے۔ پہلے بتائیں کہ 'ڈیپ ڈاؤن مردانہ مہک' سے آپ کو کیا خیال آتا ہے؟''

اس نے آنکھیں بند کرلیں، پھر کہا، ''پسینے کا خیال آتا ہے۔''

میں نے فوراً اس کا جواب کاپی پر لکھ لیا، پھر پوچھا، '''لمبا ٹھنڈا گھونٹ'؟''

اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ''کوئی خاص خیال نہیں آتا۔ ہاں ہاں، ایک پرندہ... جو نیچے گرتا ہے۔ اس کے پر منتشر ہو رہے ہیں۔''

'''صحت مند، مزیدار ذائقہ'؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس سے آپ کو کیا خیال آیا؟''

''اس سے مجھے بدہضمی اور سینے کی جلن کا خیال آیا،'' لڑکے نے کہا۔ میں نے بددلی سے کاپی پر اس کا جواب لکھا۔ ''اس سے آدم خوروں کا خیال بھی آتا ہے،'' اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ''ایسی کئی قدیم کہانیوں میں شیکسپیئر کے ڈرامے بھی ہیں، جن میں شوہر بیوی کے عاشق کو قتل کر دیتا ہے یا عاشق بیوی کے شوہر کو... اس کے تِکے بناتا ہے اور ایک چاندی کی پلیٹ میں پیش کرتا ہے۔ ٹائیٹس اینڈرونیس میں ایسا ایک منظر ہے۔ گو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ڈرامہ شیکسپیئر ہی نے لکھا ہے یا کسی اور نے...''

''تھینک یو...'' میں نے کہا اور مصروفیت سے لکھتی رہی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ لڑکا اعصابی مریض ہے۔ مجھے بالکل پرسکون رہنا چاہیے۔ کسی قسم کے خوف کا اظہار نہ کروں۔ لڑکا یوں بھی پرتشدد قسم کا معلوم نہیں ہوتا۔ شاید یہ کسی جذباتی بحران سے گزر رہا ہے اور بعض کلمات سے تکلیف زیادہ جاگ جاتی ہے۔ کچھ لوگ بیچارے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اینسلے نے مجھے بتایا تھا کہ بعض لوگوں کو چند الفاظ پریشان کر دیتے ہیں۔

''اب بتائیے کہ 'جنگلی ہیڈی، رَف اینڈ ریڈی' سے آپ کیا سمجھے؟''

وہ اس پر دیر تک غور کرتا رہا، پھر کہنے لگا، ''یہ سب الفاظ گڈ مڈ ہیں، 'جنگلی ہیڈی' سے مجھے ایک ایسے آدمی کا خیال آیا جس کا سر شیشے کا ہے، جسے کوئی چھڑی سے بجا رہا ہے، جیسے میوزیکل گلاسوں کو بجاتے ہیں۔ لیکن 'رف اینڈ ریڈی' کا تو کچھ بھی مطلب نہیں۔'' پھر اداسی سے بولا، ''یہ انٹرویو آپ کے لیے بیکار ہوگا نا؟''

''ہرگز نہیں،'' میں نے استقلال سے کہا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ اس آئی بی ایم مشین کا کیا حشر ہوگا جس میں اس انٹرویو کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی، یعنی اگر کی گئی۔

''اب بس آخری سوال،'' میں نے کہا۔ ''ٹیننگ آف دی وِلڈرنیس'...''

''اوہو، یہ تو بہت آسان ہے!'' اب اس کی آواز پر جوش ہو چلی تھی۔ ''یہ تو کسی کتے کا نام ہے۔ اپنے مالک کی ایک بار سیلاب سے دوسری بار آگ سے اور تیسری بار آدم خور ریڈ انڈین سے جان بچاتا ہے، جیسے کسی زمانے میں ہوا کرتے ہوں گے۔ کتا پوائنٹ ڈبل ٹو گن سے مار دیا جاتا ہے۔ شاید اسے برف میں دفن کیا گیا۔ یہاں درختوں اور جھیل کا شاٹ دکھایا جائے گا۔ غروب آفتاب کا منظر... فیڈ آؤٹ...''

میں دیوانہ وار اس کے کہے ہوے الفاظ لکھتی گئی۔ پھر میں نے کہا، ''اور اب آخر میں... یہ تمام باتیں بیئر کے سیاق و سباق میں کتنی صادق آتی ہیں؟''

''مجھے کیا پتا!'' لڑکے نے کہا۔ ''میں تو کبھی بیئر پیتا نہیں۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم نے نمبر چھ خانہ منتخب کیا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا: معتدل درمیانہ۔''

''چھ تو میرا لکی نمبر ہے،'' لڑکے نے کہا۔ ''میں تو گھر کا نمبر بھی بدلوا دیتا ہوں، ورنہ اس گھر کا نمبر تو ایک ہونا چاہیے۔''

مجھے سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ اس لڑکے کے لیے میں رحم اور شفقت محسوس کر رہی تھی کہ بیچارہ دیوانگی کی حد پر کھڑا ہے، اب معلوم ہوا کہ اتنی دیر سے وہ مجھے بیوقوف بنا رہا تھا۔ میں نے تیوری چڑھا کر اسے گھورا۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

Scanned with CamScanner

''فش اور ٹریور واپس آئے ہیں۔ میرے روم میٹ۔''

لڑکے نے کہا،'' مجھے بغیر قمیض ایک حسینہ کے ساتھ دیکھ کر انھیں بڑا شاک لگے گا۔''

'' مجھے اب چلنا چاہیے،'' میں نے کہا۔ باورچی خانے سے سودے کے تھیلے میز پر رکھنے کی چرمراہٹ آئی، پھر ایک مردانہ آواز: ''اف، کتنی گرمی ہے! ڈنکن، تم بھی بیئر لو گے؟'' دروازے میں ایک بالوں بھرا، ڈاڑھی دار چہرہ نمودار ہوا۔

''تو تم بیئر پیتے ہو!'' میں نے غصے سے کہا۔

''ہاں بھئی، معاف کیجیے گا،'' لڑکا مسکرایا۔ پھر اس نے ڈاڑھی سے مخاطب ہو کر کہا، ''فش، یہ گولڈی لاک ہیں۔''

ڈاڑھی دار چہرے کے اوپر ایک اور چہرہ نمودار ہوا۔ ہلکی نیلی آنکھیں، بھورے بال اور بڑی خوبصورت ترشی ہوئی ناک... مجھے دیکھ کر وہ ہکا بکا ہو گیا۔

''شکریہ،'' میں نے بستر والے لڑکے سے کہا۔ '' آپ نے بہت تعاون کیا۔''

میں باہر نکلنے لگی تو دونوں نے بوکھلا کر میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ڈنکن ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا:

''ہائے، تم جیسی پیاری لڑکی اتنی فضول ملازمت کیوں کر رہی ہے؟ میرا خیال تھا یہ کام تو موٹی گرہستنیں کرتی ہیں۔''

میں نے وقار مجتمع کر کے باہر نکلتے ہوئے کہا، '' پیٹ تو سب کو بھرنا ہوتا ہے۔ اور پھر'' آج کل بی اے کے بعد آپ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔''

4

گھر واپس آ کر میں نے نہانے کی تیاری کی۔ غسلخانہ نچلی منزل پر ہے۔ اسی لیے تو فلیٹ کا کرایہ کم ہے اور ہم اسے لے سکے۔ نہانے کے بعد میں پیٹر کے گھر کی طرف چل دی۔

پیٹر کا فلیٹ کافی دور ایسے علاقے میں ہے جو پہلے کافی غربت زدہ تھا، لیکن اب وہاں اعلیٰ درجے کی نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ چند برسوں میں یہ خوشحال لوگوں کا مسکن بننے والا ہے۔ کئی عمارتیں

Scanned with CamScanner

مکمل ہوگئی ہیں مگر پیٹر والی عمارت ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی ہے، پھر بھی لوگوں نے اس میں رہنا شروع کر دیا ہے۔ اس میں برقی تار اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے منتشر اعصابی رگیں ہوں۔ پیٹر کا فلیٹ تو اب مکمل ہو گیا ہے۔

میں نے اس کے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر پانی گرنے کی آواز سے معلوم ہوگیا کہ وہ نہا رہا ہے۔ میں فلیٹ میں چہل قدمی کرنے لگی۔ پیٹر کے کمرے میں اس کے شکار کے ہتھیار رکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کافی شکار پر جاتا رہا تھا۔ چند کیمرے بھی تھے۔ یہ پیٹر کا نیا شوق تھا۔ پیٹر باہر آیا۔ اس نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔

''غسلخانے میں آجاؤ'' اس نے کہا۔ اس کا باتھ ٹب بالکل سفید تھا۔ ہم بستری کے لیے باتھ ٹب میرا انتخاب نہیں تھا۔ یہ بہت سخت ہوتا ہے۔ میں بستر کو ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ پیٹر اکثر وہ کرتا ہے جو اس نے کہیں پڑھا ہوتا ہے۔

پیٹر کے بالوں سے صابن کی مہک آرہی تھی۔ پیٹر سے ہمیشہ صابن کی مہک آتی رہتی ہے۔ پیٹر خوبصورت تھا، اسی لیے میں اس کی طرف کھنچی۔ ہماری ملاقات ایک گارڈن پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہ میرے ایک دوست کا دوست تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے اکٹھے آئس کریم کھائی تھی۔ پیٹر نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے آزاد ذہن سے متاثر ہوا تھا۔

''تم ایسی نہیں لگیں جو میری زندگی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے،'' اس نے بعد میں مجھ سے کہا تھا۔ میں اس سے ملتی رہی اور گرمیاں ختم ہوتے ہوتے وہ میرے لیے ایک خوشگوار عادت بن گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اسی طرح قبول کیا تھا جیسے ہم نظر آتے تھے۔ ملاقات تو صرف ویک اینڈ پر ہوتی تھی لہٰذا ملمعے کو گھس جانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

چینی کے باتھ ٹب میں لیٹی میں سوچ رہی تھی: اگر ہم دونوں کو نیند آجائے اور کسی طرح نل کھل جائے اور سوتے سوتے ہم ڈوب جائیں، پھر کیا ہوگا؟ صحافی آکر تصویریں لیں گے، اخباروں میں چھپیں گی۔ عاشق جوڑا باتھ ٹب میں ڈوب مرا! شکر ہے، میں نے سوچا، اب پیٹر کا کوئی دوست کنوارا نہیں رہ گیا۔ ورنہ اس کی شادی پر پیٹر کو پھر صدمہ ہوتا اور اس بار غم غلط کرنے کے لیے وہ شاید الماری میں یا باورچی خانے کے سنک میں ہم بستری کرنے کی کوشش کرتا۔

5

ساڑھے آٹھ بجے ہم دونوں لین سے ملاقات کے لیے چل دیے۔ پیٹر گاڑی کا دروازہ ہمیشہ میرے لیے کھولتا ہے۔ گاڑی سے باہر نکلوں تو تب بھی دروازہ کھولتا ہے۔ لگتا ہے کہ ایڑیاں بھی بجائے گا۔

پیٹر نے لین سے ملنے سے انکار تو نہیں کیا تھا مگر وہ خوش بھی نہیں ہوا تھا۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

میں نے بتایا تھا کہ وہ انگلینڈ میں ٹیلی وژن کے لیے کام کرتا رہا ہے۔

''اوہ!'' اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''آرٹی کرافٹی ٹائپ ہے۔ پھر تو ہوموہوگا۔''

''ارے نہیں بھئی،'' میں نے کہا۔ ''بلکہ اس کا الٹ۔''

ہم ہوٹل کی چھت پر پہنچے، جو کہ بار تھا، آدھا ڈھکا، آدھا کھلا۔ پیٹر یہاں آنا پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ لین وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور ایک سیاہ میز کے پاس بیٹھا پی رہا تھا۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ پیٹر نے جلدی میں اور لین نے دوستانہ رویے سے مصافحہ کیا۔

''لین،'' میں نے کہا۔ ''تم سے دوبارہ مل کر اتنی خوشی ہو رہی ہے۔''

اس نے میز پر جھک کر میرے گال کا بوسہ لیا۔ یہ اس نے انگلینڈ ہی سیکھا ہوگا۔ پہلے وہ اس طرح نہیں ملتا تھا۔ وہ کچھ موٹا بھی ہو گیا تھا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ''تو؟ کیسا رہا انگلینڈ؟'' میں نے لین سے پوچھا۔ میں چاہتی تھی وہ دلچسپ گفتگو سے پیٹر کی تفریح کا سامان مہیا کرے۔

''ٹھیک تھا،'' لین نے کہا۔ ''تقریباً سارا کینیڈا وہاں پہنچا ہوا ہے۔ کمبخت سیاحوں سے بھرا ہوا ہے۔ پھر بھی آتے ہوئے افسوس ہوا۔ وہاں میری ملازمت اچھی تھی۔ کئی مواقع نکل رہے تھے۔'' پھر پیٹر کی طرف مڑ کر: ''لیکن ان عورتوں سے خبردار رہنا پڑتا ہے۔ یہ بات بے بات آپ کا تعاقب کرنے لگتی ہیں کہ ان سے شادی کر لی جائے۔''

اس پر پیٹر کی طبیعت کافی بحال ہوئی۔ اس نے کہا، ''میری این بتا رہی تھی کہ آپ ٹی وی کے

Scanned with CamScanner

لیے کام کرتے رہے ہیں۔''

''ہاں،'' لین نے اپنے بے حد بڑے ہاتھوں کے مربع ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہاں مجھے کام مل جائے گا۔ میرے تجربے کی یہاں ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نیوز رپورٹنگ میں جاؤں۔''

پیٹر کو کافی تسلی ہوئی۔ نیوز رپورٹنگ میں جانے کا خواہاں مرد ہو مو تو نہیں ہو سکتا۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

اتنے میں کسی نے میرا کندھا چھوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک کمسن لڑکی کھڑی تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں پوچھنے والی تھی کہ اسے مجھ سے کیا کام ہے، کہ پیٹر بول پڑا:

''ارے اینسلے! میری این نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ تم بھی آ رہی ہو۔''

میں نے پھر غور سے دیکھا۔ وہ اینسلے ہی تھی۔

''کاش! میری این،'' اینسلے نے بچکانہ آواز میں کہا۔ ''تم نے نہیں بتایا تھا کہ یہ تو بار ہے۔ کہیں یہ لوگ میرا برتھ سرٹیفکیٹ نہ مانگیں۔''

لین اور پیٹر اس کے اعزاز میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے بادل ناخواستہ لین سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ چوتھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ویٹر ہماری میز کی طرف آیا۔ لین نے نہایت چمکدار مسکراہٹ کے ساتھ اینسلے سے پوچھا، ''آپ کیا لیں گی؟''

اینسلے نے خوف بھرے، جھجکتے انداز میں کہا، ''میں...؟ میرے لیے تو بس... کوئی سافٹ ڈرنک منگا دیں۔''

لین نے اس کے لیے جنجر اور سوڈا منگوایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا، ''مجھے معلوم تھا کہ تمھاری ایک روم میٹ ہے، لیکن اتنی کمسن ہے، یہ تو معلوم نہیں تھا۔''

''میں اس کی دیکھ ریکھ پر مامور ہوں،'' میں نے کڑواہٹ سے کہا۔ میرا غصے سے برا حال تھا۔ اینسلے کی بچی نے مجھے اس قدر گومگو میں مبتلا کر دیا تھا۔ یا تو میں صاف کہہ دوں کہ یہ کالج کی گریجویٹ ہے اور مجھ سے چند مہینے عمر میں بڑی ہے اور یا خاموش رہوں اور اس دھوکے بازی کا حصہ بن جاؤں۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ اینسلے یہاں کیوں آئی ہے۔ لین اس کے منصوبے کے لیے ممکنہ امیدوار ہو سکتا

Scanned with CamScanner

تھا۔ وہ یہاں اس کا جائزہ لینے آ پہنچی تھی کیونکہ اسے خوب پتا تھا کہ میں اسے لین سے ملوانے سے رہی۔

اینسلے نے گلابی اور نیلے رنگ کی فراک پہن رکھی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نہ جانے اپنے کپڑوں کے انبار میں کہاں سے کھود کر نکالی تھی۔ بالوں میں گلابی ربن، جس کا پھول بنایا گیا تھا۔ میک اپ بہت ہوشیاری سے کیا تھا، جو بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ اپنی سافٹ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی، شرما شرما کر چھوٹے چھوٹے جوابات دے رہی تھی۔ لیکن جب لین نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے، تو اس نے اس شام کا واحد سچ بولا، یعنی یہ کہ وہ بجلی سے چلنے والے ٹوتھ برشوں کی کمپنی میں کام کرتی ہے۔ یہ کہہ کر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس پر مجھے تقریباً پھندا لگ گیا۔

''سوری،'' میں نے کہا۔ ''میں ذرا کھلی ہوا میں جا رہی ہوں۔'' باہر آ کر میں نے دیوار پر ہاتھ ٹکا دیے جو میری ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ رہی تھی۔ میرے سامنے روشنیوں کی ایک لمبی قطار حرکت کر رہی تھی۔ پارک تاریکی میں تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر میں نے سوچا، جو بھی ہو اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اچانک مشرقی افق پر بجلی چمکی۔ اچھا! رات کو طوفانی بارش ہونے والی ہے۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے،'' میں نے زور سے کہا۔ ''اس سے فضا صاف ہو جائے گی۔''

تھوڑی دیر میں نے ٹیرس پر چہل قدمی کی، پھر واپس اندر آ گئی۔ میں نے حیرت سے محسوس کیا کہ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں جن اور ٹانک پیتی رہی تھی۔ دراصل مجھے شراب کی عادت نہیں۔

میری کرسی کے سامنے ایک تازہ بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔ میں نے غور سے اینسلے کو دیکھا جس نے اس موقعے کے لیے اپنے آپ کو گویا ازسرنو ایجاد کر لیا تھا۔ وہ دکانوں میں بکنے والی ربڑ کی گڑیا معلوم ہو رہی تھی اور نظریں جھکائے بیٹھی اپنی سافٹ ڈرنک میں برف کے ٹکڑے بجا رہی تھی۔

میں نے پیٹر کی آواز پر کان لگائے۔ اسے میری واپسی کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ لین سے گفتگو میں غرق تھا اور پرانے ساتھیوں کے ہمراہ شکار پر جانے کی داستانیں سنا رہا تھا۔ یہ داستانیں اس نے مجھے کبھی نہیں سنائی تھیں۔ مجھ سے تو اس نے کہا تھا کہ انھوں نے کوّوں، مارپشتوں اور دوسرے کیڑوں

مکوڑوں کے علاوہ کبھی کچھ نہیں مارا تھا۔

''بس تو پھر میں نے گولی چلادی۔ بھام! ایک شاٹ! سید ھادل کے آر پار۔ دوسرے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ ٹرگر نے مجھ سے کہا: انتڑیاں نکالنی آتی ہیں؟ پیٹ چاک کر کے زور سے ہلاؤ۔ میں نے اپنا چاقو نکالا۔ بڑا اچھا جرمن اسٹیل کا تھا۔ اوراس کے پیٹ کو چاک کر کے جو ہلایا تو ہر طرف خون کے چھینٹے پھیل گئے...''

اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ لین نے بھی دانت نکال دیے۔

میں نے محسوس کیا کہ پیٹر کی آواز بالکل بدلی ہوئی ہے۔ میں اس آواز کو پہچانتی تک نہیں تھی۔ کیا میں نشے میں ہوں؟ کیا یہ نشہ پیٹر کے بارے میں میرے خیالات توڑ مروڑ دے گا؟

''میں نے اس کی کئی تصویریں کھینچیں۔ تم تو کیمروں کے بارے میں خوب جانتے ہو گے؟''

اب وہ جاپانی لینسوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ پیٹر کی آواز ہر لمحہ زیادہ اونچی اور تیز رفتار سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کہنیاں سیاہ میز پر جھکا دیں اور آگے جھک گئی۔ میں چاہتی تھی کہ پیٹر مجھ سے باتیں کرے۔ میں اس کی نارمل آواز سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ میں سیاہ شیشے میں ان کے عکس دیکھنے لگی۔ ان کی صرف ٹھوڑیاں نظر آرہی تھیں، آنکھیں غائب تھیں۔ اچانک میرے ہاتھ کے پاس ایک موٹا سا پانی کا قطرہ گرا۔ ارے، یہ کیا؟ یہ تو آنسو تھا۔ میرا آنسو! مجھ پر شدید گھبراہٹ کا دورہ پڑنے لگا۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے۔ میں تماشا بن جاؤں گی۔ میں لشتم پشتم واش روم کی طرف بھاگی۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں وہاں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ آخر دروازے پر دستک ہوئی اور اینسلے کی آواز آئی:

''میری این! تم ٹھیک تو ہو؟ اتنی دیر لگا دی۔''

میں نے آنکھیں اور ناک پونچھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں،'' میں نے کہا۔ اینسلے نے آئینے میں اپنے آپ کا جائزہ لیا۔

''تو... تم نے اسے تاڑ لیا؟'' آخر میں نے کہا۔

''دیکھیں گے،'' اینسلے نے اطمینان اور اعتماد سے کہا۔ ''مجھے اس کے بارے میں مزید

Scanned with CamScanner

معلومات چاہییں۔تم تونہیں بتاؤ گی؟''

''نہیں،''میں نے کہا۔''لیکن یہ اخلاق کے خلاف ہے۔''

اینسلے نے فوراً احتجاج کیا۔''میں اس کا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟ اگر کچھ ہوا تو اس کو کوئی ایذا نہیں پہنچے گی۔''

ہم دونوں واپس آئے اور کچھ ہی دیر میں چاروں نیچے اترنے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھے۔لین نے کہا:

''ابھی تو شام جوان ہے۔تم لوگ میرے اپارٹمنٹ کیوں نہیں چلے چلتے؟''

پیٹر فوراً تیار ہو گیا۔''ضرور،ضرور... کیوں نہیں۔''

نیچے آکر میں نے پیٹر کا بازو چھوڑ دیا۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔میں نے پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔

6

میں فٹ پاتھ پر بھاگی چلی جا رہی تھی اور حیرت سے سوچ رہی تھی کہ کیا یہ میرے ہی پیر ہیں جو اتنی تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔

وہ لوگ چند لحظے تک تو حیرت سے بت بنے کھڑے مجھے بھاگتا ہوا دیکھتے رہے۔آخر پیٹر نے چیخ کر کہا:

''ارے ارے! کہاں بھاگی جا رہی ہو میری این؟''

پھر وہ اپنی کار کی طرف دوڑا۔مجھے مایوسی ہوئی۔کیا میں توقع کر رہی تھی کہ وہ میرا تعاقب کرے گا؟ میرے پیچھے تو لین دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔اینسلے پیٹر کی جانب دوڑ رہی تھی۔

''ہے،میری این،رُک جاؤ!''لین نے پکار کر کہا۔مگر میں ہنس رہی تھی اور دوڑے جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا سامنے سے ایک ٹینک چلا آ رہا ہے۔یہ پیٹر کی گاڑی تھی جس میں وہ اور اینسلے بیٹھے تھے۔مجھے اس سے خطرہ محسوس ہوا۔

اب تک ہم سڑک پار کر کے گھروں کے سامنے آ چکے تھے۔مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو ایک دیوار

Scanned with CamScanner

پھاند کر ایک گھر کی لان میں چھلانگ لگا دی۔ لین نے بھی دیوار پھاندی اور مجھے پکڑ لیا۔

وہ مجھے باہر لایا۔ پیٹر میرے جوتے ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تم کو؟'' اس نے سختی سے کہا۔ لیکن اب اس کی آواز نارمل تھی، حالانکہ وہ گھبرا گیا تھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے کہا۔ ''لو، یہ جوتے پہنو۔''

مجھے اتنا سکون محسوس ہوا کہ میں زور زور سے ہنسنے لگی۔

کچھ دیر کے لیے ہم لین کے اپارٹمنٹ میں گئے۔ لین اور پیٹر وہاں پھر کیمروں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں لین کے بستر کے نیچے لیٹ گئی۔ جب انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے بڑی مشکل سے مجھے بستر سے نیچے سے نکالا۔ پیٹر مجھے اپنے ساتھ واپس لانے لگا۔ لین نے اینسلے کو کچھ دیر کے لیے اور روک لیا۔

''یہ کیا تماشا ہے؟'' پیٹر نے مجھ سے جھنجھلاہٹ بھری آواز میں پوچھا۔

''میں آپ لوگوں کی گفتگو میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی،'' میں نے یخ بستہ لہجے میں کہا۔

پیٹر نے غصے سے مجھے دیکھا۔ میں دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ''میں تمھارے ساتھ واپس جانا نہیں چاہتی،'' میں نے پیٹر سے کہا۔

''جہنم میں جاؤ!'' پیٹر نے کہا۔

میں سڑک پر چلتی رہی۔ ہوا کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی اور بجلیوں بھرے بادل آسمان پر تیزی سے تیرتے، نزدیک سے نزدیک تر آ رہے تھے۔ نہ جانے مجھے بس کا کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ رات زیادہ ہو چکی ہے اور بارش آنے والی ہے۔

دفعتاً میرے سامنے ایک کار آ کر تیز آواز سے رکی اور پیٹر باہر آیا۔ اس کی طرف توجہ دیے بغیر میں چلتی رہی۔ وہ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ جب میں اس کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے کہا، ''کیا میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ سکتا ہوں، محترمہ؟''

اس کی آنکھیں شیشے کی بنی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس نے دو تین پیگ ضرورت سے زیادہ پی لیے تھے، پھر بھی اس کو اپنے آپ پر پورا قابو تھا۔

''ہرگز نہیں!'' میں نے کہا۔ کیا وہ محض تکلف کی عادت نبھا رہا ہے؟ جیسے وہ ہمیشہ میرے لیے

Scanned with CamScanner

کار کا دروازہ کھولتا ہے، محض عادتاً۔ ''پھر بھی شکریہ،'' میں نے اضافہ کیا۔

''اب بچکانی حرکتیں مت کرو میری این،'' اس نے بے صبری سے کہا اور میرا بازو پکڑ لیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم بارش میں شرابور ہو جاؤ۔''

میں نے اس کے گھسیٹنے کی مزاحمت نہیں کی۔ سامنے کی سیٹ میں گھس گئی۔ بھیگنا تو میں بھی نہیں چاہتی تھی۔

پیٹر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کہا، ''شاید اب تم مجھے بتاؤ گی کہ آج پوری شام تم نے یہ کیا تماشا کیا، اور کیوں؟''

گاڑی نے موڑ کاٹا اور تڑا تڑ بارش پڑنے لگی۔

''میں نے تم سے درخواست نہیں کی ہے کہ مجھے گھر چھوڑو،'' میں نے اپنے آپ میں سمٹ کر کہا۔

''تو پھر تم نے اتنی اچھی شام کو برباد کیوں کیا؟ مجھے کبھی پتا نہیں چلے گا۔''

''تمھاری شام تو برباد نہیں ہوئی،'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''تم تو بہت خوش رہے۔''

''اچھا! تو یہ بات ہے؟'' پیٹر نے کہا۔ ''ہم لوگ تمھاری تفریح کا سامان پیدا نہیں کر رہے تھے۔ ہماری باتوں سے تم بور ہو رہی تھیں اور ہم تم پر زیادہ توجہ نہیں دے رہے تھے؟ یہی نا؟ اگلی بار تمھیں ساتھ لے جانے کی حماقت نہیں کریں گے۔''

''کیا؟'' میں نے تپ کر کہا۔ ''لین میرا دوست ہے۔ آپ بھول رہے ہیں۔''

''آخر اینسلے بھی تو تھی۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ بات یہ ہے کہ تم اپنی نسوانیت قبول نہیں کرتیں۔''

اینسلے کی تعریف پر میں آگ بگولہ ہو گئی۔ وہ کیا کر رہی تھی اور کیوں کر رہی تھی، یہ تو میں خوب جانتی تھی، لیکن میں کسی کو کیوں بتاؤں؟ جل کٹ کر میں نے کہا، ''حقیقت یہ ہے کہ تمام شام تم بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے رہے، حالانکہ تم کو اس کا علم تک نہیں۔''

بدتہذیبی کرنا اور علم تک نہ ہونا کہ بدتہذیبی کی جا رہی ہے، یعنی وہ گھٹیا ہے، فطری طور پر یا اپنے پس منظر کے باعث! اب پیٹر کے آگ بگولہ ہونے کی باری تھی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف

Scanned with CamScanner

دیکھا جیسے گولی مارنے کے لیے نشانہ لے رہا ہو اور پھر قاتلانہ جنون سے پوری قوت سے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ بارش اب موسلا دھار ہو رہی تھی اور اس وقت ہم ایک سڑک کی اترائی پر تھے۔ اچانک رفتار اتنی تیز ہونے پر کار زور سے اچھلی اور پوری گھوم کر ایک مکان کی لان میں گھس گئی اور ایک شدید دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

''او پاگل!'' میں نے چیخ ماری۔ سامنے سے ٹکرا کر دھچکے سے پیچھے آنے کے بعد، جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ابھی زندہ ہوں، میں چلائی، ''تم تو ہم سب کو مار ہی ڈالو گے۔'' بے خیالی میں میں نے اس لمحے شاید یہ سمجھا کہ کار میں کچھ اور لوگ بھی ہیں۔

پیٹر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا اور گردن باہر نکال کر دیکھا۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ''میں نے ان کی لان کا نقشہ بدل دیا۔'' اس نے پچھلے پہیے زور سے گھمائے۔ کیچڑ کا ایک طوفان اڑنے لگا۔ گیئر کی گھمر گھمر کے ساتھ گاڑی دوبارہ سڑک پر آ گئی۔

میں غصے، سردی اور خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے بجتے ہوئے دانتوں کے ساتھ چیخ کر کہا، ''پہلے تم مجھے اپنی کار میں گھسیٹ لائے، اپنے احساسِ جرم کے باعث مجھ پر چیخے چلائے اور پھر مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی۔''

پیٹر سنتا رہا۔ اس نے کہا، ''لان تو گئی کام سے۔'' یہ کہہ کر وہ اور ہنسا۔ مجھے بڑا عجیب لگا کہ کسی دوسرے کی لان کو خراب کر دینا اسے کوئی لطیفہ معلوم ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، ''بڑی عجیب بات ہے کہ کسی دوسرے کی لان کو خراب کر دینا تمھیں لطیفہ معلوم ہو رہا ہے۔''

''تم تو ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈالتی ہو!'' پیٹر نے کہا۔ وہ طاقت کے اس مظاہرے پر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا، جبکہ طاقت، میں نے جھنجھلا کر سوچا، اس کی نہیں بلکہ کار کی تھی جس کا مظاہرہ ہوا۔

کار جھٹکے کے ساتھ رکی۔ ''لو تمھارا گھر آ گیا،'' پیٹر نے کہا۔ میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پہ رکھ دیا۔

''ذرا رکو۔ بارش تھم جائے تب جانا،'' اس نے کہا۔

ہم دونوں کار میں بیٹھے طوفانی بارش کی آواز سنتے رہے۔ طوفانی بادل شاید بالکل ہمارے اوپر

Scanned with CamScanner

پہنچا ہوا تھا۔ بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ ہر چمک کے بعد اتنی زور کی گرج ہو رہی تھی جیسے ایک پورے جنگل کے تمام درخت چیخ کر گر رہے ہوں۔ پیٹر نے مجھے بوسہ دیا۔ میں بہت تھک چکی تھی۔

''پتہ نہیں آج پوری شام میں نے کیا حرکتیں کی ہیں،'' میں نے ہولے سے کہا۔ پیٹر نے میرے گال سہلائے، کچھ اس انداز سے جیسے وہ مجھے معاف کر رہا ہو، جیسے وہ سب بات سمجھتا ہو اور ساتھ ہی کچھ سرپرستانہ انداز میں... کچھ دیر ہم طوفان کے مرکز میں ایک دوسرے کی بانہوں میں بیٹھے رہے۔ مجھے صرف یہ احساس تھا کہ میں بے حد تھکی ہوئی ہوں اور میرے جسم کی کپکپی کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ پیٹر نے میرے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کر دیا۔

پھر اس نے کہا: ''میری این، کیوں نہ ہم... ہم شادی کر لیں؟''

میں چونک کر پیچھے ہٹی۔ کہیں بہت نزدیک بجلی کا زوردار کڑاکا ہوا۔ اس کی نیلی روشنی میں مجھے پیٹر کی آنکھوں میں اپنا عکس نظر آیا۔ ایک چھوٹی سی بیضوی عورت...

7

اتوار کی صبح جب میں اٹھی تو وہ صبح نہیں بلکہ اتوار کی دوپہر تھی۔ ناشتے کے لیے باورچی خانے پہنچی تو اینسلے پہلے سے موجود تھی۔ ناشتہ وہ کب کا کر چکی تھی۔ اِدھر اُدھر ڈبل روٹی کا جھڑا ہوا چورا بکھرا تھا۔

وہ کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال کمر پر بکھرے تھے۔ وہ کوئی جل پری نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے کیلنڈر پڑا تھا اور وہ کچھ حساب کرنے کے لیے کیلنڈر پر نشان لگا رہی تھی۔

میں نے فرج سے ٹماٹر کا رس نکالا اور ایک انڈا ابالنے کے لیے نکالا۔

''تم کس وقت پہنچیں اور کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمھارے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر میں لین نے میرے لیے ٹیکسی منگوا دی۔ بارش شروع ہونے سے پہلے میں گھر پہنچ گئی۔ ایک سگریٹ پھونکا اور ایک ڈبل اسکاچ پی کر سو گئی۔''

Scanned with CamScanner

''اور یہ کیلنڈر پر کیا نشان لگا رہی ہو؟''

''میری این، ان تاریخوں میں استقرارِ حمل ہونا چاہیے۔ کل میں نے سخت معصومیت کی اداکاری کی، جو اس مرحلے پر ضروری ہے۔ لین نے گھبرا کر مجھے واپس بھیج دیا، لیکن... اف! میں کتنی تھک گئی تھی۔ اس طرح بے حس و حرکت نظریں جھکائے بیٹھے رہنے سے انسان کی جان نکل جاتی ہے... اور تم اپنی سناؤ۔''

''میں اور پیٹر شادی کرنے والے ہیں،'' میں نے بددلی سے کہا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اینسلے اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔ جو انڈا میں نے ابالنے رکھا تھا، وہ پانی ابلتے ہی چیخ گیا۔ سفیدی کی ایک پتلی دھار باہر نکلی اور پانی میں مکڑی کی طرح تیرنے لگی۔ میں نے انڈا پلیٹ میں نکال کر توڑا تو زردی بالکل کچی تھی۔ مجھے گھن آ گئی۔ میں نے پلیٹ ایک طرف سرکا دی اور فیصلہ کیا کہ میں کبھی انڈا نہیں کھایا کروں گی۔ اینسلے نے حیرت کا اظہار نہیں کیا، جس پر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس نے کہا، ''میری مانو تو امریکہ جا کر شادی کرنا۔ وہاں طلاق آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ویسے پیٹر وکیل بن کر خوب کمانے والا ہے۔ اس لیے جب بچہ ہو تو پھر تم دونوں اُس کے خرچ پر علیحدہ علیحدہ بھی رہ سکتے ہو... یعنی طلاق کے جھنجھٹ کے بغیر بھی۔''

میں شدید بور ہوئی۔ پھر میں نے کلارا کو فون کر کے اسے بتایا۔ کلارا نے کہا، ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ جو کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میری این کو اب ٹھور ٹھکانا بنا لینا چاہیے۔''

اس کی بات سے ظاہر ہو رہا تھا گویا میں سمجھ بوجھ سے کام لے رہی ہوں۔ اس پر میں اور بھی بور ہوئی۔ میں نے سوچا، دوسرے لوگ شاید آپ کے نرم و نازک جذبات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

چھٹی کا دن کپڑے دھونے کا دن ہوتا ہے۔ خصوصاً اتوار کی سہ پہر اس کے لیے سب سے مناسب ہے۔ اس وقت بوڑھے اور بوڑھیاں بسوں اور سڑکوں پر قبضہ کیے نہیں گھومتے۔ میں نے پرس میں لانڈرومیٹ میں ڈالنے کے لیے سکے گنے اور لانڈری بیگ اٹھائے باہر بھاگی۔ راستے بھر میں بس کے پوسٹر غور سے دیکھتی آئی۔ میں بس اور ٹرین میں بھی پوسٹر پڑھتی رہتی ہوں۔ یہ سب اشتہار ہوتے ہیں۔ اس بار میں عورتوں کا پیٹ پتلا دکھانے والے گرڈل کے اشتہار کو غور سے دیکھ رہی تھی جس میں ایک عورت کی تین ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اس اشتہار کو دیکھ کر آخر کوئی عورت

Scanned with CamScanner

گرڈل کیوں خریدے گی۔ پھر میں سوچنے لگی کہ درمیانی عمر کا مٹاپا نہ جانے کب شروع ہوتا ہے۔

لانڈرومیٹ بالکل خالی تھی۔ میں نے مشینوں میں رنگین اور سفید کپڑے الگ الگ کر کے ڈالے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں واشنگ پوڈر لانا تو بھول ہی گئی تھی۔

''اف! اب کیا کروں؟'' میں نے زور سے کہا۔

''میرا صابن لے لو،'' ایک مردانہ آواز آئی۔ میں چونک پڑی۔ ایک دبلا پتلا لڑکا کندھے جھکائے وہاں بیٹھا تھا۔ وہ اتنا خاموش اور بے حس و حرکت تھا کہ اس پر میری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔ لیکن اب میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ ''شکریہ،'' میں نے کہا اور اس کا واشنگ پوڈر لے کر مشینوں میں ڈال کر انھیں چلا دیا۔ اب جو میں نے اس لڑکے کو دوبارہ دیکھا تو پہچانا۔ ارے! یہ تو وہی لڑکا تھا جس نے مجھے وہ دیوانے پن کا انٹرویو دیا تھا۔ بھلا اسے کیسے پتا چلا کہ میں صابن لانا بھول گئی؟ میں نے تو یہ لفظ منھ سے بھی نہیں نکالا تھا۔

وہ بھی اب مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''ارے تم تو وہی لڑکی ہو!'' اس نے کہا۔ ''پہلے تو میں نے پہچانا نہیں تھا۔ اس دن کے مقابلے میں کتنی مختلف نظر آ رہی ہو۔ لو، چاکلیٹ کھاؤ۔''

''نہیں، شکریہ،'' میں نے کہا۔

''ہوں۔ مجھے بھی چاکلیٹ کچھ خاص پسند نہیں، لیکن میں سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں،'' اس نے کہا اور آہستہ آہستہ اپنی چاکلیٹ بار کھانے لگا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے سفید چمکتی ہوئی مشینوں کی قطار کو تکتے رہے، خصوصاً تین مشینوں کو، جن کے گول شیشوں کے پیچھے ہمارے کپڑے الٹتے پلٹتے، الجھتے، الگ ہوتے اور جھاگ میں غائب ہو کر پھر سے نمودار ہو رہے تھے۔

لڑکے نے اپنی چاکلیٹ ختم کی اور اس کی نقرئی پنّی تہہ کر کے جیب میں ڈال لی۔

''مجھے کپڑے دُھلتے دیکھنا کچھ اچھا سا لگتا ہے،'' اس نے کہا۔ ''جیسے بعض لوگ ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں پڑتا اور معلوم ہوتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے،'' وہ یکسانیت سے دھیرے دھیرے کہے جا رہا تھا۔ یوں کندھے جھکائے، گردن سویٹر کے اندر کیے بیٹھا تھا جیسے کچھوا اپنے خول میں گھسا ہوا ہو۔ ''میں یہاں اکثر آتا ہوں۔ گھر سے نکلے اور یہاں آ بیٹھے۔ پھر مجھے استری کرنا بھی بہت پسند ہے۔ اس طرح میرے ہاتھ کچھ کام کرتے رہتے ہیں، لیکن جب

Scanned with CamScanner

استری کے کپڑے ختم ہو جاتے ہیں تو یہاں آ جاتا ہوں۔ پھر اور کپڑے مل جاتے ہیں۔''

وہ میری طرف دیکھے بغیر اس طرح بولے جا رہا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ''میں اس اپارٹمنٹ سے بار بار باہر آنا چاہتا ہوں۔ فش اپنی کرسی پر بیٹھا لکھتا رہتا ہے۔ پھر سب کاغذ پھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ ٹریور، جب گھر میں ہوتا ہے تو بارہ بارہ طعام تیار کرنے لگتا ہے یا پندرھویں صدی کی اطالوی خطاطی کرتا رہتا ہے، لیکن یہ نہ میرے اور نہ اس کے مسئلے کا حل ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلسل دُہراتے رہتے ہیں لیکن کہیں نہیں پہنچتے اور نہ کسی چیز کو اختتام تک لاتے ہیں۔ میں کون سا ان سے بہتر ہوں! میں اس کمبخت ٹرم پیپر کی بھول بھلیوں میں جانے کب سے بھٹک رہا ہوں۔ ہم پڑھتے جاتے ہیں اور پڑھتے جاتے ہیں، مواد اکٹھا کرتے جاتے ہیں، پھر سب کچھ بے معنی بنتا چلا جاتا ہے۔'' آخر کار اس نے میری طرف دیکھا، لیکن اس کی آنکھوں کا مرکز پھر بھی میں نہیں تھی۔ لگتا تھا، میرے آر پار دیکھ رہا ہے۔ اب مشینوں کی آواز بدلی، رگڑائی ختم ہوئی، اب دُھلائی شروع ہوئی۔ مشینیں نہایت برق رفتاری سے گھومنے لگیں، ان میں نیا پانی گرنے کی آواز آئی۔ لڑکے نے ایک سگریٹ سلگایا۔

''کیا تم سب اسٹوڈنٹ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں،'' اس نے ماتمی انداز میں کہا۔ ''سب انگریزی ادب میں ڈگریاں لینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہمیں پیپر لکھنے ہوتے ہیں، لیکن آخر کس موضوع پر لکھیں؟ سب کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ بیچارہ ٹریور ڈی ایچ لارنس کے ہاں علامتِ رحمِ مادر پر تھیسس لکھنا چاہتا تھا، لیکن اسے بتایا گیا کہ وہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اب آپ رسکن کے ڈنر کے دعوت ناموں پر تحقیق کرتے رہیے یا اور کسی بالکل بیکار مصنف پر جسے کسی نے نہ جانے کیوں کھود کر نکالا ہے۔ بیچارہ ٹریور اب ایک ایسے ناممکن ادبی نظریے پر کام کر رہا ہے جو ہر روز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب تو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔''

''وہ کیا نظریہ ہے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو اسے خود بھی نہیں پتا،'' لڑکے نے کہا۔ ''اسی لیے تو وہ اپنی تحریر پھاڑتا رہتا ہے۔''

''اور تم کس موضوع پر لکھ رہے ہو؟''

Scanned with CamScanner

''میں ابھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ میں تو پچھلے سے پچھلے سال کا ایک پیپر لکھ رہا ہوں جو رہ گیا تھا۔ روز ایک جملہ لکھتا ہوں۔'' میں سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا:

''شاید یہ تمھارے مزاج کے مطابق نہیں۔ تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟''

''اب ہم کسی قابل نہیں رہے۔ اس مقام سے واپسی ممکن نہیں۔ کوئی ہم سے آخر کیا کام کروائے گا؟ نہیں! مجھے تمام عمر کاغذی کانوں میں غلام کا کام کرنا پڑے گا۔''

میرا دل چاہا کہ اسے گلے لگا کر تھپکوں اور تسلی دوں۔ لیکن اس میں بچے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو غیر فطری طور پر قبل از وقت ایسا بوڑھا لگ رہا تھا جو تسلی پانے سے بعید ہو۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکا جھوٹ بھی تو بہت بولتا ہے۔

خدا جانے کہ اس لڑکے میں کوئی ساتویں یا آٹھویں حس تھی یا اس کے سر پر نظر نہ آنے والا اینٹینا لگا تھا کہ اس نے خشک مگر نرم آواز میں کہا، ''تم میری حالت پر بہت خوش ہونا؟ تمام عورتیں بیماروں کو پسند کرتی ہیں۔ میں انھیں فلورنس نائٹنگیل میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ مگر ذرا ہوشیار رہنا۔'' اس نے میری طرف مکارانہ ترچھی نظر ڈالی۔ ''کوئی تخریبی کام نہ کر بیٹھو۔ بھوک محبت سے زیادہ بنیادی ہوتی ہے۔ فلورنس نائٹنگیل آدم خور تھی دراصل۔''

میرا سکون کرچی کرچی ہو گیا اور گھبراہٹ کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت مشینیں رک گئیں۔ ہم کھڑے ہو گئے۔

''صابن کا شکریہ،'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں،'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم دونوں نے مشینوں سے کپڑے نکالے، انھیں تھیلوں میں بھرا اور اپنے کندھے پر لاد کر لانڈرومیٹ کے دروازے کی جانب چلے۔ میں لمحہ بھر رکی کہ شاید وہ میرے لیے دروازہ کھولے لیکن اس نے جب ہاتھ بھی نہ ہلایا تو میں نے دروازہ خود کھول لیا۔

باہر سڑک پر ہم ساتھ ساتھ اس طرح مڑے کہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اچانک ہم پیچھے ہٹے اور پھر اچانک ہم نے تھیلے زمین پر رکھ دیے اور ایک دوسرے کی سمت بڑھے۔ نہ جانے وہ میرا بوسہ لے رہا تھا یا میں اس کا بوسہ لے رہی تھی یا دونوں ایک دوسرے کا۔ میرے بازوؤں کے حلقے میں

Scanned with CamScanner

اس کا بدن ڈھانچے کی طرح تھا۔ اس کے منھ میں سگریٹ کی مہک تھی اور چہرہ ایسا تھا جیسے کارڈ کے ہینگر پر ٹشو پیپر لپیٹ دیا جائے۔ اس بوسے کا اس کے سوا کوئی احساس میری یادداشت میں نہیں۔

پھر ہم مڑے اور مخالف سمتوں میں چل دیے۔

8

تو یہ ہوں میں!

اپنے کمرے میں۔ دروازہ بند ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ آج لیبر ڈے ہے، یعنی چھٹی۔ شادی تو ایک دن کرنی ہی تھی۔ یقیناً میں پیٹر سے اپنی توقع سے زیادہ منسلک رہی تھی۔

میں اینسلے کی طرح نہیں ہوں جو شادی کے اصولاً خلاف ہے۔ مگر زندگی اصولوں سے نہیں، سمجھوتوں سے چلتی ہے۔ پیٹر کے ساتھ میری شادی درست ہے۔ وہ پرکشش بھی ہے اور ضرور کامیاب بھی ہوگا۔ وہ صفائی پسند بھی ہے۔ ساتھ رہنے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

اب میں بال دھوؤں گی، کمرہ صاف کروں گی اور پھر گھر خط لکھوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ سب بہت خوش ہوں گے۔ اسی کا تو انھیں انتظار تھا۔

لانڈرومیٹ والے آدمی کا اور میرا رویہ البتہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ ایک بھول تھی، میری انا میں ایک خلا، جیسے نسیاں کا مرض... اس کا نام کیا تھا؟ خیر، پیٹر سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس سے دوبارہ ملاقات بھی بعید از قیاس ہے۔ یوں بیٹھے بیٹھے کام نہیں چلے گا۔ مجھے اٹھنا چاہیے۔ بہت سے کام کرنے ہیں۔

9

میری این اپنے دفتر میں بیٹھی کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اسے اسٹین لیس اسٹیل ریزر بلیڈوں کے بارے میں ایک سوالنامے پر کام کرنا تھا۔ بلیڈ کمپنی فروخت بڑھانے کے لیے ریزر کے پرانے بلیڈ کے بدلے نئے بلیڈ کی پیشکش کر رہی تھی۔ میری این نے تصور کیا کہ بلیڈ کمپنی کے صدر کے پاس ایک جادوئی قدیم بلیڈ تھا جو نہ صرف کبھی کند نہیں ہوتا تھا بلکہ جو اس کی ہر خواہش

Scanned with CamScanner

پوری کر دیتا تھا۔ ایک بار غلطی سے وہ کسی ریزر میں لگا دیا گیا اور وہ ریزر فروخت ہو گیا۔ جب صدر کو یہ معلوم ہوا تو غصے کے مارے اس کا برا حال ہو گیا۔ پھر اس نے سیمور سروے کی دو عورتوں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ گلی گلی یہ آواز لگاتی پھریں، ''پرانا بلیڈ دے دو، نیا بلیڈ لے لو...''

کیا کمپنی کے صدر کو اس کا پرانا بلیڈ مل سکا؟ میں ابھی سوچ رہی تھی کہ دفتر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہوا یہ تھا کہ کینیڈا کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر سینٹری پیڈز کی فروخت کے سلسلے میں جو سوالنامے بھیجے گئے تھے وہ ایک بحران کا شکار ہو گئے تھے اور اب سب کارکن عورتیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ یہ مغربی ساحل پر ہوا تھا۔ سوالناموں کے ناموں کا انتخاب ٹیلیفون ڈائریکٹری سے کرنا تھا۔ کوئی مسز تھیچر تھیں جنھوں نے ناموں کا انتخاب کیا تھا۔ جوابات جو دفتر پہنچے تو بحران آ گیا۔

''ہوں! بہت سے سوالنامے ظاہر ہے کہ مردوں کو بھیج دیے گئے ہیں،'' ملی نے غصے سے کہا۔

''دیکھو اس سوالنامے پر لکھا ہے۔ ہی ہی ہی! کسی مسٹر انڈریوز نے دستخط بھی کیے ہیں۔''

''اور اس سوالنامے پر ہر سوال کا جواب ہے: نہیں، نہیں، نہیں... او میرے خدا! تو پھر یہ آخر استعمال کیا کرتی ہیں؟'' لوسی نے شرمندگی سے کہا۔ ''اوہو! عمر کے خانے میں لکھا ہے، عمر اسی برس۔''

میری این تھوڑی دیر تک سوچ میں پڑی رہی۔ آج رات اسے پیٹر کے ساتھ ڈنر کھانا تھا لیکن پیٹر نے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گا کیونکہ اچانک ایک بہت اہم مقدمہ آ گیا ہے اور اسے وہ شام کام کرتے ہوئے بتانی ہے۔ اس پر میری این جھنجھلائی تھی، لیکن پھر اس نے سوچا تھا کہ اسے پیٹر کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے۔ تب ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف ایک پہچانی ہوئی آواز تھی۔ ''میں ہوں... ڈنکن۔ لانڈرومیٹ والا۔''

''ڈنکن،'' میری این نے نہایت کاروباری لہجے میں کہا۔ ''میں دفتر میں ہوں۔ کوئی خاص بات؟''

''اوہ!'' اس نے کہا۔ پھر چپ ہو گیا۔

''ہاں ہاں؟'' میری این نے کہا۔

''وہ... دراصل، مجھے تمھاری ضرورت ہے، یعنی تمھاری نہیں، بلکہ کچھ کپڑوں کی جو میں استری

کرسکوں۔ کیا میں تمھارے گھر آ سکتا ہوں؟''

''نہیں نہیں!'' میری این نے فوراً کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے فلیٹ پر اینسلے یا پیٹر سے اس لڑکے کا اچانک سامنا ہو جائے۔ ''میں خود تمھیں کپڑے پہنچا دوں گی۔''

10

اسے ڈنکن کے گھر کا راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ میری این کچھ کپڑوں کا چھوٹا سا بنڈل اٹھائے وہاں پہنچ گئی۔ ڈنکن گھر میں اکیلا تھا۔ اس نے استری لگائی اور بہت انہماک سے استری کرنے لگا۔ میری این ایک کرسی پر بیٹھی اسے خاموشی سے تکتی رہی۔ پھر وہ بالوں میں کنگھا کرنے کے لیے غسلخانے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ غسلخانے کا آئینہ ٹوٹ چکا تھا۔ دیوار پر کچھ کرچیاں لگی رہ گئی تھیں۔

جب وہ واپس آئی تو ڈنکن نے کہا، ''تم سوچ رہی ہو گی کہ آئینہ کیسے ٹوٹ گیا۔ دراصل میں نے توڑ ڈالا۔''

''واقعی؟'' میری این نے کہا۔

''ہاں، میں خوفزدہ ہونے سے اکتا گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے آئینے میں اپنا عکس نظر ہی نہیں آتا تھا۔''

''تو اب تم شیو کیسے بناتے ہو؟'' میری این نے پوچھا۔

اوہو! وہ... میرا اپنا ذاتی آئینہ جو ہے!'' ڈنکن مسکرایا۔ ''اس میں مجھے ہمیشہ اپنا عکس نظر آ سکتا ہے۔''

اس نے آخری لباس استری کر کے تہہ کیا اور میری این کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے بہت اداسی سے کہا:

''میرے خیال میں تم کو میری ہر بات کا یقین آ گیا، ہیں نا؟''

مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہا ہے یا مجھے چکرانے کی کوشش میں ہے۔ میں نے کہا، ''کن باتوں پر؟''

Scanned with CamScanner

''یہی ... آئینہ توڑنے کے قصے پر۔ یہی تو مصیبت ہے! لوگ میری ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں۔ میں تو یتیم بھی نہیں ہوں... میرے تو دونوں ماں باپ زندہ ہیں... کہیں نہ کہیں وہ رہتے بھی ہیں۔ کیا تم یقین کرو گی؟''

11

میری این باورچی خانے میں بیٹھی ایک چمچے سے مونگ پھلی کا مکھن کھا رہی تھی۔ دو دن پہلے پیٹر کے ساتھ ڈنر پر باتیں کرتے ہوئے جب پیٹر نے کہا تھا کہ بچوں کی کبھی کبھی پٹائی کرنا ضروری ہوتا ہے، تو اسے اچانک خیال آیا تھا کہ جو گوشت وہ کھا رہی ہے وہ دراصل ایک گائے کی ران ہے جس سے خون رس رہا ہے۔ اسے اس قدر متلی آئی تھی کہ وہ اب اسٹیک یا چکن، کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف لین تھا۔

''میری این، کیا یہ تم ہو؟''

''ہاں،'' میری این نے کہا۔

''اچھا...'' وہ جھجک کر بولا۔ ''میں... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں آسکتا ہوں؟''

''لیکن اینسلے گھر پر نہیں ہے،'' میری این نے کہا۔

''یہ تو بہتر ہے۔ ہم اکیلے میں باتیں کریں گے۔''

اور تھوڑی دیر میں وہ واقعی پہنچ گیا۔ وہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ میری این نے اس کا استقبال کیا اور پوچھا، ''کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں،'' لین نے کہا۔ ''لیکن ڈرنک چلے گی۔ کچھ ہے؟''

میری این باورچی خانے سے ایک بیئر کی بوتل ڈھونڈ کر لے آئی۔ لین نے بوتل کھولی اور منہ سے لگالی۔ پھر اس نے کہا، ''کرائسٹ! اس کی اس وقت کتنی ضرورت تھی۔'' اس نے بوتل میز پر ٹکاتے ہوئے کہا، ''اس نے... اینسلے نے تم کو بتایا؟''

''یعنی یہ کہ... وہ حاملہ ہوگئی ہے؟'' میری این نے پوچھا۔

لین نے زور سے آہ بھری۔ ''میری تو سن کر جان ہی نکل گئی۔ دو تین ہفتوں سے وہ مجھ سے مل

نہیں رہی تھی۔ میں نے خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تو اس نے یہ دھما کا کر دیا... اوہ میری این!... بس! خدا جانے یہ مجھ سے کیسے ہو گیا... وہ اتنی کمسن ہے! مجھے زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ اف! اب کیا کرنا چاہیے؟''

میری این خاموشی سے لین کو دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ لین کو سچ بتا دے یا نہ بتائے۔

لین پھر شروع ہو گیا۔

''دیکھو، ظاہر ہے میں اس سے شادی تو نہیں کر سکتا... لیکن... اگر معاملہ رفع دفع کر دیا جائے تو سارے اخراجات میں بہت خوشی سے برداشت کرلوں گا... میری این، کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتیں؟ میرے لیے... پلیز... ویسے میں اس پر ڈورے تو ڈال رہا تھا، لیکن... یہ حمل وغیرہ... تمھیں کچھ کرنا ہوگا میری این۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ممکن ہے،'' آخر میری این نے کہہ ڈالا۔ ''اس پورے افیئر کا مقصد ہی یہ تھا کہ اینسلے حاملہ ہونا چاہتی تھی۔''

''کیا؟ کیا ہونا چاہتی تھی؟'' لین نے اپنے کانوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے کہا۔

''حاملہ! یہ حمل اس نے کافی منصوبے بنا کر ٹھہرایا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' لین کا منھ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟'' آخر اس نے کہا۔

''حماقت نہیں،'' میری این نے کہا۔ ''بچہ پیدا کرنا آج کل فیشن میں دوبارہ آ گیا ہے۔ اینسلے نئی کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ کالج میں بھی اسے کتابوں کا بہت شوق تھا۔ نیا نظریہ یہ ہے کہ نسوانیت کے لیے بچہ پیدا کرنا بہت ضروری ہے... لیکن تم کیوں گھبراتے ہو؟ وہ نہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے اور نہ بچے کے اخراجات کا مطالبہ کرے گی، لہٰذا جو کچھ تم اس سلسلے میں کر سکتے تھے وہ تم کر چکے ہو۔''

لین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس نے اپنا چشمہ لگایا اور میری این کو دیکھا، پھر چشمہ واپس اتار لیا۔ ایک وقفے میں اس نے کچھ اور بیئر پی۔ ''اچھا، تو وہ کالج کی گریجویٹ ہے؟ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ خوب! تو پھر یہ نتیجہ ہے،'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا، ''عورتوں کو تعلیم دلانے کا... ان کے دماغ میں اس قسم کے احمقانہ خیال بھر جاتے ہیں۔''

میری این نے ذرا تیز ہو کر کہا، ''واقعی! ویسے تعلیم سے بعض مردوں کو بھی کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔''

''یعنی مجھے؟'' لین نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کس قسم کی دوست ہو؟''

''میں تمھیں ہرگز نہ بتاتی کہ تم کو اینسلے کے ساتھ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تمھاری ذاتی زندگی ہے،'' میری این نے ہمدردی سے کہا۔ ''لیکن تمھیں پریشانی کس بات کی ہے؟ اینسلے تم پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالے گی۔ یقین کرو، اس کے بعد وہ سب کچھ خود ہی سنبھالنے کے اچھی طرح قابل ہے۔''

لین کا موڈ سرعت سے الم زدگی سے غیظ و غضب میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ''حرامزادی!'' وہ پھنکارا، ''مجھے ایسے جال میں پھنسا دیا، گڑھے میں گرا دیا!''

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''چپ!'' میری این نے کہا۔ ''وہ آ گئی ہے۔''

وہ اینسلے ہی تھی، خوشی سے پھولی نہ سماتی ہوئی، دونوں ہاتھوں میں سودے سلف کے بیگ سنبھالے۔

''میری این، میری این... دیکھو میں کیا کیا لائی ہوں۔ اب مجھے منے کے لیے بھی غذائیت بھری چیزیں کھانی ہیں۔ میں وٹامن کی گولیاں لے آئی ہوں اور ننھے منے سویٹروں کے ڈھیر سے ڈیزائن بھی۔ اتنے پیارے ہیں... اوہ! تو تم یہاں آئے ہوئے ہو؟'' اس کی آواز سے ایسا اطمینان برس رہا تھا کہ لین اور میری این دہل گئے۔ اینسلے نے ادا سے کہا، ''لین... ذرا سوچو... میں ماں بننے والی ہوں۔ اف، میں اس قدر خوش ہوں!''

لین غصے میں بلے کی طرح پھول رہا تھا اور اس کے بال بھی کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ پھنکارا، ''لیکن میں ذرا بھی خوش نہیں ہوں، نہیں! تم نے مجھے استعمال کیا ہے۔ میں استعمال کیا گیا ہوں۔ تمھیں مجھ میں دلچسپی نہیں تھی۔ صرف اس میں... اس میں... میرے بدن... بدن میں دلچسپی تھی اور یہ کہ تم... اس سے کیا حاصل کر سکتی ہو۔''

Scanned with CamScanner

''اوووہ!'' اینسلے نے قہقہہ لگایا۔ ''اور تم کو کس چیز میں دلچسپی تھی؟ کیا تمھیں بھی صرف میرے بدن میں دلچسپی نہیں تھی؟ لیکن گھبراتے کیوں ہو؟ میں تم پر کوئی مقدمہ دائر کرنے نہیں جا رہی ہوں۔ فکر مت کرو۔''

لین اینسلے سے کافی فاصلے پر پنجرے میں بند چیتے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ ''فکر...'' اس نے کہا۔ ''نہیں... تم نے مجھے پھنسا لیا ہے اینسلے! تم نے... مجھے ورغلایا۔'' یہ خیال لین کے لیے اتنا نیا تھا کہ لفظ ''ورغلایا'' کہہ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔

''لین!'' اینسلے نے ڈپٹ کر کہا۔ ''تم رحمِ مادر سے مردانہ حسد کی ایک کلاسیکل مثال پیش کر رہے ہو۔''

''خاموش!'' لین نے اسے گھڑک کر کہا۔ ''مجھے متلی ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک مت آنا۔ تم... تم ناپاک ہو چکی ہو۔''

وہ بڑے سے صوفے پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ میری این مادرانہ شفقت سے اس کی طرف دوڑی اور بازوؤں میں اسے جھلانے لگی اور سرگوشیوں میں کہنے لگی:

''نہیں نہیں، کچھ نہیں ہوگا لین۔ ایک پیارا سا بچہ... بس ایک بہت پیارا بچہ۔''

میری این خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ لین بے نقاب ہو گیا ہے۔ وہ ایک کینچوے کی طرح بل کھا رہا ہے۔ فرض کیجیے کہ اسے پتا نہ چلتا کہ یہ سب اینسلے کا منصوبہ تھا؟ حاملہ تو وہ منصوبے کے بغیر بھی ہو سکتی تھی۔ لین کو غصہ اس بات پر ہے کہ ہم بستری اس کا نہیں بلکہ اینسلے کا منصوبہ تھا۔

لین اینسلے کے بازوؤں سے خود کو چھڑا کر زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا نیچے بھاگ گیا۔

12

''جیلی ہے، مچھلی، پی نٹ بٹر، شہد اور انڈوں کا سلاد... کیا لو گی؟'' مسز گروٹ نے پلیٹ میری این کی ناک میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

دفتر میں کرسمس سے پہلے دی جانے والی کرسمس پارٹی ہو رہی تھی۔ اس کے شعبے میں تو عورتیں

Scanned with CamScanner

ہی عورتیں تھیں جو جائزوں کے لیے سوالنامے بناتی ہیں اور ان کے جوابات کو حل کرتی ہیں۔ فیصلہ کرنے والے لوگ اوپر کی منزل پر بیٹھتے تھے اور سب مرد تھے۔ نچلی منزل پر مشینیں چلانے والے مرد اور عورتیں تھیں۔ کمپنی اب اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ سب کی اکٹھی کرسمس پارٹی تک نہیں ہوسکتی تھی۔ اب شعبہ جاتی پارٹیاں ہوتی تھیں۔

میری این کسی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ اب اس کا معدہ کوئی بھی غذا قبول نہیں کرتا۔

''جیلی پلیز،'' اس نے کہا۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ عورتیں: جوان، کنواری، بوڑھی، شادی شدہ، طلاق یافتہ، بیوائیں، موٹی عورتیں، دبلی پتلی عورتیں... آج کی پارٹی کے لیے زرق برق لباس پہنے، آنکھوں پر سنہری روپہلی آئی شیڈو، ان کے اپنے بنائے ہوئے کیک، سینڈوچ، کسٹرڈ کھاتی ہوئی، ٹشو پیپر سے انگلیاں اور ہونٹوں کے کنارے صاف کرتی ہوئی، طرح طرح کی کیمیائی خوشبوؤں میں بسی ہوئی عورتیں...

اچانک مسز گروٹ نے تالی بجائی۔ ''اوٹر کیو... اب ایک خوش خبری!''

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ مسز گروٹ نے مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھ کر کہا، ''میری این کی بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔ ہماری بہترین خواہشات!''

عورتوں نے غور سے سنا اور ذرا سی دیر میں چہچہاتے ہوئے خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے وہ سب میری این پر ٹوٹ پڑیں۔

''مبارک، مبارک مبارک!'' میری این مسلسل گلے مل رہی تھی، سوالوں کی بھرمار کے چھوٹے چھوٹے جوابات دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ یہ تمتماہٹ حیا کی نہیں، ایک ناقابل فہم غصے کی تھی۔ آفس کی تمام کنواریاں دراصل شادی ہی تو کرنا چاہتی تھیں۔ صحیح آدمی کیسے ملے، کہاں ملے، سب کا یہی مسئلہ تھا، اور میری این نے ان پر سبقت حاصل کرلی تھی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلی تو یخ بستہ ہوا کا تھپیڑا اس کے پورے جسم پر کوڑے کی طرح پڑا۔ اتنی دیر میں خاصی برفباری ہوچکی تھی۔ سردیوں کی نیم تاریک شام تھی مگر ہر طرف کرسمس کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اسے گھر پہنچ کر اپنا سوٹ کیس پیک کرنا تھا کیونکہ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ

Scanned with CamScanner

گھر جا رہی تھی جہاں سب اس کے منتظر تھے۔ سڑک پر تازہ گری ہوئی برف میں اس کے پیر ٹخنوں تک دھنس رہے تھے۔ اس کے جوتے گیلے ہو چکے تھے، لیکن اس ٹی پارٹی کے بعد اس کا دل فوراً اپنے اپارٹمنٹ میں جانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھلی فضا میں گزارنا چاہتی تھی۔ میری این زیر زمین دوز ریل سے ایک اسٹاپ پہلے اتر گئی۔ اس نے مغربی سمت میں چلنا شروع کیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ یہ راستہ کہاں لے جائے گا۔ اس نے پیٹر کے لیے کرسمس گفٹ کے بارے میں بہت غور وخوض کیا تھا، پھر کچھ سمجھ نہ آنے پر کیمروں کے بارے میں ایک بہت مہنگی کتاب خرید لی تھی۔ چلتے چلتے وہ سوچ رہی تھی کہ خدا کرے یہ پہلے سے اس کے پاس نہ ہو۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ پارک کے پاس آ نکلی ہے۔

میری این پارک میں داخل ہوگئی۔ یہاں برف، جس پر ابھی کوئی نہیں چلا تھا، اس کے ٹخنوں سے بھی اونچی تھی۔ اس کے پیروں میں سردی سے درد ہونے لگا۔

پارک میں بہت کم روشنی تھی۔ وہ ایک وسیع وعریض نیم جزیرے کی طرح تھا جس کے چاروں طرف روشنی کا سمندر تھا۔ اُس پار یونیورسٹی کی عمارت تھی جو اسے عداوت سے گھور رہی تھی۔ عداوت میری این کے اپنے دل سے پھوٹ رہی تھی۔ گریجویشن کرنے کے بعد میری این کی خفیہ خواہش تھی کہ یونیورسٹی کی عمارت صفحہ ہستی سے غائب ہو جائے، لیکن وہ اپنی جگہ قائم تھی۔

میری این خاموشی سے چلتی گئی۔ شام کی نیم تاریکی میں درختوں کے تنے سیاہ نظر آرہے تھے، جیسے بہت سی دیوہیکل سیاہ موم بتیاں ہر طرف لگا دی گئی ہوں۔

میری این فوارے کے پاس خاموشی سے کھڑی ہوگئی۔ دور سے شہر کی دبی دبی آوازیں پارک کے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

''ہیلو!'' کسی نے کہا۔

میری این نے مڑ کر دیکھا۔ دور بنچ پر کوئی بیٹھا تھا۔ میری این اس کی طرف چلنے لگی۔ اسے تعجب تک نہیں ہوا کہ وہ ڈنکن ہی تھا، ہمیشہ کی طرح کندھے جھکائے ہوئے۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ روشن تھا۔ وہ کافی دیر سے وہاں بیٹھا ہوگا۔ اس کے بالوں اور کاندھوں پر برف گرتی رہی تھی جسے اس نے جھاڑا تھا لیکن اس کے ذرّے اب بھی موجود تھے۔ میری این نے دستانے اتار کر اس

Scanned with CamScanner

کے ہاتھ چھوئے تو وہ ٹھنڈے اور گیلے تھے۔

میری این بنچ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ڈنکن کے اوورکوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے آپ کو اس کے کوٹ میں سما دیا۔ وہ ایک بالوں والا سویٹر پہنے تھا۔ میری این اسے سہلانے لگی۔ ڈنکن نے اس کی کمر کو بازوؤں کے حلقے میں مضبوطی سے بھینچ لیا۔

ایک دوسرے سے لپٹے، شام کی نیم تاریکی میں نہ جانے وہ کب تک بیٹھے رہے۔

''تم نے آنے میں اتنی دیر لگائی،'' ڈنکن نے کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ تم آؤ گی۔''

میری این کے پیروں میں سردی سے درد ہو رہا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا بھی رہی تھی۔ اس نے ڈنکن کو زور سے بھینچا۔

''اب مجھے واپس جانا چاہیے،'' اس نے کہا۔

پھر وہ اٹھی اور زمین دوز ریل کے اسٹیشن کی طرف چل دی۔

13

میری این پیٹر سے منگنی کے بعد اس سے زیادہ ملتی رہی تھی لیکن پیٹر اب اسے اپنے دوستوں اور واقف کاروں سے ملانا چاہتا تھا، اس لیے اب وہ کم ہی اکیلے ہوتے تھے۔ پیٹر اسے دفتری پارٹیوں میں لے جانے لگا تھا جہاں مستقبل میں کامیاب ہونے والے وکیل، مستقبل میں کامیاب ہونے والی بیویوں کے ساتھ، موجود ہوتے تھے۔ وہ اب ایک منگنی کی انگوٹھی بھی پہننے لگی تھی، لیکن عادت نہ ہونے کے باعث اکثر اتار دیتی تھی۔

میری این چاہتی تھی کہ اسے اپنے دوستوں سے بھی ملائے۔ بدنصیبی سے وہ پیٹر کے حلقۂ احباب سے اتنے زیادہ مختلف تھے۔ ایک بار اس نے کلارا اور جو کو کھانے پر بلایا۔ انھیں بے بی سٹر نہ مل سکی۔ وہ بچوں کو ساتھ لے آئے اور سارا وقت ان کے پوتڑے بدلنے میں گزر گیا۔ پیٹر کی جو سے دوستی نہ ہو سکی۔ میری این نے سوچا، جو تصور پرست ہے اور پیٹر حقیقت پسند ہے۔ وہ ڈنکن سے ملتی رہتی تھی۔ اس نے ڈنکن کو بتا دیا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے، اور ڈنکن سے تو اس کی محض دوستی ہے۔ ڈنکن پر اس انکشاف کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ سپاٹ سا چہرہ لیے اس نے کہا تھا، ''اچھا!''

Scanned with CamScanner

''تم کسی ایسی لڑکی سے دوستی کیوں نہیں کرتے جو انگریزی ادب میں گریجویشن کر رہی ہو؟''
اس نے ایک دن پوچھا تھا۔

''وہ خود ٹرم پیپر لکھ رہی ہیں اور مجھ سے بھی بڑھ کر آفت زدہ ہیں،'' ڈنکن نے آہ بھر کر کہا تھا۔
پھر اس نے کہا تھا، ''ٹریور اور فش خود کو میرے والدین تصور کرتے ہیں۔ لیکن تمھیں پسند کرتے ہیں۔
وہ تم کو بہتر طور پر جاننا چاہتے ہیں۔ وہ تمھیں ڈنر پر مدعو کر رہے ہیں۔ کیا تم آؤ گی؟''

''کیوں نہیں،'' میری این نے کہا تھا۔

اور ایک دن وہ پیٹر کو غچہ دے کر ان کے گھر ڈنر پر جا پہنچی۔

''آیئے، آیئے،'' ٹریور نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ''بے حد خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔
پر تکلف کھانا تو نہیں ہے، بس دال روٹی سمجھیے۔'' اس نے ہوا کو سونگھا اور چونک کر ''اوہ!'' کہتا ہوا
باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ کمرے میں فش اپنی کرسی پر بیٹھا کچھ لکھنے میں منہمک تھا۔

ٹریور ایک ٹرے میں کرسٹل کے گلاسوں میں شیری کے جام لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا
اور سب کو پیش کرنے لگا۔

''کتنے خوبصورت گلاس ہیں،'' میری این نے کہا۔

''ہاں۔ یہ کئی صدی سے ہمارے خاندان میں ہیں۔ کتنے نفیس ہیں! نفاست اس ملک سے
غائب ہو رہی ہے،'' اس نے میری این کے کان کی طرف گھورتے ہوئے کہا اور دوبارہ باورچی خانے
میں غائب ہو گیا۔

فش نے اپنا قلم رکھ دیا۔ اب وہ میری این پر نظریں جمائے ہوئے تھا، لیکن اس کے چہرے
پر نہیں بلکہ اس کے پیٹ پر، کہیں ناف کے پاس، وہ انہماک سے تکے جا رہا تھا۔

میری این نے گھبرا کر کہا، ''ڈنکن کہہ رہا تھا کہ آپ بیٹرکس پوٹر پر کچھ تحریر کر رہے ہیں؟''

''ہیں؟ لیکن پھر میں لوئیس کیرول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایلس ان ونڈر لینڈ...'' اس نے
سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آواز اس کی گھنی ڈاڑھی کی گہرائیوں سے ابھرنے لگی: ''ہر
شخص جانتا ہے کہ ایلس دراصل جنسی بحران کی داستان ہے۔ وہ داخل ہوتی ہے، خرگوش کے نہایت
علامتی بھٹ میں،'' اس نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک کے بعد دوسرا جنسی کردار ابھرتا ہے، لیکن

Scanned with CamScanner

ایلس کسی کو قبول نہیں کرتی۔ وہ کینچوے سے ملتی ہے، جو چھ انچ کا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کھمبی کی نسوانی علامت پر بیٹھا ہے اور پھر کیک کھانے سے وہ بڑی یا چھوٹی ہو جاتی ہے... جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا...''

ایک دبی دبی ''ہی ہی ہی'' نے ٹریور کی خود کلامی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ڈنکن کمرے کے دروازے میں کھڑا ہنس رہا تھا۔ اتنے میں ٹریور لپ جھپ کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا یہ پھر ان منحوس علامتوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے؟ میرے خیال میں اصل چیز اسلوب ہے۔ مگر فش پینے کے بعد اپنے آپے میں نہیں رہتا،'' اس نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔'' تازہ ترین رائے کے مطابق یہ کتاب تو بس ایک پیاری سی بچوں کی کہانی ہے۔ ڈنکن، پلیز، میز لگانے میں میری مدد کرو۔''

ڈنکن نے میز پر سفید میز پوش بچھایا اور کھانے کے کافی قیمتی برتن سجانے لگا۔

''اب ڈنر آیا ہی چاہتا ہے!'' ٹریور نے نعرہ مارا۔

ٹریور کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی نیلی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے ڈنر کی میز پر موم بتیاں جلا دیں۔

میری این خوش تھی کہ ڈنر موم بتیوں کی مدھم روشنی میں ہو گا۔ وہ کھانے کی چیزیں چپکے چپکے میز کے نیچے پھینکتی جائے گی اور شاید کوئی نہ دیکھ پائے۔ وہ کچھ بھی نہیں کھا سکتی تھی، اسے الٹی ہو جاتی تھی۔ کئی دن سے وہ وٹامن کی گولیوں اور کافی پر گزارا کر رہی تھی۔

میز پر بڑے جھینگوں کی کاک ٹیل رکھی تھی۔ ٹریور باورچی خانے کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب نے کھانا شروع کیا۔

میری این نے کہا،'' یہ برتن بہت خوبصورت ہیں۔ افوہ! آپ نے اتنا تکلف کیا۔''

ٹریور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میری این نے سوچا، وہ سب درست باتیں کہہ رہی ہے۔ وہ کافی مطمئن ہوئی۔ ٹریور نے جھینگے کے برتن میز سے ہٹا کر سوپ کی پلیٹیں لگائیں۔ تب فش نے آغاز کیا۔

''میرے تھیسس کا موضوع... اگر یہاں پسند نہ کیا گیا تو میں امریکہ میں شائع کروالوں گا۔ یہ بڑا انقلابی موضوع ہے۔ مالتھیوزا اور تخلیقی استعارہ! یہ میرا موضوع ہے۔ بڑھتی ہوئی شرح پیدائش کے

ساتھ ادبی نقادوں کا شاعری کی جانب رویہ بدل رہا ہے۔ نتیجتاً شاعری بھی بدل رہی ہے۔ میں تو اس کا اطلاق تمام فنونِ لطیفہ پر کر سکتا ہوں۔ یہ ایک بین الموضوعاتی مقالہ ہوگا۔ یہ اقتصادیات، علمِ نباتات اور ادبی تنقید کا حیران کن امتزاج ہوگا۔ یقیناً مجھے کچھ اعداد و شمار جمع کرنے ہوں گے، لیکن ابھی تو میں ابتدائی خاکہ تیار کر رہا ہوں۔ کچھ قدیم اور چند جدید دانشوروں کی کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔''

میز کے دوسرے گوشوں میں ٹریور میری این سے کچھ کہے جا رہا تھا۔ میری این کے کان اس کی باتوں پر اور نظریں فشر کے چہرے پر لگی تھیں۔ ڈنکن کسی پر بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ فشر کہہ رہا تھا:

''آج کل معاشرہ پیدائش کے خلاف ہو گیا ہے۔ یہ سب مالتھیوز کا کیا دھرا ہے، حالانکہ...''

اس نے پلیٹ سے سوپ پیتے ہوئے کہا۔ ''آج کل تو آپ جانتی ہیں، جنگ، وباؤں یا قحط سے کرۂ ارض کی آبادی پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں۔''

''اوہ!'' وہ چیخ مار کر باورچی خانے کی طرف دوڑا، لیکن مڑ کر اتنا ضرور کہا، ''مگر پیدائش نہایت حسین و جمیل عمل ہے۔ ہمیں ایک زہرہ کی ضرورت ہے جو حمل سے ہو، بچہ پیدا کرے اور دنیا کو تخلیقی عمل سے دوبارہ سرشار کر دے۔''

اتنے میں ٹریور باورچی خانے سے دو شعلے برساتی تلواروں کو دونوں ہاتھوں میں تھامے نمودار ہوا۔ یہ دراصل سیخیں تھیں جن میں کباب پروئے ہوئے تھے جن سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ میری این اتنی دیر میں اپنا سوپ گملے میں گرا چکی تھی۔ ڈنکن نے سوپ کی پلیٹیں میز سے ہٹا کر ڈنر کی پلیٹیں لگا دیں۔ سیخیں پلیٹوں پر رکھ دی گئیں۔ میری این سیخوں سے کباب نکال نکال کر ڈنکن کی پلیٹ میں پھینکنے لگی۔ فشر کہے جا رہا تھا، ''بیسویں صدی کی رومانی تحریک ان سب سے متاثر ہوئی تھی۔'' لیکن زیادہ تر بوٹیاں نشانے پر جانے کے بجائے فرش پر گر رہی تھیں اور بیچارے طالب علموں کے ٹرم پیپر، جو فرش پر بچھے ہوئے تھے، اب تیل اور مصالحوں سے لتھڑ چکے تھے۔

واپسی پر ڈنکن نے کہا کہ وہ اسے آدھے راستے تک چھوڑ دے گا۔

اب وہ پھر نیلی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ان کے جوتوں تلے برف چرمرا رہی تھی۔

''بہت دلچسپ!'' میری این نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پوری شام کسی نے اس کے بارے میں ایک سوال بھی نہ پوچھا، جبکہ کہا گیا تھا کہ وہ اسے بہتر جاننا چاہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ڈنکن نے مایوسی اور طنزیہ انداز میں کہا، ''اب تم سمجھ سکتی ہو کہ میں گھر سے باہر زیادہ سے زیادہ وقت کیوں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''آخر تم ان کے ساتھ رہتے کیوں ہو؟'' میری این نے پوچھا۔

''وہ میرا اتنا خیال جو رکھتے ہیں،'' ڈنکن نے کہا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا، ''بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ زندگی میں کوئی چیز اصلی، حقیقی بھی ہو۔ خیر ہر چیز تو حقیقی نہیں ہو سکتی، یہ تو ناممکن ہوگا، لیکن کم از کم ایک یا دو چیزیں تو اصلی ہوں، سچ مچ کی... حقیقی!''

تھوڑی دور جا کر وہ رک گیا۔ پیلی روشنی میں اس کا چہرہ نصف سائے میں تھا۔

''میں اب چلا۔'' اتنا کہہ کر وہ مڑا اور رات کی گہری نیلاہٹ میں غائب ہو گیا۔

میری این زمین دوز ریل کے اسٹیشن تک آدھے راستے سے اکیلی آئی۔ اس نے ٹکٹ خریدنے کے لیے پرس سے ریزگاری نکالی اور اپنی منگنی کی انگوٹھی واپس پہن لی۔

14

اینسلے سر تھامے بیٹھی تھی۔ ''میری این!'' اس نے کہا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' میری این نے پوچھا۔ اینسلے زچگی سے پہلے رہنمائی کے لیکچروں کو خاص طور پر سنتی تھی۔ وہ ابھی ابھی ایسے ہی ایک سیشن سے واپس آئی تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ''انھوں نے کہا... ان کا کہنا ہے...'' اینسلے نے کہنا شروع کیا۔

''ہاں ہاں!!'' میری این نے اس کا دل بڑھایا۔

میری این...... ان کا کہنا ہے کہ بچے کو ایک تصورِ پدر، ایک فادر فگر کی شدید ضرورت ہوتی ہے، ورنہ اس میں نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، طرح طرح کی بیماریاں... اس لیے... باپ کا ہونا بے حد... بے انتہا ضروری ہے... ان کے پاس تمام اعداد و شمار تھے۔''

''اچھا؟ تو پھر... اب تم کیا کرو گی؟'' میری این نے خالی دماغ سے پوچھا۔

''جو کرنا چاہیے،'' اینسلے نے آہنی عزم سے کہا۔

Scanned with CamScanner

15

پیٹر شادی سے پہلے اپنے سب دوستوں اور ان کی بیویوں کی پارٹی کر رہا تھا۔ اس نے میری این سے کہا تھا، ''پارٹی کے لیے ذرا اپنے بال سیٹ کروالینا اور لباس... ہاں، لباس بھی ذرا مختلف خرید لو... اتنا بدرنگ، بدمزہ نہیں جیسا تم عام طور پر پہنتی ہو۔''

ایک عجیب سعادت مندی سے میری این نے پارلر میں جا کر بال سیٹ کروائے تھے۔ پارلر والے عجیب سے آدمی نے اس کے سر پر ایک گھونسلا جیسا بنا دیا تھا۔ اس نے پارٹی کے لیے ایک سرخ، ستاروں والا ڈریس خریدا تھا جسے پہن کر وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آسکتی۔ اس شام بال سیٹ کروا کر لباس بدلنے کے لیے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو مالکۂ مکان کے ڈرائنگ روم میں بیسیوں معمر خواتین تہوار کے دن جیسا میک اپ کیے اور ریشمی ملبوس پہنے جمع تھیں۔ شاید وہ کرسچین خواتین کی کسی تنظیم کی رکن تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ٹی پارٹی ہو رہی تھی۔ ''بچی'' عنابی مخمل کی فراک پہنے، جس پر لیس کا کالر لگا ہوا تھا، سب کو کیک پیش کر رہی تھی۔

میری این دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی تو اسے اینسلے اور لین کی اونچی آوازیں سنائی دیں۔

''اف خدایا!'' لین چلایا۔ ''اور اب یہ چاہتی ہے کہ میں اس سے شادی کرلوں۔''

''تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارا بیٹا ہومو بن جائے؟'' اینسلے نے جواب کا مطالبہ کیا۔

''بھاڑ میں جائے... مجھے نہیں چاہیے بیٹا۔ نہ ہومو، نہ ہیٹرو... کسی قسم کا بیٹا نہیں چاہیے۔ تم اس سے چھٹکارا حاصل کرو۔ کوئی نہ کوئی گولی تو ایسی ہوتی ہوگی جس کے کھانے سے...''

''یہ اصل سوال نہیں ہے،'' اینسلے دھیرج سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''بچہ تو ہونا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس کو بہترین حالات کیسے دے سکتے ہیں۔ یہ تمھاری ذمے داری ہے کہ تم ایک باپ بنو۔ اسے ایک طاقتور تصورِ پدر دو۔''

لین تیزی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ''کتنے کا ملتا ہے تصورِ پدر؟ میں خریدوں گا، جتنے کا بھی ملے... مگر میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ ہرگز نہیں... کسی قیمت پر نہیں... نہ ہی میں

Scanned with CamScanner

ذمے دار ہوں۔ یہ تم نے خود کیا ہے... صرف تم نے۔''

''تمھارا خیال یہ نہیں تھا۔ تم سمجھ رہے تھے کہ تم نے مجھے ورغلایا اور حادثاتی طور پر ایسا ہو گیا۔ اگر میں تم کو نہ بتاتی تو پھر؟ پھر تو تم خود کو ذمے دار سمجھتے، بلکہ سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا تم ذمے دار ہو۔''

''جھوٹ مت بولو!'' لین نے چیخ کر کہا۔

''اتنا مت چیخو تم لوگ،'' میری این نے کہا۔ ''مالکۂ مکان سن لے گی تو جینا اجیرن کر دے گی۔''

''ارے مالکۂ مکان کو تو میں ابھی... کروں!'' لین وحشت سے چلایا۔

مالکۂ مکان کے بارے میں یہ ارادہ سن کر میری این اور اینسلے بھونچکی ہو کر رہ گئیں۔ یہ تو صریحاً کلمۂ کفر تھا۔ پھر اس امکان پر غور کر کے دونوں نے جو کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کیا تو وہ مارے ہنسی کے دوہری ہو گئیں۔

لین کے نزدیک یہ نسوانی گستاخی کی آخری انتہا تھی۔ اسے اس درجہ دق کر کے یہ دو عورتیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی ہیں۔ اس نے جھپٹ کر اپنا کوٹ اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

''تم اور تمھاری تولیدی پوجا جائے بھاڑ میں! میں اب ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رک سکتا۔''

اینسلے نے جو تصورِ پدر کو اس طرح ہاتھ سے نکلتا دیکھا تو وہ اس کے پیچھے دوڑی۔

''ارے سنو تو... جانی! ہم بات چیت کرتے ہیں۔ سب کچھ طے ہو جائے گا۔''

اسی ہڑبونگ میں لین کا کوٹ کہیں پھنس گیا۔ کوئی چیز دھڑ سے فرش پر گری۔ تمام بوڑھیاں، ریشمی لباس اور موتی کے نیکلس پہنے باہر نکل آئیں۔ لین معمر خواتین میں پھنس گیا۔ وہ اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اسے اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ اس نے چیخنا شروع کیا:

''تم ساری پنجے دار ناگنو! آدم خور نیو! کتیو! تم سب جہنم میں جاؤ۔ سب کی سب! تم سب بالکل ایک جیسی ہو۔'' وہ اینسلے سے اپنی آستین چھڑا کر تیر کی طرح بھاگا۔

ان گالیوں پر معمر خواتین کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

''میں تمھارے ہاتھ نہیں آؤں گا!'' جاتے جاتے لین نے چیخ کر کہا۔

''بلاشبہ... نوجوان عالمِ سکر میں ہے،'' مالکۂ مکان نے متانت سے کہا۔

Scanned with CamScanner

میری این اور اینسلے رنگ برنگے پرندوں کی ٹولی کی طرح چہچہاتی بڑی بوڑھیوں کو وہیں چھوڑ کر اوپر آ گئیں۔ اینسلے کے چہرے پر دوبارہ عزمِ بالجزم کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے میری این سے کہا:

''میں نہیں سمجھتی کہ لین بچے کے لیے ایک اچھا باپ ثابت ہوگا۔ پھر بھی... ایک آخری کوشش تو میں کروں گی ہی۔''

میری این کو خیال آ رہا تھا۔ صبح سر پر بالوں کا گھونسلا بنوانے سے پہلے اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا تھا کہ پارٹی میں اس کا جاننے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔ اس گھبراہٹ میں اس نے اپنے سب دوستوں اور ڈنکن کو بھی فون کر ڈالا تھا۔ ڈنکن نے کہا تھا، ''ٹریور اور فش برا مانیں گے۔''

''او ہو! تو بھئی دونوں کو میری طرف سے دعوت دے دو۔'' اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کیسی حماقت کی، پیٹر دل میں کیا سوچے گا! اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا! لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

16

پارٹی کی چہل پہل، کامیاب افسران، کامیاب بیویوں کے ساتھ، اسکاچ کی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے، مسکراتی ہوئی میری این بیویوں کے اوورکوٹ اتروا کر بیڈروم میں اوپر تلے رکھتی ہوئی، اس کے دفتر کی خواتین بہترین ملبوسات اور میک اپ میں۔

پیٹر نے اپنے نئے نویلے سسٹم پر ریکارڈ لگا دیا تھا۔ کمرے میں غضب کا شور تھا۔ کلارا اپنے ساتھ لین کو بھی لے آئی تھی جو پہلے ہی کچھ نشے میں نظر آ رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میری این نے دروازہ کھولا تو ٹریور حیران کھڑا تھا۔ ''کیا یہ... کسی مسٹر پیٹر کا گھر ہے؟''

''جی ہاں،'' میری این نے کہا۔ ''ویسے میں میری این ہوں۔''

''او ہو ہو ہو!'' ٹریور زور سے ہنسا۔ ''آپ پہچانی نہیں جا رہی ہیں۔ نہایت حسین لگ رہی ہیں، پیاری خاتون، آپ پر سرخ رنگ سجتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

ٹریور اور فش اندر آ گئے لیکن ڈنکن باہر کھڑا رہا۔ اس نے میری این کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک میری این کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا، ''تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مہمان بھیس بدل کر آئیں گے۔ تم کون سے کردار کا روپ بھر رہی ہو؟''

میری این نے مایوسی سے کندھے جھٹکے۔ ''اندر آؤ،'' اس نے کہا، ''پیٹر سے ملو۔''

''نہیں،'' ڈنکن نے صاف جواب دے دیا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوگا۔ ہم دونوں میں سے ایک بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ شاید... میں... میں جا رہا ہوں۔'' وہ مڑ کر چل دیا۔ ''شادی مبارک۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' میری این نے پکارا۔

''لانڈرومیٹ،'' ڈنکن نے پیچھے مڑ کر کہا۔ میری این اندر آ گئی۔ ٹریور اور فش کے ساتھ ایک لڑکی بھی آئی تھی جو چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ تینوں ایک گوشے میں کھڑے اپنی ڈرنکس پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے علامتِ مرگ کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

17

میری این نے دیکھا کہ اینسلے لین سے بہت گرما گرمی سے کچھ بحث کر رہی ہے۔ لین کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ دانت پیس رہا ہے۔

اچانک اینسلے نے کہا:

''حاضرینِ محفل، ایک خوش خبری! میں اور لین... ہم دونوں چند مہینوں میں ایک ننھی منی جان کے ممی اور پاپا بننے والے ہیں۔''

ہر طرف سناٹا چھا گیا، اور پھر مسرت بھرے قہقہے اور آوازیں گونجیں۔

''مبارک! مبارک! بہت بہت مبارک!''

''سڑی ہوئی کتیا!'' لین نے بھاری آواز میں کہا۔

میری این کو بے حد خوف محسوس ہوا کہ کہیں لین اینسلے پر ہاتھ نہ اٹھا دے لیکن لین اپنے پورے دانت نکال کر مسکرایا۔ اس نے مہمانوں کی طرف رخ کر کے کہا:

''یہ درست ہے، صاحبو! میں بچے کا نام اپنے نام پر رکھوں گا۔ لیجیے، بپتسمہ دیتا ہوں۔'' اتنا

Scanned with CamScanner

کہہ کر اس نے اپنی بیئر کا بھرا گلاس اینسلے کے سر پر اوندھا دیا۔ اینسلے کے بال، چہرہ، لباس سب کچھ شرابور ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے اور غم سے بگڑ سا گیا۔ وہ باتھ روم کی طرف جانے لگی۔ دو تین عورتیں ہمدردی کی آوازیں نکالتیں اس کی مدد کو دوڑیں، مگر ان سے پہلے فشر وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنا پل اوور اتار دیا تھا جس کے نیچے سے اس کا بالوں بھرا اور زشی بدن اب سامنے آچکا تھا۔ وہ اپنے سویٹر سے اینسلے کا چہرہ، بال اور لباس پونچھ رہا تھا۔ ''پلیز... مجھے خشک کرنے دیجیے۔ آپ کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ خصوصاً اب... جبکہ آپ ایسی حالت میں ہیں۔'' اس کی آنکھیں ہمدردی اور محبت سے چمک رہی تھیں۔

اینسلے نے بھیگی پلکوں سے اسے دیکھا جو بیئر یا آنسوؤں سے نم تھیں، اور کہا، ''ہم شاید پہلے نہیں ملے۔''

فشر نے اس کے پیٹ پر سویٹر کی آستین نرمی اور محبت سے گھماتے ہوئے کہا، ''لیکن میں جان چکا ہوں کہ آپ... آپ کون ہیں۔'' اس کے الفاظ علامتی اظہار سے بالکل شرابور تھے۔ یقیناً... یہی تو وینس تھی، زہرہ، جو سمندر سے نکل آئی تھی۔

کمرے میں قہقہے گونج رہے تھے۔ میری این سب کی خاطریں کر رہی تھی۔ پیٹر نیا قیمتی کیمرا لیے تصویریں اتار رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے کیمرے کا رخ میری این کی طرف موڑا۔

میری این نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

''نہیں!'' میری این نے چیخ ماری۔

''کیوں نہیں؟'' پیٹر نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ڈارلنگ، تم سے واقعی شراب بالکل ہضم نہیں ہوتی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی!''

''میں چونک گئی تھی،'' میری این نے کہا۔

''اب اور نہ پینا،'' پیٹر نے کہا۔ ''تم جھوم رہی ہو۔''

وہ میری این کا کندھا تھپتھپا کر دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اچھا! تو وہ ابھی تک بچی ہوئی ہے۔ اس کیمرے کی آنکھ سے۔ اس پارٹی میں منجمد ہو جانے سے۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، اسے فوراً یہاں سے بھاگ لینا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

یہ خیال برق رفتاری سے میری این کے ذہن سے گزرے۔
اس نے چپکے سے دروازہ کھولا اور اپنا بیگ جھلاتی سیڑھیوں سے نیچے آ گئی۔
باہر برف پڑی تھی۔ وہ برف پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔

18

کیا ڈنکن واقعی لانڈرومیٹ میں بیٹھا ہوگا؟ دروازہ کھولتے ہوئے اسے بالکل یقین نہیں تھا۔ لانڈرومیٹ خالی تھا۔ وہ سفید چمکتی مشینوں کی خاموش قطار کو تکتی رہی۔ اچانک اسے دور، آخری کرسی سے دھویں کی ایک پتلی لکیر اٹھتی نظر آئی۔

''ڈنکن،'' میری این نے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میری این نے دستانہ اتار کر بازو بڑھایا اور اس کی کلائی کو چھوا۔ وہ اچھل پڑا۔

''میں آ گئی ہوں،'' میری این نے کہا۔

ڈنکن کا چہرہ پہلے زیادہ ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں اور بھی دھنسی ہوئی لگ رہی تھیں، اس نے کہا:

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں، لیکن کیوں؟... واپس جاؤ، پارٹی جاری ہے۔ اس آدمی کو... کیا نام ہے اس کا؟... تمھاری ضرورت ہے۔''

میری این نے بے اختیارانہ کہا، ''تم کو میری زیادہ ضرورت ہے۔''

یہ کہتے ہی اس نے اپنی عظمت کو محسوس کیا، لیکن ڈنکن کی ٹیڑھی مسکراہٹ نے اس احساس کو خاک میں ملا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا:

''واقعی؟ یہ درست نہیں۔ مجھے تمھاری ضرورت بالکل نہیں۔ اس خوش فہمی کو دور کر دو کہ تم مجھے بچانا چاہتی ہو۔''

''نہیں نہیں، بچانا نہیں چاہتی،'' میری این نے بور ہو کر کہا۔

''تو پھر تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں بچاؤں؟ کس چیز سے؟ میں تو سمجھا تھا کہ تم بالکل مطمئن ہو۔ تم نے سوچ سمجھ کر سب کچھ طے کر لیا ہے اور پھر... میں کیا بچاؤں گا؟ تم تو جانتی ہو کہ مجھ سے کچھ ہوتا ہی

Scanned with CamScanner

نہیں،'' اس نے اطمینان سے کہا، جیسے اپنے ناکارہ ہونے پر وہ واقعی خوش تھا۔

''بچانے و چانے کو جانے دو،'' میری این نے گھبرا کر کہا۔ ''چلو کہیں چلتے ہیں۔''

''کہاں؟'' ڈنکن نے کہا۔ ''میرے اپارٹمنٹ میں تو ہم جا نہیں سکتے۔''

''اور نہ میرے اپارٹمنٹ میں،'' میری این نے کہا۔ پیٹر اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آ سکتا تھا۔ یا... اینسلے...

''ہمیں کوئی ہوٹل ڈھونڈنا پڑے گا،'' اس نے کہا۔

''لیکن...'' اچانک اسے خیال آیا۔ ''پیسے تو میں لائی ہی نہیں!''

''شاید میرے پاس کچھ پیسے نکل آئیں،'' ڈنکن نے جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اس کی مٹھی میں کچھ سکے آئے اور کچھ فٹ پاتھ پر چھن چھن کر کے بکھر گئے۔ اس کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ بھی نکل آئے۔ اس نے سب پیسوں کو احتیاط سے گنا، پھر کہنے لگا:

''کسی سستے ترین سرائے نما ہوٹل کے قابل پیسے نکل آئے ہیں۔''

''ارے کوئی جھونپڑیا ہی نہ ہو!'' میری این نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''وہاں تو بستر میں کھٹمل ہوں گے۔''

''کھٹملوں سے تو مزید دلچسپی پیدا ہو جائے گی،'' ڈنکن نے کہا۔

گھنٹوں برفیلی سڑک پر پیدل چلتے رہنے کے بعد آخر انھیں ایک کمرہ مل گیا۔ ریسپشن پر بیٹھے مشکوک آدمی نے پیسے لے کر کنجی دیتے ہوئے میری این پر نہایت شہوت بھری نظر ڈالی اور ہنسا۔

''یقیناً مجھے طوائف سمجھ رہا ہے،'' میری این نے صبر سے سوچا۔

19

دوسری صبح، سویرے سویرے، ہوٹل کے پاس ایک سستے ریستوران میں وہ ناشتہ کرنے بیٹھے تھے۔ ناشتہ صرف ڈنکن نے کیا۔ میری این نے اسے بتایا کہ وہ کئی ہفتوں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتی۔

ڈنکن نے خوش ہو کر کہا، ''یعنی اب جو تھوڑے سے پیسے بچے ہیں ان کا ناشتہ میں خود کر سکتا ہوں، اکیلا!''

Scanned with CamScanner

ناشتے کے بعد اس نے کہا: ''تو میں اب چلا۔''

''پلیز مت جاؤ،'' میری این نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خیر... تھوڑی دیر تک اور تمھارے ساتھ رہوں گا... مجھے واپس اپنے گھر جانا ہے، اپنے خول میں واپس...''

''میں واپس نہیں جا سکتی،'' میری این نے بے بسی اور مایوسی سے کہا۔ ہر چیز ناممکن نظر آ رہی تھی۔ ''شاید... مجھے واپس چلا جانا چاہیے۔''

''اب ایسا بھی کیا ہے!'' ڈنکن نے اس کا دل بڑھایا۔ ''اچھا، چلو میں تم کو ایک جگہ لے چلتا ہوں۔'' وہ میری این کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لے چلا۔ اب اس کے چہرے پر خالی خالی آسودگی تھی۔

انڈر گراؤنڈ ٹرین میں وہ تھوڑی دور تک گئے، پھر انھوں نے ایک ٹرام میں سفر کیا جو بالکل اجنبی محلوں سے گزر رہی تھی۔ میری این نے شہر کا یہ حصہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے دکانیں نظر آئیں، پھر ایک پل، پھر ایک گھر۔

وہ چھلانگ مار کر ایک اسٹاپ پر ٹرام سے اترے۔ یہاں گھر چھوٹے تھے اور نئے بنے ہوئے تھے۔ پھر بھی گھر اونچے اونچے تھے۔ بڑے بڑے چوبی دروازوں کے دونوں طرف ستون تھے۔ گھروں کی لانوں پر برف زیادہ تازہ لگ رہی تھی۔ ایک بوڑھا برف کو بیلچے سے اپنے پورچ سے صاف کر رہا تھا۔ خاموش فضا میں اس کی آواز عجیب سنائی دے رہی تھی۔ بہت سی بلیاں برف پر بھاگ رہی تھیں۔

ایک سڑک پار کر کے وہ ایک پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ اچانک ڈنکن نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ میری این کا ہاتھ تھامے، اسے گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔

''رُکو، رُکو!'' میری این چلائی اور اپنی بلند آواز پر حیران ہوئی۔ اسے لگا جیسے سب گھروں کے پردے ہل رہے ہیں اور لوگ جھانک کر انھیں دیکھ رہے ہیں۔

بھاگتے بھاگتے میری این کے سرخ ستاروں والے تنگ لباس کی ایک سیون چٹ چٹ کر کے اُدھڑ گئی۔ وہ ایک جنگلے کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں پیلے اور سیاہ رنگ کا ''خطرہ'' کا بورڈ آویزاں

Scanned with CamScanner

تھا۔

میری این کو لگ رہا تھا کہ وہ دوڑتے دوڑتے اس بورڈ سے ٹکرائیں گے اور چٹان سے نیچے جا پڑیں گے، لیکن آخری لمحے میں ڈنکن گھوم گیا۔ اَب وہ اونچے اونچے کناروں کے درمیان ایک تنگ راستے پر دوڑ رہے تھے۔

پہاڑی کے تلے پیدل چلنے والوں کے لیے جو چھوٹا سا پل بنا تھا وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ ڈنکن اچانک رکا تو میری این ٹھوکر کھا کر اس سے ٹکرا گئی۔

میری این کے پھیپھڑوں میں درد ہو رہا تھا۔ بہت زیادہ ہوا سے اسے چکر آ رہے تھے۔ وہ پل کی سیمنٹ کی دیوار پر جھکے کھڑے تھے، ان کے سامنے درختوں کی چوٹیاں تھیں، شاخوں کی بھول بھلیاں، جن کے سرے چمپئی سرخ اور چمپئی زرد ہو چکے تھے جن پر نئی پھوٹتی کلیوں کی گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔

''ابھی ہم نہیں پہنچے،'' ڈنکن نے کہا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ پل کے نچلے حصے پر جمی ہوئی برفیلی قلموں سے ٹپ ٹپ کرتا پانی نیچے گر رہا تھا۔ وہ میدانوں سے گزرے جو خود رو سینٹوں سے بھرا ہوا تھا جن کی سنہری نوکیں ان کے چہروں کو کھرچ رہی تھیں۔ وہ چٹانوں کی ڈھلانوں پر چڑھتے اترتے چلے جا رہے تھے جو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

''مجھے معلوم بھی نہ تھا،'' میری این نے لمبی سانسوں کے درمیان کہا، ''اس شہر میں ایسی جگہ بھی ہے۔''

''بہت دلچسپ چیزیں ہیں یہاں،'' ایک دوسرے بڑے پل سے گزرتے ہوئے ڈنکن نے کہا۔ ''یہاں لوگ ہوتے ہیں۔ نشئی اور چرسی ان پلوں کے نیچے سونے آتے ہیں۔ یہاں بچے بھی کھیلتے ہیں۔'' وہ میری این کے آگے آگے جا رہا تھا۔ بے حد کھلی فضا اس کی آواز کو نگلے جا رہی تھی۔ میری این کی سمت اس کی پشت تھی، ایک بے تاثر کوٹ کی پشت... جیسے اس کا چہرہ ہی نہ ہو۔ میری این اس کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔

برف سے ڈھکی ایک چٹان پر وہ رک گیا۔

''سردیوں میں مجھے یہاں آنا اچھا لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''برف سے وہ تمام کوڑا کباڑ

Scanned with CamScanner

ڈھک جاتا ہے جو اس کے راستوں میں بکھرا پڑا ہے۔ سب جنک: پرانے ٹائر، خالی ٹین کے ڈبے۔ ایسا کیوں کر رہے ہیں لوگ؟ اس ویرانے کو بھی آلودہ کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے کیا؟''

ڈنکن برف سے ڈھکی چٹان کی کگر پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں نیچے لٹکا کر جھلانے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں نیچے، بہت دور منھ پھاڑے نشیب کو دیکھتے رہے۔

''پتا نہیں اب کیا بجا ہوگا،'' میری این نے کہا۔

ڈنکن نے جواب نہیں دیا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ ختم کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک نسبتاً ہموار مقام پر پہنچے جہاں خودرو جھاڑیاں نہیں تھیں۔ دور تک برف کا موٹا سا لحاف بچھا تھا۔ ڈنکن وہاں تازہ گری نرم برف پر چت لیٹ گیا۔ وہ اتنا پرسکون لگ رہا تھا کہ میری این بھی اس کے ایک ہاتھ کے فاصلے پر لیٹنے لگی۔

''تمھیں سردی لگے گی،'' اس نے کہا۔ ''لیکن اگر چاہتی ہو تو لیٹ جاؤ۔''

اوپر آسمان پھیلا تھا جس کے یکساں سرمئی رنگ میں کوئی سلوٹ نہ تھی۔ اس سرماہٹ کے پرے کہیں سورج تھا۔

ڈنکن نے اتھاہ خاموشی میں کہا:

''تو تم واپس کیوں نہیں جا سکتیں؟ بھئی، تم شادی کرنے والی ہو، وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال تھا کہ تم یہ سب اہلیت رکھتی ہو۔''

''رکھتی ہوں،'' میری این نے کہا۔ ''یا رکھتی تھی۔ اب تو کچھ پتا نہیں چل رہا۔'' وہ اس موضوع پر بات کرنے سے کترا رہی تھی۔

''کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ سب تمھارے دماغ کا فتور ہے۔''

''مجھے معلوم ہے،'' میری این نے بے صبری سے کہا۔ وہ مکمل احمق نہیں ہو گئی تھی۔ ''لیکن اس فتور کو اپنے دماغ سے نکالوں کیسے؟''

''یہ بات ظاہر ہونی چاہیے کہ میں تمھیں کوئی راستہ نہیں سجھا سکتا۔ لوگ کہتے ہیں، میں فینٹیسی کی دنیا میں رہتا ہوں۔ شاید یہ درست ہو، لیکن وہ میری اپنی فینٹیسی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی فینٹیسی میں رہنے لگتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''مجھے کسی ماہرِ نفسیات کے پاس جانا چاہیے،'' میری این نے قنوطیت سے کہا۔
''افوہ! یہ مت کرنا۔ وہ تمھیں بدلنا چاہے گا۔''
''مگر میں بدلنا چاہتی ہوں۔ یہی تو بات ہے۔ میں اس طرح کی نا قابلِ اعتبار، ڈھلمل قسم کی شخصیت نہیں بننا چاہتی،'' میری این نے کہا۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ فاقے کر کر کے مرنے میں بھی کوئی خوبی نہیں پاتی۔ اس کا کھانا پینا کب سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ جو کچھ چاہتی ہوگی سب کا سب گھٹ گھٹا کر صرف تحفظ کے احساس تک محدود ہوگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گزشتہ کئی مہینوں سے وہ اسی احساسِ تحفظ کی طرف گامزن ہے لیکن درحقیقت وہ کسی بھی طرف نہیں بڑھی تھی۔ اس نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔ اس کا واحد حصول ڈنکن ہی تھا۔ ٹھوس اور حقیقی... وہ اسے مضبوطی سے تھامے رہنا چاہتی تھی۔

اچانک وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ ڈنکن ہے... وہ سچ مچ وہاں ہے۔ اس نے جیسے امتحان لینے کے لیے پوچھا:

''اور... کل رات... کل رات کیسا رہا؟'' ابھی تک ڈنکن نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

''کیا کیسا رہا؟'' ڈنکن نے بے خیالی سے پوچھا۔ ''اوہ... وہ...!'' چند منٹ تک وہ خاموش رہا۔ میری این بے حد اشتیاق سے منتظر تھی کہ اس کی آواز آئے اور وہ کچھ کہے، لیکن بالآخر جب آواز آئی تو اس نے یہ کہا، ''یہ جگہ مجھے اچھی لگتی ہے، خصوصاً آج کل سردیوں میں۔ یہ مکمل صفر کے اس قدر نزدیک ہے۔ اس سے مجھے اپنے انسان ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ برف میں آپ عدم وجود کے اتنے نزدیک محسوس کرتے ہیں جتنا ممکن ہے۔''

میری این سوچ میں پڑ گئی۔ بھلا اس کا اس کے سوال سے کیا تعلق؟

ڈنکن نے کہا، ''تم چاہتی ہو کہ میں کہوں، کل رات میری زندگی کا شاندار زلزلہ آور تجربہ تھا۔ یہی نا؟ کہ میں اپنے خول سے نکل آیا۔ میری مردانگی کا آغاز ہوگیا۔ مجھے اپنے ہر مسئلے کا حل مل گیا...''

''تو پھر...''

Scanned with CamScanner

''تم یہی چاہتی ہو۔ میں ہمیشہ جانتا تھا کہ تم یہی چاہو گی۔ سنو... کل رات اتنا ہی اچھا لگا جتنا اکثر اچھا لگتا ہے۔''

ڈنکن کی کہی بات کے مضمرات میری این کے ذہن میں ایسی صفائی سے اترے جیسے چھری مکھن میں اترتی ہے۔ اچھا! تو وہ پہلی لڑکی نہیں تھی؟ اپنا یہ تصور، گویا وہ ایک کلف لگے کپڑے پہنے نرس تھی جو ڈنکن کو نفسیاتی کمزوری سے نجات دلا رہی تھی اور جس سے وہ تنکے کے سہارے کی طرح چمٹی ہوئی تھی، بھیگے ہوے اخبار کی طرح چرمرا کر ڈھیر ہو گیا۔ اب اس میں اتنی بھی توانائی نہیں رہی تھی کہ غصے میں آتی۔ وہ کیسی خود فریبی میں مبتلا رہی! اسے پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ لڑکا ایسا جھوٹا لپاڑی ہے۔ کیا سبب کہ وہ اب بھی جھوٹ نہ بول رہا ہو؟

میری این اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آستین سے برف جھاڑتے ہوے اس نے کہا،''ٹھیک ہے۔ یہ لطیفہ تمھارا رہا... لیکن اب مجھے کچھ کرنا ہے، کوئی فیصلہ۔''

ڈنکن دانت نکال کر مسکرایا۔

''نظر تو ایسا ہی آ رہا ہے۔ دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے کی خود اذیتی کافی بورنگ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ تمھاری اپنی بند گلی ہے۔ اسے تم نے خود ایجاد کیا ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ بھی تمھیں خود بنانا ہو گا۔''

ڈنکن کھڑا ہو گیا۔ میری این اس کے ساتھ ساتھ اٹھی۔ اب اس پر پھر گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ اس نے لجاجت سے کہا:

''ڈنکن، پلیز، تم میری طرف سے جا کر پیٹر کے سامنے ذرا ہاتھ پیر جوڑ کر اسے بتا دو، میں اس سے شادی وادی نہیں کروں گی۔''

''ہرگز نہیں،'' ڈنکن نے سختی سے کہا۔

''ڈنکن،'' میری این نے التجا کی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں! اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' اسے یقین تھا کہ ڈنکن انکار کر دے گا اور یہی ہوا۔

''نہیں!'' اس نے دہرایا۔ ''آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ یہاں سے واپس کیسے جا سکتی ہو۔''

وہ اسے لیے ہوے ایک راستے کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ راستے کے نیچے کافی

Scanned with CamScanner

بڑا ریلوے اسٹیشن موجود تھا۔ دور فاصلے میں ایک پل نظر آرہا تھا جسے میری این پہچانتی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کہاں ہے۔

''کیا تم وہاں تک بھی میرے ساتھ نہیں آؤ گے؟'' میری این نے پوچھا۔

''نہیں، میں کچھ دیر یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ مگر تمھیں اب جانا ہے،'' اس نے کہا اور مڑ کر جانے لگا۔

ریل کی پٹریوں پر ٹرین کے ڈبے گزر رہے تھے۔ میری این پہاڑی سے اتر کر اسٹیشن کی طرف چل دی۔ آدھا راستے طے کر کے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے تقریباً توقع تھی کہ ڈنکن بھاپ کی طرح آسمان کی وسعت میں غائب ہو چکا ہوگا، لیکن وہ اب تک وہاں تھا۔

سفید برف کے پس منظر میں ایک سائے کی طرح سمٹ کر بیٹھا ہوا، نشیب کو غور سے دیکھتا ہوا... وہ وہاں تھا۔

20

میری این ابھی گھر پہنچی ہی تھی۔ وہ اپنے مسلے دسلے لال ستاروں والا فراک اتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اسے علم تھا کہ کس کا فون ہوگا۔

''ہیلو،'' اس نے کہا۔

''میری این، تم کہاں رفو چکر ہو گئی تھیں؟'' پیٹر کی آواز مارے غصے کے برف کی طرح یخ ہو رہی تھی۔ ''میں ہر جگہ فون کرتا رہا۔''

میری این نے لاتعلقی سے بالکل عام لہجے میں کہا، ''میں کہیں اور تھی... ذرا باہر چلی گئی تھی۔''

پیٹر اب بے قابو ہو گیا۔ ''پارٹی چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں! میں تمھیں ڈھونڈتا رہ گیا کہ گروپ فوٹو لیا جائے۔ اتنے لوگ جمع تھے کہ میں اس کا ایشو بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ مگر ان کے جانے کے بعد میں اور وہ تمھاری دوست لوسی شہر کی سڑکوں پر تمھیں تلاش کرتے مارے مارے پھرتے رہے۔ آدھی درجن بار تمھارے گھر ٹیلی فون کیا۔ بچاری لوسی نے میرے ساتھ تکلیف اٹھائی۔''

''پیٹر پلیز،'' میری این نے کہا۔ ''تم شام کو میرے پاس آؤ۔ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں

Scanned with CamScanner

گی۔''

ان دونوں نے فون ساتھ ساتھ رکھ دیا۔ میری این نے گرم پانی کی شاور لی۔ اس نے کپڑے پہنے اور بازار کی طرف چل دی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا خریدنا ہے: انڈے، میدہ، شکر، مکھن، کیک کی رنگ برنگی آئسنگ۔

گھر واپس آ کر اس نے ایپرن باندھا اور ان سب کو پھینٹنے میں جٹ گئی۔ اس نے اوون جلایا اور کیک کا مکسچر اوون میں رکھ دیا۔ جب کیک تیار ہو گیا تو چھری سے کاٹ کر اس نے ایک عورت کی شکل بنائی۔ رنگ برنگی آئسنگ سے اس نے عورت کے چہرے پر سرخ ہونٹ بنائے، سبز آنکھیں بنائیں اور چاکلیٹ کے رنگ کے بال بنائے۔

عورت کی ٹانگوں میں اس نے لمبے لمبے سفید موزے پہنائے اور اسے ایک نیلی فراک پہنا دی۔

لیجیے، عورت تیار ہو گئی۔

پانچ بجے پیٹر سیڑھیاں چڑھتا ہوا فلیٹ میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر شدید ناراضگی کا تاثر تھا۔

''یہ سب کیا بیہودہ مذاق...'' اس نے غصے بھری متانت سے کہنا شروع کیا۔

''ذرا رکو'' میری این نے مسکرا کر کہا۔ ''میں ابھی آئی۔''

وہ نپے تلے قدموں سے باورچی خانے کی طرف گئی اور لمبی سی پلیٹ میں کیک رکھ کر لے آئی۔ عورت نما کیک کو اس نے میز پر رکھ دیا۔

''پیٹر... اتنے دنوں سے تم مجھے ہڑپ کر جانا چاہتے تھے نا؟... میرے وجود کو مٹا ڈالنا، اسے کھا پی کر ہضم کر جانا، اپنے سسٹم کا حصہ بنا لینا؟ تو میں نے ایسی عورت بنا دی ہے جسے تم کھا سکتے ہو۔ مجھے نہیں کھایا جا سکتا۔''

پیٹر نے کیک کو دیکھا۔ پھر اس نے جلدی سے میری این کی طرف دیکھا۔ میری این کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ اسے بہت سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ پیٹر کی آنکھیں حیرت اور

Scanned with CamScanner

گھبراہٹ سے پھیل گئیں۔

وہ بہت جلد رخصت ہو گیا۔اس نے مزید گفتگو نہیں کی۔اس نے چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔

پیٹر کے جانے کے بعد میری این کیک کو کچھ دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔اچانک اسے زور کی اشتہا محسوس ہوئی۔اس نے کچن سے ایک کانٹا ڈھونڈ نکالا۔

''میں پیروں سے شروع کرتی ہوں،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے پہلا لقمہ لیا۔اسے عجیب لگا، مگر بہت اچھا بھی لگا۔وہ پھر سے کھا رہی تھی، ذائقے کا لطف لے رہی تھی، نگل رہی تھی۔

میری این آرام سے سے کیک کھانے لگی۔

اسے پیٹر یاد آ رہا تھا۔دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی، جیسے گزرے ہوئے زمانے، کسی پرانے فیشن، کسی بہت عرصہ پہلے پہنے ہوئے لباس کے لیے انسان کے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔

''پیٹر یقیناً اپنے شکار کے مشغلے کو اور بھی آگے بڑھائے گا،'' اس نے سوچا۔

عورت نما کیک کی دونوں ٹانگیں لطف لے لے کر کھانے کے بعد اسے سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔کمرے میں اینسلے اور فشر نمودار ہوئے۔

''ہائے!'' میری این نے کانٹا لہرا کر کہا اور کیک کی ران کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالا۔

فشر نے تو اوپر پہنچتے ہی آنکھیں موند لی تھیں، اب وہ ایک دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا، لیکن اینسلے نے میری این کو غور سے دیکھا۔

''یہ تم کیا کھا رہی ہو؟'' پھر اس نے کہا۔''تم نے عورت جیسا کیک بنایا ہے اور اب اسے کھا رہی ہو!'' پھر اس نے سختی سے کہا،''میری این... تم نے اپنی نسوانیت کو مسترد کر دیا ہے۔''

میری این نے کیک کو دیکھا۔''کیا فضول بات کہہ رہی ہو!'' اس نے کہا۔''یہ تو صرف کیک ہے!'' اور کانٹے کی ایک جنبش سے کیک کا سر اس کے دھڑ سے جدا کر دیا۔

21

میں اپنے کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ ڈنکن کا ٹیلی فون آیا۔''کیا میں آ سکتا ہوں؟'' وہ پوچھ

Scanned with CamScanner

رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

''ذرا کام ختم کرلوں۔ پھر ہم باتیں کریں گے،'' میں نے کہا۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھے کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ فشر اور اینسلے نے شادی کر لی ہے اور دونوں ہنی مون منانے نیاگرا فال گئے ہیں۔

''نہ جانے یہ باتیں کیسے ہوجاتی ہیں،'' ڈنکن نے کہا۔

''لیکن فشر کے لیے اچھا ہی ہوا۔ انسان ایک حد تک ہی حقیقت سے بالکل کٹا ہوا رہ سکتا ہے۔''

میں نے اپنے اور اس کے لیے چائے بنائی۔

''اب میرا کیا ہوگا؟'' ڈنکن نے اپنا انگوٹھا چباتے ہوئے خیال آرائی کی۔

مجھے لین اور کلارا کا خیال آیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اینسلے کی شادی پر لین نے اینسلے سے چھٹکارا پانے پر ذرا سی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس بھی نہیں گیا تھا۔ وہ کلارا کے بچوں کے کمرے میں رہ رہا تھا۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا بھی بالکل ترک کر دیا تھا۔

''تم اچھی اور صحت مند لگ رہی ہو،'' ڈنکن نے کہا۔ ''اور تم نے کھانا کھانا بھی شروع کر دیا ہے۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔

''تمھارا اب بھی یہ خیال ہے کہ پیٹر تمھیں مٹا ڈالنا اور ہڑپ کر جانا چاہتا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بالکل غلط...'' ڈنکن نے کہا۔ ''یہ کہانی تم نے گھڑ لی ہے۔ دراصل تم اسے مٹا ڈالنا چاہتی تھیں۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے کہا، ''کیا واقعی؟''

''اپنے دل سے پوچھو،'' ڈنکن نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے کہا: ''بلکہ نہ پیٹر کا قصور ہے نہ تمھارا... یہ میں تھا جو تمھیں مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔''

Scanned with CamScanner

میں نے گھبرائی ہنسی سے کہا، ''ایسی باتیں مت کرو۔''

''ٹھیک ہے،'' ڈنکن نے کہا۔ (وہ ہمیشہ مجھے خوش کرنا چاہتا ہے۔)

''شاید میں تمھیں مٹانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ شاید پیٹر مجھے مٹا ڈالنا چاہتا تھا، یا شاید میں پیٹر کو مٹا ڈالنا چاہتا تھا، یا تینوں ایک دوسرے کو مٹا ڈالنے کے در پے تھے۔ کیوں، کیسی رہی؟ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ تم حقیقت کی دنیا میں واپس آ چکی ہو، یعنی اب تم ایک صارف ہو۔''

اس پر مجھے یاد آیا۔ ''ارے ڈنکن، تم کیک کھاؤ گے؟''

میں نے بچا کھچا کیک اس کے آگے رکھ دیا۔

وہ انہماک سے کیک کی گردن اور چہرہ کھانے لگا۔

''تم کیک بھی بناتی ہو،'' اس نے محویت سے کھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، جب وقت ملے،'' میں نے کہا۔ اس کیک کو ختم ہوتے دیکھ کر مجھے دلی تسکین ہو رہی تھی۔ تو بالآخر میری محنت رایگاں نہیں گئی۔

''شکریہ!'' ڈنکن نے کہا اور کیک کے سنہرے بالوں کی آخری لٹ کانٹے میں پرو کر اسے کھا گیا۔

❄❄

پس نوشت

مارگریٹ ایٹ وڈ (Margaret Atwood) کے اس پہلے ناول دی ایڈیبل وومن کی تلخیص و ترجمہ آج 3 اپریل 2010 کو ختم ہو گیا۔

ابھی محرم میں عاشورے کی خونریزی کے بعد شدید ڈپریشن ہر رات میرا سینہ جکڑ لیتا تھا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ پرانی کتاب پڑھنی شروع کی تھی اور رات کے پچھلے پہروں کی تنہائی

میں قہقہے لگانے لگی۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور اس کی تلخیص و ترجمہ شروع کر دیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے بھی قہقہے لگاتی اور آنسو پیتی رہی۔ وہ کیوں؟

قہقہے لگاتی رہی کیونکہ کتاب بے حد دلچسپ لگی مجھے۔ اس کے ترجمے کی اکساہٹ مجھے اس لیے خاص طور پر ہوئی کیونکہ اس میں مشرق کا ذرا سا بھی کہیں ذکر نہیں۔ خالص مغربی ماحول ہے جس میں سن ساٹھ کے عشرے میں کینیڈا کے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل متوسط یا بالائی طرف سرکتے ہوئے متوسط دانشوروں کے طبقے کو پیش کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے (یہ غلط بھی ہوسکتا ہے) کہ اس قسم کے ناولوں کا ترجمہ بہت کم کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے قارئین کو اس سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ ذرا دیکھیں، یہ لوگ کس طرح محسوس کرتے اور سوچتے ہیں۔ ان میں سے ہی ایسے بھی ہیں جو میری این کی طرح بازار پر مبنی نظام کی بے روح صارفیت کو عریاں دیکھ سکتے ہیں جب اشتہار اور اشیائے صرف انسان کی ساری متاعِ حیات کو مسلسل بے معنی بناتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی اس میں اس زمانے کی اوّلین فیمنزم بھی نظر آتی ہے جو کلّی طور پر اس کوشش کو مسترد کر رہی ہے کہ معاشرہ اپنی بوسیدہ اور فرسودہ اقدار میں ''عورت'' کو جذب کر لے، اسے نام نہاد 'نسوانی' رویوں کو اپنانے پر مجبور کرے اور عورت ہار مان لے۔ اس معاشرے میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو استحصال، صارفیت اور اشتہار بازی سے تعبیر ایک قطعی خیالی دنیا کو مسترد کرتے ہیں۔ ڈنکن کہتا ہے: ''خیر ہر چیز تو حقیقی نہیں ہوسکتی... لیکن میں چاہتا ہوں کم از کم کوئی چیز تو زندگی میں اصل، حقیقی بھی ہو۔''

تو یہ ادیب، دانشور ہمارے شکستہ معاشرے کے چند ادیبوں اور دانشوروں کے قلب کے نزدیک بغیر کسی کوشش کے آجاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مغربی معاشرے میں اکثریت میں نہیں، لیکن بہتر اور حقیقی اقدار کے خواہشمند خود ہمارے معاشرے میں اکثریت میں کہاں ہیں؟ ادیب، دانشور، فنکار صفحۂ زندگی کا مرکزی متن کہیں بھی نہیں؛ یہ ہر دور میں اور ہر ملک میں صرف حاشیوں پر ہی وجود رکھتے ہیں اور رکھ سکتے ہیں۔ انھیں مرکزی متن میں کھینچ لانے کی کوشش خود ان کو اور ان کے فن پاروں کو اشیائے صرف میں تبدیل کر ڈالتی ہے اور ان کے معنی کو یکسر بدل ڈالتی ہے۔ ان کا اصل مقام صفحے کا حاشیہ ہی ہے۔ حاشیہ یوں تو غیر اہم معلوم ہوتا ہے، شاید متن کے مقابلے میں ہے بھی، لیکن بغیر حاشیے کے کسی بھی کتاب کا صفحہ پڑھنے کی کوشش کر دیکھیے۔ (حاشیہ صفحے کو پڑھنے کے قابل بناتا ہے اور کبھی کبھی مرکزی متن کی تشریح بھی کرتا ہے، میری پسندیدہ مثال)۔

اس کتاب میں اوّلین فیمنسٹ عورتوں کے اس رویے کی طرف بھی اشارہ ہے جو ہمیں ایک دلکش نوجوان عورت اینسلے میں نظر آتا ہے۔ وہ مردوں کو صرف 'بچوں کا باپ' بنانے پر بضد ہے اور انھیں ایک کارآمد

صَرف کی شے سے بڑھ کر کچھ سمجھنے سے انکاری ہے۔ اس کے حالات بہرحال ایٹ وُڈ نے اس قدر پرلطف طریقے پر پیش کیے ہیں کہ مجھ جیسی عورت اس پر قہقہے لگائے (اور کافی خوش ہوئے) بغیر نہیں رہ سکی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نئے نئے آزاد شدہ کالے غلام یا برابری کا رتبہ حاصل کرنے والے اچھوت اپنے پرانے آقاؤں سے کہیں بڑھ کر 'آقائی' کرتے نظر آئیں تو ہم کچھ ہنس کر انھیں تھوڑی سی چھوٹ دے دیتے ہیں۔ ہندوستان کی ایک چیف منسٹر مایاوتی کے لیے کہا گیا ہے کہ ان کے کمرۂ ملاقات میں صرف ایک کرسی ہوتی تھی جس پر وہ خود بیٹھتی تھیں اور ملاقات کے لیے آنے والے تمام برہمنوں اور کھتریوں اور بنیوں کو اپنے حضور میں کھڑا رکھتی تھیں۔ یہ درست رویہ تو نہیں تھا لیکن یہ سلوک وہ اُن جاتیوں سے کر رہی تھیں جنھوں نے ہزاروں برس سے شودروں کو جانوروں سے بدتر سمجھا ہے اور سلوک بھی ایسا ہی کیا ہے۔ (بات یہی ہے کہ دنیا میں چند ایک موقعے مظلوموں اور پسماندہ طبقوں کے ہنسنے کے بھی نکلتے ہیں، تو بھئی ان کو بھی تھوڑا سا ہنس لینے دیجیے۔)

اور اس کتاب میں گم ہو جانے اور پھر ترجمہ کرنے کی دوسری وجہ: کیونکہ ڈنکن دراصل نہیں ہے — اس کا کوئی ٹھوس مادی وجود نہیں ہے۔ وہ تو میری این کی وجود کی گہرائیوں میں پوشیدہ ایک ہیولا ہے اور میری این کے لیے پیٹر کی ٹھوس حقیقت سے کہیں بڑھ کر حقیقی ہے، اس کے وجود کا وہ قیمتی حصہ جس سے میری این کسی بھی صورت دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔

میری این اسی سے باتیں کرتی ہے۔ وہ اس کو بوسہ دیتا ہے۔ کڑے وقت میں اسے گلے لگاتا ہے اور تسلی دیتا ہے۔ ڈنکن میری این کے وجود کی سچائی ہے جس کی میری این قدر کرتی ہے اور اس سے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرتی ہے۔

1969 میں شائع ہونے والا مارگریٹ ایٹ وُڈ کا یہ ناول آج بھی کتنا دلکش اور خیال افروز ہے — بے حد ہنسانے والا ناول جو گھاس کی پتی کی طرح نازک اور نفیس ہے۔

❄❄

ہالینا پوزویاتوسکا (Halina Poświatowska) پولینڈ کے ایک شہر میں 1935 میں پیدا ہوئیں اور 1967 میں صرف بتیس برس کی عمر میں چل بسیں۔ انھیں پولینڈ پر نازی فوجوں کے قبضے کے دوران بچپن میں قید کیے جانے پر دل کی ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی تھی جس نے ان کی نقل وحرکت اور سانس لینے کی گنجائش بہت محدود کردی تھی۔ علاج کے لیے امریکہ کا سفر اختیار کیا اور اسی دوران وہاں تعلیم بھی حاصل کی۔ فلسفے میں ماسٹرز کی سطح کی تعلیم انھوں نے پولینڈ واپس جاکر پوری کی۔ ان کی شاعری اپنی نغمگی، دانشورانہ گہرائی لیکن جذباتیت سے گریز کے لیے جانی جاتی ہے۔ ان کے موضوعات میں موت، محبت، وجود، تاریخی شخصیات، خصوصاً عورتیں شامل ہیں۔ ان کی نظمیں پولش زبان میں دو جلدوں میں جمع کر کے شائع کی گئیں اور دو جلدوں میں ان کی نثری تحریریں اور خطوط اکٹھے کیے گئے۔

عبداللہ صالحی کا تعلق مراکش سے ہے۔ وہ 1968 میں بنی ملال نامی شہر میں پیدا ہوئے اور اپنے بچپن اور لڑکپن کا بڑا حصہ الجدیدہ میں گزارا اور وہیں 1990 میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دنوں ہی میں ان کی نظمیں شائع ہونے لگی تھیں۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ فرانسیسی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے فرانس کے شہر بوردو (Bordeaux) منتقل ہو گئے اور وہاں فرانس کی ادبی دنیا سے گہری شناسائی پیدا کی جس کا ایک اہم حصہ عرب جلاوطن یا تارک وطن ادیبوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے اپنا ادبی رسالہ اسراف کے نام سے جاری کیا جس کے ابتدائی شماروں نے مراکش کے ادب میں نثری نظم اور سرریئلسٹ اندازِ تحریر کے رجحانات کو تقویت دی۔ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ عربی اور ایک فرانسیسی میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری میں روزمرہ زندگی کا جشن اور ایک ایسا لطیف مزاح ملتا ہے جو دل شکن حالات کے بیان کو شاعرانہ لمحات میں منقلب کر دیتا ہے۔ ان کی نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت قصہ گوئی ہے اور اس ہنر میں انھیں کمال حاصل ہے۔

Scanned with CamScanner

ہالینا پوزوِیاتوسکا

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

ہمیں بہت سے آسان لفظ چاہییں

ہمیں بہت سے آسان لفظ چاہییں
جیسے
روٹی،
محبت،
اچھائی
تاکہ بینائی سے محروم لوگ
اپنا راستہ نہ کھوئیں

ہمیں بہت سی خاموشی چاہیے
فضا میں اور خیالات میں
تاکہ ہم آواز سن سکیں
خاموش، شرمیلی آواز
کبوتروں،
چیونٹیوں،

Scanned with CamScanner

لوگوں کی
اوران کی دردانگیز چیخ
ناانصافی کے دوران
ان تمام چیزوں کے درمیان
جو
نہ محبت ہیں
نہ اچھائی
اور نہ روٹی

بلاعنوان

کیوں سانتیاگو شہر میں
لڑکے مسکراتے ہیں
اور کیوں درخت
اپنی شاخوں سے میرا دوستانہ استقبال کرتے ہیں

کیوں سانتیاگو شہر میں
سڑکیں آسمان کی طرف جاتی ہیں
اور کیوں سورج
کھلی کھڑکیوں میں بستا ہے
کیوں سانتیاگو شہر میں
ہوا میرے بالوں میں کنگھی کرتی ہے

Scanned with CamScanner

گرم ہاتھوں سے
اور کبھی کبھی
میرے گالوں اور ہونٹوں کو چھوتی ہے

کیوں سانتیاگو شہر
خوفزدہ تتلی کی طرح
اُڑ کر
مجھ سے دور چلا گیا

میں اجنبی شہروں کے درمیان
ٹھٹھر رہی ہوں

بلاعنوان

یہ محبت ایک مجرم ہے
جسے موت کی سزا سنائی گئی ہے
یہ دو مختصر مہینوں میں
مرجائے گی

دنیا زمان اور مکان کو اہمیت دیتی ہے
تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے

Scanned with CamScanner

دنیا ناکامی اور حالات کے تقاضے کو اہمیت دیتی ہے
میں تمھیں نہیں روک سکتی
کسی بھی بوسے سے

بلا عنوان

مجھے اس کڑے کے بارے میں سوچنا پڑے گا

دو ہزار سال پہلے
اس نے ایک عالی مرتبت عورت کی
کلائی کو شرف بخشا تھا

یہ سونے کا بنا ہوا ہے
ایک سانپ کے سر سے جڑا
اس طرح کا سانپ جو جنگل کی
گھنی جھاڑیوں میں سرسراتا ہے
اور ڈس لیتا ہے
جب خطرے میں ہو

Scanned with CamScanner

ایک رزمیہ داستان

جب زینی نیویارک آئی
اس کے پاس صرف ایک ہرے رنگ کا لباس اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں
اور اسی طرح زینی اسکائی لائن کے درمیان چلی
پنجوں کے بل اوپر چڑھتے ہوئے
جیسے وہ ان ستاروں کی سرد اور دور روشنی کو
سمجھنا چاہتی تھی
جو ٹیکساس میں چھوٹ گئے تھے

ایک مصور زینی کو ملا اور اسے اپنے پوز کرنے پر تھوڑی سی خوشی ہوئی
اس نے پوچھا کہ کیا اس کا لباس بہت بوسیدہ اور شکن آلود نہیں ہے
نہیں، اس نے کہا، اور اس کے علاوہ یہ تمھارا جسم ہے جو اہمیت رکھتا ہے
اور ایک جوڑا، اگر تم چاہو، اپنے لیے خود خرید سکتی ہو اس موجود رقم سے

زینی نیویارک میں گھومتی رہتی ہے اور اس کی آنکھیں چھوٹی ہیں
اس کے ہاتھ میں سبز کاغذی نوٹ پرندوں کی طرح چہچہاتے ہیں
اس کے پاس مصور کے رنگ آمیزی کے تختے پر موجود رنگوں سے زیادہ رنگوں کے لباس ہیں
اور ہمیشہ دور تر، ہمیشہ سرد تر، ٹیکساس کے ستارے جگمگاتے ہیں

پھر ایک دن لوگوں نے فٹ پاتھ پر ایک سیاہ دھبا دیکھا
وہ وہاں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال سردی سے ٹھٹھرے ہوئے

Scanned with CamScanner

چہرے پر بکھرے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا رنگ اُڑ چکا تھا
اور اسکائی لائن کے جنگل کے اوپر
شوخ سرخ رنگ کے آسمان پر
ٹیکساس کے ستارے سرد آگ میں سلگ رہے تھے

بلاعنوان

جب سے میں تم سے ملی ہوں، میں اپنی جیب میں ایک
لپ اسٹک رکھتی ہوں، اپنی جیب میں لپ اسٹک
رکھنا بہت بے وقوفی ہے، جب تم مجھے اتنی سنجیدگی
کے ساتھ دیکھتے ہو، جیسے تم نے میری آنکھوں میں ایک
گوتھک چرچ دیکھا ہو، مگر میں کوئی عبادت خانہ
نہیں ہوں، بلکہ ایک جنگل اور ایک سبزہ زار ہوں
پتوں کی کپکپاہٹ، جو تمھارے ہاتھوں میں بھنچتی ہے
ہمارے پیچھے، وہاں، ایک چشمہ شور مچاتا ہے، یہ وقت ہے
جو ختم ہوا جارہا ہے، اور پھر بھی تم اسے انگلیوں کے درمیان سے
گزر جانے دیتے ہو، اور تم وقت کو
جال میں لانا نہیں چاہتے، اور جب میں تمھیں الوداع
کہتی ہوں، میرے بغیر لپ اسٹک کے ہونٹ بن چھوئے
رہتے ہیں، مگر میں اسی طرح اپنی جیب میں لپ اسٹک
رکھنا جاری رکھتی ہوں، جب سے میں نے جانا ہے کہ
تمھارے ہونٹ بہت خوبصورت ہیں

Scanned with CamScanner

بلاعنوان

ہاں، دل یقینی طور پر ایک ایجاد ہے اور باقی پہلوؤں سے اس کا وجود
بالکل نہیں، دل ہے جو محبت کرتا ہے اور جو محبت کرتا ہے
بے ثبات ہے اور ہر کہیں ہے، اس لیے یہ محض ایک خیال
ہو سکتا ہے، انگلی کے پوروں میں ایک حرارت، چھوڑی ہوئی سانس کی
ایک دھاری، آواز کا نم آلود رنگ، صرف ایک سرگوشی،
اور پریوں کی تمام کہانیاں جو
''بہت دن ہوئے، ایک دن
ایک وہ تھا، یا تھی'' سے شروع ہوتی ہیں،
تمام کی تمام، دل کے بارے میں بات کرتی ہیں، اور دل
پریوں کی کہانیوں میں، ہر ایک پر تحکمانہ انداز میں
فرمانروائی کرتا ہے، اور دل خاص طور پر
اس سورما کی طرح جو ہائیڈرا کو قتل کرتا ہے، اور ہائیڈرا کی طرح،
غیر فانی ہے، جو ہر کٹے ہوئے سر کی جگہ دس زندہ سر
پیدا کرتا ہے، اور پھسلواں شیشے کے بنے ہوئے پہاڑ کی طرح
ناقابل تسخیر ہے، اور آخر میں اس لفظ کی طرح ناقابل اعتبار
جس میں وہ مقفل تھا، ایک عمر بھر کا قیدی جسے تنہائی
اور ایک غیر اہم موت کی سزا سنائی گئی

Scanned with CamScanner

بلاعنوان

وہ ایک بلند سورج مکھی کے نام سے جانی جاتی ہے
جو محض محبت میں
اپنے ہزار طلائی پتیوں کے ساتھ
آسمان کے رخ پر رہنے والے سر کو گردش دیتا ہے

چوڑے پتوں میں
سورج گرجاتا ہے
شہد کی مکھیوں کے ایک جھنڈ میں

اور نیلے رنگ میں ڈھلا سورج مکھی
طلائی آواز میں بھنبھناتا ہے

اور وان گوگ،
جو صرف فرشتوں کے ذہن میں وجود رکھتا ہے،
کینوس پر اس کی نقاشی کرتا ہے
اور اسے جگمگانے کا حکم دیتا ہے

Scanned with CamScanner

بلاعنوان

میری جلد سے نشان مٹ جائیں گے
جیسے کہ ناخن پر سے اکھڑے ہوے رنگ
اور جیسے کہ کسی سفر پر
تم چلے جاؤ گے

مگر آنسو بھری آنکھوں والی تین بہنیں
تمھیں لاحاصل واپس بلاتی ہیں، ہاتھوں میں
ہونٹوں سے پہنچے ہوے بوسوں کو
پیش کرتے ہوے

یقین
امید
محبت
ان کے اعتبار پر
کوئی بھی دنیا کی تمام وسعت کو طے کر سکتا ہے
مگر اس کے باوجود
میں جانتی ہوں
کہ تم نہیں لوٹو گے

❀❀

Scanned with CamScanner

عبداللہ صالحی

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

جل دولوز، تمھارا شکریہ [1]

وہ تمھارا تذکرہ کر رہے تھے
تمھارے نام کو
کسی دور سے آنے والے پیغمبر کی دھیمی آواز میں
دہراتے ہوئے
جس کے ہونٹوں سے بے مثال موسیقی نکلتی ہے

میری اپنی فرانسیسی اس قابل بھی نہیں تھی
کہ میں خوش اسلوبی سے روٹی خرید سکتا
مگر تمھارے نام کی موسیقیت کا
اطراف کے تذکروں میں ایک خاص طلسم تھا
جس نے بہت دیر تک میری شدید جہالت کو شرمندہ رکھا

---

[1] Gilles Deleuze

Scanned with CamScanner

ترکِ وطن ایک قابلِ احترام حق ہے
تم نے ایک بار کہا تھا
کسی نے پہلے یہ نہیں کہا، اور کسی نے
بعد میں بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کی
اس ملک میں
جس سے ہم نے محبت کی شادی کی
میں، محمد، عبدالقادر اور فاطمہ
اور دوسرے عرب، جن کے گرد آلود ناموں کے لیے یہ نظم
بہت تنگ ہے

ابھی تک میں ایک بھی ایسے آدمی سے نہیں ملا جو
تمھارے قانون کی پیچیدگیوں کی تشریح کر سکے
ایک کا قانون
دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے
اور قائم مقام افسر ایک فرانسیسی ہے
جس کے اجداد پرتگالی تھے
پھر بھی وہ فلسفیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے

میں سب وے میں تھا، ایک اخبار پر
چوری چوری نگاہ ڈالتے ہوئے
جو ایک آدمی پڑھ رہا تھا
میں نے تمھارا نام جلی حروف میں دیکھا
اور تمھاری موت کی سرخی

Scanned with CamScanner

معلوم ہوتا ہے، تم کھڑکی سے کود گئے تھے
مگر کیوں وہ تمام لوگ
جو تمھاری محبت میں اندھے ہیں
زندگی کو تمام چیزوں سے بڑھ کر چاہتے ہیں
میں اپنی جہالت پر ایک بار پھر شرمندہ ہوا!
اور اپنے آپ سے سلیس عربی میں نفرت کی
اخبار کے سیاہ فام مالک کی بڑبڑاہٹ کے باوجود

ترکِ وطن ایک قابلِ احترام حق ہے
ایک بیان جو ایک بار دینے کے بعد کافی ہے
میرے ہر صبح اپنے قابلِ احترام حق کی جستجو جاری رکھنے کے لیے
تمھاری حمایت کے سائے میں
اے جل دولوز

المقامر [2]

تمام راستے اس لمحے کو جاتے ہیں
آپ اپنے کسی فوری کام کے بہانے
مہمانوں سے معذرت کرتے ہیں
ریستوران کی صفوں سے تیزی سے نکلتے ہیں

---

[2] المقامر: جواری

اپنے آپ کا باتھ روم کے آئینے میں جائزہ لیتے ہیں
جانتے ہوئے کہ یہ امتحان کی گھڑی ہے
اور وہ خوشی حاصل کرنا ایک جوا ہے
جس میں ہار اور جیت برابر ہیں
آپ میز کی طرف آتے ہیں
اور سب کے سامنے لپک کر
اُس کا بوسہ لے لیتے ہیں

❁❁

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابرئیل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔ (یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 600 روپے

بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد

کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

ڈھول بن

سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی اور میرے قدم رک گئے۔ سرسراہٹ پھر ہوئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جھاڑی میں سانپ ہے۔ سانپ سے میں پہلے بھی بہت ڈرتا تھا اور اب تو مجھے ایک بار سانپ کاٹ چکا تھا۔ کوئی زہریلا سانپ تھا اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ سانپ کا ڈسا ہوا آدمی اس کیڑے سے کتنا ڈرنے لگتا ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو کم سے ایک بار زہریلا سانپ کاٹ لیتا ہے۔ اسے ہر جگہ سانپ نظر آنے لگتا ہے؛ اس خشک جھاڑی میں مجھے بھی سانپ نظر آنے لگا۔ یہ ویران علاقہ ایک دوراہا تھا۔ میں جس راستے پر چل رہا تھا وہ ہموار اور کشادہ تھا اور اس پر دونوں طرف جھاڑیاں تھیں اور میری وہم زدہ آنکھوں کو ہر جھاڑی میں سانپ نظر آ رہے تھے۔ میں نے دوسرے راستے کو دیکھا۔ یہ بالکل اجاڑ اور ناہموار تھا لیکن اس پر جھاڑیاں بہت کم اور چھدری چھدری تھیں۔ میں اسی راستے پر مڑ گیا اور آگے بڑھنے لگا۔

کچھ دور چل کر پھر ایک دوراہا پڑا۔ ایک راستے پر جھاڑیاں اور ہریالی تھی، دوسرا اجاڑ تھا۔ اسی طرح کئی بار ہوا اور ہر بار میں اجاڑ والے راستوں پر مڑتا رہا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہریالی والے راستے ہی اصل راستے ہیں جو کسی نہ کسی بستی یا بستیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن اجاڑ راستے بھی تو کسی طرف جاتے ہوں گے۔ مارگزیدگی کے بعد سے کبھی کبھی میں عجیب طرح کے وہم میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مارگزیدوں کے ذہن پر ایسا ہی اثر ہو جاتا ہے۔ اس موقعے پر مجھے یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ویران راستے ہی مجھے میری منزل پر پہنچائیں گے جو معلوم نہیں کہاں ہے، اسی لیے میں

Scanned with CamScanner

ہرے بھرے راستوں سے کتراتا رہا۔

ان راستوں پر ابھی تک مجھے کوئی آدمی نہیں ملا تھا لیکن اب ایک راستے پر مڑنے کے بعد مجھے ایک آدمی اُسی اجاڑ راستے پر جاتا نظر آیا۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ بہت تھک گیا ہے۔ آخر وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے بھی تھکن کا احساس ہوا اور میں اسی کے پاس بیٹھ گیا۔ کندھے پر سے اپنا تھیلا اتار کر زمین پر رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوا:

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

اس نے ایک قصبے کا نام لیا۔ میں نے پوچھا، ''وہاں کیا کرتے ہو؟''

''بھیک مانگتا ہوں۔'' اس نے وہی جواب دیا جس کی میں اس کا حلیہ دیکھ کر توقع کر رہا تھا۔

''اور رہتے کہاں ہو؟''

اس نے اپنے سامنے کے اجاڑ راستے کی طرف اشارہ کیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا، ''دھول بن میں۔''

''دھول بن میں بھیک نہیں ملتی؟''

''ملتی ہے۔ مگر آندھیوں کی فصل آ گئی ہے نا۔ آندھی آتی ہے تو سارے میں دھول جم جاتی ہے۔'' اس نے کہا اور افق پر نظریں جما دیں۔

''آندھی؟'' میں نے کہا۔

''دن بھر چلتی رہتی ہے۔ سب گھروں کے اندر بند رہتے ہیں۔ شام کو آندھی تھمتی ہے تو سب لوگ باہر نکل کر صفائی ستھرائی کرتے ہیں، پھر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ میں سویرے سویرے گھر سے نکل جاتا ہوں۔ آندھی تھمنے کے بعد رات کو دھول بن واپس آتا ہوں، لیکن آج یہاں بھکاریوں کی ہڑتال ہے اس لیے واپس دھول بن جا رہا ہوں۔''

مجھے اس کے مسئلوں سے دلچسپی نہیں تھی کہ دھول بن میں رات میں کون بھیک مانگتا ہے اور کون بھیک دیتا ہے۔

اس نے اپنی گدڑی سنبھالنا شروع کر دی تھی۔ میں نے پوچھا، ''آندھی کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟''

Scanned with CamScanner

''مٹیالی ہوتی ہے۔''اس نے ایک بار پھر افق کی طرف دیکھا۔''آ رہی ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چلتے چلتے پوچھا،''دھول بن میں پردیسیوں کے رہنے کا بھی کوئی ٹھکانا ہے؟''

''بڑا گھر،''اس نے کہا۔''اگر دھول بن جا رہے ہو تو بس چل دو۔''

''تم چلو، میں آ رہا ہوں۔''

ظاہر ہے اسے نہیں معلوم تھا کہ آندھی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بچپن ہی سے میں آندھی میں گھر کے اندر نہیں ٹک پاتا تھا۔ باہر نکل کر پوری آندھی کو اپنے اوپر سے گذرنے دیتا تھا۔ میرے شہر میں رنگین آندھیاں بھی آتی تھیں۔ کالی آندھی، جس سے سب لوگ ڈرتے تھے، مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا۔ میرا خیال ہے شروع شروع میں سیاہ آسمان پر ستارے بھی چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ گھر والے مجھے باہر جانے سے روکتے تھے، لیکن میں گھر کے اندر نہیں ٹک پاتا تھا۔ میں لال اور زرد آندھی میں بھی باہر نکل جاتا اور فضا کو سرخ اور زرد ہوتے دیکھتا تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں تیز روشنیاں پھیل گئی ہیں۔ صرف زرد آندھی میں مجھے کچھ کچھ ڈر لگتا تھا اس لیے کہ ایک دفعہ میں نے اس آندھی کے ساتھ کچھ انسانی آوازیں بھی سنی تھیں، یا شاید یہ میرا وہم ہو۔

اب میرے علاقے میں نہ کالی آندھی آتی تھی، نہ لال، نہ زرد۔ معمولی آندھیاں کبھی کبھی آتی تھیں اور میں ان میں بھی باہر نکل جاتا تھا۔

میرے ساتھ والا بھکاری مجھے دور جاتا دکھائی دیا۔ اسی وقت مجھے اسی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے دور مٹی کا رنگ پھیلتا دکھائی دیا۔

''مٹیالی آندھی،'' میں نے سوچا۔ آج تک میں نے مٹیالی آندھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے اسے اپنے اوپر آنے دیا۔ ذرا ہی دیر میں میرا پورا بدن گرد سے اٹ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ٹوکروں میں مٹی بھر بھر کر میرے اوپر پھینک رہا ہے۔ اب ہر طرف مٹی اڑتی دکھائی دے رہی تھی اور روشنی دھندلا گئی تھی۔ اس روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے مجھے کچھ ہی دور پر وہ بستی مل گئی۔ مگر اس سے پہلے کئی بار میرا پیر کسی چھوٹے گڈھے میں آ گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ یہ قدرتی گڈھے نہیں، چھوٹی

Scanned with CamScanner

چھوٹی قبریں سی کھودی گئی تھیں۔

''کیا ڈھول نگر میں بچوں کی کوئی بیماری پھیلی ہوئی ہے؟''میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اس وقت وہاں سڑک پر کوئی نہیں تھا اور میں اس بستی میں اکیلا گھوم رہا تھا۔

آندھی کا سلسلہ پانچ دن تک رہا اور یہ پانچوں دن میں نے بستی میں تنہا گھومتے ہوے گذارے۔ روز سویرے گرد اڑاتی ہوئی آندھی شروع ہو جاتی۔ دوپہر سے اس کا زور کم ہونے لگتا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے وہ بالکل ختم ہو جاتی اور پوری بستی گرد میں ڈوبی رہ جاتی۔ کچھ دیر بعد گھروں کے دروازے کھلنا شروع ہوتے۔ لوگ بانسوں میں بندھی ہوئی بڑی بڑی جھاڑو ئیں لیے ہوے باہر نکلتے اور گرد کے ڈھیر کناروں پر لگا دیتے۔ پھر گاڑیاں آتیں اور گرد کے انبار لاد کر بستی کے باہر کہیں پھینک آتیں، اور ہوا معلوم نہیں انھیں کہاں اڑا لے جاتی۔ رات ہونے سے پہلے پوری بستی صاف ہو جاتی اور سڑکوں پر لوگ چلنا پھرنا شروع کر دیتے۔ میں اس وقت تک بستی سے باہر جا چکا ہوتا تھا جہاں ایک بڑے سے درخت کے نیچے میں نے اپنا عارضی ٹھکانا بنا لیا تھا۔ وہاں اپنے لباس کو جھٹک جھٹک کر گرد سے صاف کرتا، اپنے بدن اور بالوں سے بھی گرد کو دور کرتا، پھر آدمی بن کر بستی میں داخل ہوتا اور خوانچے والوں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خرید کر اسی درخت کے نیچے آ جاتا۔ دوسرے دن سویرے سے آندھی کی سنسناہٹ شروع ہو جاتی۔ گھروں کے دروازے بند ہونے لگتے اور پوری بستی میرے اختیار میں ہو جاتی۔

فضا میں پھیلی ہوئی دھند کے باوجود ان سیروں میں قریب قریب پوری بستی میری نظر سے گذر گئی۔ اس کے زیادہ تر مکان بہت پرانے بنے ہوے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بستی کا رقبہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس کے رہنے والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اس لیے کہ ابھی تک میری ملاقات اس پہلے دن والے بھکاری اور دو تین دکانداروں سے ہوئی تھی؛ باقی بستی میرے لیے اجنبی تھی، جس طرح میں اس کے لیے اجنبی تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ لوگ ڈھول کے دنوں میں اپنے اپنے مکان کی کھڑکیوں سے محض وقت گذاری کے طور پر سڑک کو دیکھتے رہتے تھے۔ وہ مجھ کو اس حد تک جانتے تھے کہ کسی دوسری جگہ کا آدمی آندھی میں باہر چلتا پھرتا ہے اور رات بستی سے باہر والے درخت کے نیچے گذارتا ہے۔

Scanned with CamScanner

رفتہ رفتہ وہاں والوں سے میری جان پہچان شروع ہوئی۔ میرا پہلا شناسا وہی بستی کا بھکاری تھا۔ اس سے میری اکثر بات چیت ہوتی تھی، اور اسی سے میں نے بستی کے باہر والے درخت کا ذکر سنا۔ اس نے مجھے بستی کے باہر خصوصاً اس درخت کے نیچے ٹھہرنے سے منع کیا اور بتایا کہ وہ درخت منحوس ہے۔ اس نے بغیر نام لیے ایک شخص کا ذکر کیا جو اس درخت سے گر کر ماؤف ہو گیا تھا۔ میں نے اس شخص کا نام پوچھا تو وہ آہ بھر کر بولا، ''تمھیں معلوم ہو جائے گا۔''

اور ایک بار پھر مجھ سے بستی کے بڑے مکان میں رہنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں غریب لوگ مفت رہتے ہیں۔ میں غریب نہیں تھا، اس لیے میں نے اسی درخت کے نیچے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک رات مجھے اس درخت سے ڈر لگنے لگا، اس کی بل کھائی ہوئی شاخوں پر سانپوں کا گمان ہو گیا۔ اس رات میں نے خواب میں دیکھا کہ اس پر سے دو سانپ گرے اور میرے قریب سے رینگتے ہوئے کہیں غائب ہو گئے۔ خوابوں کا اب مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، لیکن سانپ میں نے پہلی مرتبہ خواب میں دیکھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے آس پاس تلاش بھی کیا۔ ظاہر ہے مجھے کوئی سانپ نظر نہیں آیا، مگر ہر مار گزیدہ کی طرح یہ خیال میرے وہم آلود ذہن میں بیٹھ گیا کہ اس درخت پر ضرور سانپ رہتے ہیں اور میں ان کی زد میں ہوں۔

دوسرے دن میں نے اپنا بستہ درخت کے نیچے سے ہٹا لیا اور کسی دوسری بستی کے بارے میں وہاں کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ سب سے پہلے پرانے ملاقاتی بھکاری کو تلاش کیا۔ وہ جس جگہ پر بھیک مانگتا تھا وہاں نہیں ملا تو بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہے اور دو تین دن سے بڑے مکان میں پڑا ہے۔ بڑے مکان کا پتا ہر ایک کو معلوم تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ بڑے رقبے کی اچھی پختہ عمارت تھی۔ چھوٹے چھوٹے کمرے بہت تھے۔ ایک کمرے میں وہ گودڑ لپیٹے پڑا ہوا تھا۔ بڑے مکان کے صاف ستھرے کمرے میں وہ بے جوڑ معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا گودڑ سنبھال کے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ میں نے بھی اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور وہ اپنے گودڑ پر قریب قریب گر گیا۔ میں نے اس سے دوا علاج کو پوچھا تو بولا:

''ڈاکٹر صاحب تیسرے دن پر آتے ہیں۔ کل آئیں گے۔''

اس کے بعد اس نے اپنی بیماری کی غیر دلچسپ تفصیل بیان کرنا شروع کر دی۔ معمولی بخار تھا،

Scanned with CamScanner

دو تین دن میں خود ہی اتر جاتا، لیکن وہ اسے کوئی بڑی بیماری سمجھ رہا تھا۔ تب اسے۔ میری مزاج پرسی کا خیال آیا۔ میں نے بتایا کہ اب میں درخت کے نیچے نہیں رہوں گا۔ خیراتی مکان میں بھی نہیں رہوں گا۔ پھر پوچھا، ''جس بستی میں تم آندھی کے دنوں میں جاتے ہو وہاں رہنے کا ٹھکانا مل سکتا ہے؟''

''وہاں بھیک بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بے مروت لوگ ہیں۔ میں تو پیٹ کی خاطر وہاں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر کہا، ''آخر اس بڑے مکان میں کیا برائی ہے؟''

کوئی برائی نہیں تھی لیکن میں وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی مناسب جواب سوچ رہا تھا کہ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ فقیر نے پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''ڈاکٹر صاحب آج ہی آگئے!''

اتنے میں ایک ڈاکٹر اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ساتھ والے نے کہا، ''کہو سردار، اتنے دن سے بیمار پڑے ہو اور ہم کو اطلاع نہیں کی۔''

فقیر نے جواب دیا، ''حضور، کل ڈاکٹر صاحب کے آنے کا دن...''

''تمھیں معلوم نہیں کہ جب یہاں کوئی بیمار پڑتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اپنی باری چھوڑ کر بھی آجاتے ہیں۔'' اس نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کر کے اپنے بیگ سے دو تین گولیاں نکالیں اور ان کے استعمال کی ترکیب بتا کر اٹھنے کو ہوا۔ لیکن ساتھ والا بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے ڈاکٹر کو کچھ اشارہ کیا اور ڈاکٹر اسے سلام کر کے چلا گیا۔ آدمی نے فقیر سے کہا، ''بھئی سردار، سنا ہے بستی میں کوئی باہر کا آدمی آتا ہے۔''

''باہر کے آدمی تو مختار صاحب، بستی میں آتے ہی رہتے ہیں۔''

''نہیں، جو آندھی کے وقت بستی میں گھومتا ہے۔''

تب میں نے اس آدمی کو ذرا غور سے دیکھا جس کو فقیر مختار صاحب کہہ رہا تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور لباس سے کوئی خاص آدمی معلوم ہوتا تھا۔ فقیر نے میری طرف اشارہ کیا اور بولا، ''یہی ہیں۔''

اب مختار کو شاید پہلی مرتبہ میری موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے بہت قاعدے سے جواب دیا، اور فقیر نے مجھے بتایا، ''مختار صاحب یہاں کی جائیداد دیکھتے ہیں۔''

''آپ بڑے مکان ہی میں رہتے ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''جی نہیں۔ بستی کے باہر رہتا ہوں، اور اب کسی اور بستی میں جانے کو سوچ رہا ہوں۔''

''کیوں؟ بڑا مکان پسند نہیں آیا؟ یہ آپ ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے۔''

''یہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے ہے۔ میرا اس پر حق نہیں ہے۔''

''کیوں؟ آپ یہاں کی آندھی سے گھبرا گئے؟''

''آندھی سے میں نہیں گھبراتا۔ جب تک میرے شہر میں آندھیاں آتی تھیں، میں ہر آندھی کو باہر نکل کر اپنے سینے پر لیتا تھا۔ مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔''

''عجیب!'' اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا۔ ''آپ کے یہاں اندھی کے ساتھ گرد نہیں آتی تھی؟''

''شاید نہیں آتی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا۔ کم سے کم یہاں کی مٹیالی آندھی کے مقابلے میں۔''

آپ نے آندھی کو تماشے کی طرح دیکھا ہے۔'' اس نے لمبی سانس لی۔ ''ہم کو اس سے لڑنا پڑتا ہے۔''

''پھر آپ لوگوں نے اس بستی کو رہنے کے لیے کیوں پسند کیا؟''

''لمبا قصہ ہے۔ کم سے کم گرد ہٹانے کے بہانے پوری بستی کی صفائی ہوتی رہتی ہے۔''

میں نے غور کیا۔ واقعی اس بستی سے زیادہ صاف ستھری بستی میں نے نہیں دیکھی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک سردار کو دیکھتا رہا۔ پھر برا سا منھ بنا کر بولا، ''بھئی سردار، تمھارے پاس قاعدے کے کپڑے نہیں ہیں؟ یہ کیا گودڑ لپیٹے پڑے ہو؟''

''اچھے کپڑے ہیں، مختار صاحب۔ تہوار اور شادی بیاہ میں پہنتا ہوں۔ گودڑ نہ لپیٹوں تو کوئی بھیک بھی نہ دے گا۔''

''سچ کہتے ہو،'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ رقم نکال کر سردار کے سرہانے رکھ دی۔ پھر مجھ سے بولا، ''اچھا آج ہماری خاطر بڑے مکان میں رہ لیجیے۔ پھر کل سے کچھ اور انتظام کر لیجیے گا۔ دوسری بستی میں پہنچتے پہنچتے آپ کو رات ہو جائے گی۔ یہاں رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں، راستے میں گڈھے بہت پڑتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر سردار کو دیکھا۔ ''برابر والا کمرہ خالی ہے۔ اس میں آرام کیجیے۔ سردار آپ کا دل بہلائے گا۔ دلچسپ آدمی ہے مگر باتیں بہت کرتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

سردار ہنسنے لگا، ''آپ بھی مختار صاحب...''
لیکن وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا۔

سردار واقعی دلچسپ آدمی تھا اور واقعی بہت باتیں کرتا تھا۔ اس رات ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس سے مجھ کو دھول بن کے بارے میں اتنا معلوم ہو گیا جتنا شاید کئی مہینے میں معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

دھول بن، اس نے بتایا، کوئی بستی نہیں تھی۔ بس اونچی نیچی بنجر زمین کے چھوٹے بڑے قطعے تھے جن پر لمبی گھنی جھاڑیاں اور کچھ درخت تھے، جن کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بڑے مالک نے وہ ساری زمین خرید لی اور اس پر مکان وغیرہ بنوائے۔ کنارے پر کی نشیبی زمین کو گہرا کھدوا کر وہاں ایک بڑا سا تالاب بنوایا۔ پانی زمین پر بہت نیچے تھا جس کے لیے کئی گہرے کنویں کھدوائے۔ بیچ میں آندھیاں آتی رہیں لیکن بڑے مالک نے ان کی پروا نہیں کی اور آندھی کی لائی ہوئی دھول کو ہٹواتے رہے۔

''لیکن انھوں نے اس بستی کو... دھول بن کو کیوں پسند کیا؟''

''بس اپنی بستی بسانے کا شوق۔ میں نے بتایا نہیں کہ یہ کوئی بستی نہیں تھی، کوئی اس زمین مالک نہیں تھا۔ صرف کچھ بنجارے سال دو سال میں یہاں ڈیرے لگاتے تھے۔ بڑے مالک نے سرکار سے ساری زمین خرید لی۔ بنجاروں کے لیے پچھم کی طرف کچھ زمین الگ کر دی، اور یہاں مکان دکان بنانے میں لگ گئے۔ لیکن بڑے مالک کا بلاوا آ گیا۔''

اس نے لمبی سانس لی اور موت کے بارے میں ایک فلسفیانہ سی تقریر شروع کر دی۔ اس کی آواز سنتے سنتے میں سو گیا۔

درخت کے نیچے کی بے آرام زندگی کے بعد بڑے مکان کے اس کمرے میں ایسی اچھی نیند آئی کہ سویرے بہت دیر میں آنکھ کھلی۔ آندھی شروع ہو گئی تھی اور بستی کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ درخت کے نیچے دیر میں جاگتا تھا تو بھی آندھی میں باہر نکل سکتا تھا، یہاں میں بڑے مکان میں بند ہو گیا تھا۔ مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی لیکن بستر پر پڑا سوتا جاگتا رہا۔ اپنے ٹھکانے پر جانے کا خیال

Scanned with CamScanner

نہیں آیا۔ شام کو بازار کا ایک چکر لگایا۔ دکاندار مجھ کو پہچاننے لگا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ بھی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں آندھی میں باہر کیوں گھومتا ہوں۔ میں نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ باہر نکلنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ وہ بولا، ''مختار صاحب بھی پوچھ رہے تھے۔ ان سے چھوٹی مالکن نے پوچھا ہوگا۔''

ڈھول بن کی چھوٹی مالکن کا ذکر اس دن میں نے پہلی بار سنا۔ سوچا، اس سے کچھ اور معلوم کروں۔ پھر چپ رہنا بہتر معلوم ہوا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب سردار کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور وہ اپنے گودڑ میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ وہ ٹھیک سے جواب بھی نہ دے سکا۔ اسے سردی بہت لگ رہی تھی۔ پھر بھی میں اس کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا۔ طبیعت آپ ہی آپ الجھ رہی تھی۔ اپنے ٹھکانے پر جانے کی تیاری کرتے کرتے معلوم نہیں کب سو گیا۔ دوسرے دن پھر دیر میں اٹھا اور پھر دن بھر بڑے مکان میں بند پڑا رہا۔

شام کو ڈاکٹر پھر سردار کو دیکھنے آیا۔ مختار صاحب اس کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی وہ بیٹھے رہے۔ دو تین بار انھوں نے بھی سردار کی نبض دیکھی۔ پھر مجھ سے پوچھا، ''کہیے، آپ نے کیا طے کیا؟''

میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا لیکن اب بڑے مکان میں مجھ کو نہیں رہنا تھا۔ اس لیے میں نے یوں ہی کہہ دیا، ''کل چلا جاؤں گا۔ آج شاید اپنے پرانے ٹھکانے پر سو جاؤں۔ کل دن میں کوئی اور بستی دیکھوں گا۔''

''دن میں؟'' انھوں نے پوچھا، ''اور آندھی؟''

''آندھی میں باہر نکلنے کا عادی ہوں،'' میں نے کہا اور یہ سوچ کر شرمندہ ہوا کہ آج کا دن میں نے ضائع کر دیا۔ درخت کے نیچے رہتا تو کوئی اور بستی ڈھونڈھ لیتا۔ مختار صاحب کو شاید میرے خیال کا اندازہ ہو گیا۔ انھوں نے کہا، ''آندھی میں دن کو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔'' انھوں نے پہلے دن کی کہی ہوئی بات دہرائی، ''آپ نے آندھیوں کو تماشے کی طرح دیکھا ہے۔''

''میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ اس وقت تماشا بھی ضروری کام معلوم ہوتا تھا۔''

میں نے سوچا، میں خواہ مخواہ بحث میں الجھ رہا ہوں۔ بات بدلنے کے لیے کچھ اور سوچ رہا تھا،

Scanned with CamScanner

لیکن اچانک مختار صاحب نے کہا، ''ہمیں رنگین آندھیوں کے بارے میں بتایئے۔''

میں نے سرسری طور پر بتا دیا۔ مختار صاحب سنتے رہے، پھر بولے، ''واقعی تماشا معلوم ہوتا ہو گا۔ خاص کر بچوں کو۔''

''بچے کبھی کبھی ڈر بھی جاتے تھے۔ مجھے ڈر نہیں لگتا تھا اس لیے گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔''

''عجیب!'' مختار صاحب نے وہی کہا جو پہلے دن کہا تھا، اور پھر کہا، ''عجیب!''

تھوڑی دیر بیٹھ کر مختار صاحب رخصت ہو گئے۔ میں ان کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر سردار کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کو نیند آ رہی تھی۔ میں نے اس سے بات نہیں کی اور اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور باہر نکلا تو کچھ دور پر مختار صاحب نظر آئے۔ ان کے ساتھ کوئی خوش لباس عورت اور کچھ مزدور قسم کے آدمی تھے۔ میں ان سب کی نظر بچا کر آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جا کر رک گیا اور اپنے ٹھکانے والے درخت کے نیچے جانے کی ہمت باندھنے لگا۔ اس میں کچھ دیر لگی۔ پھر آگے بڑھنے لگا۔ مگر اپنی پشت پر مختار صاحب کی آواز سن کر رک گیا۔ وہ قریب ہی کھڑے کہہ رہے تھے، ''صاحب کہاں چلے؟''

''آپ کو شاید بتا چکا ہوں۔''

''لیکن رات کو سفر کرنا...''

اسی وقت ایک مزدور نے قریب آ کر کہا، ''مختار صاحب، چھوٹی مالکن نے آپ کو بلایا ہے۔ کہا ہے، اُن کو بھی لیتے آیئے گا۔''

''اُن کو کن کو؟''

''وہی جو آندھی میں باہر گھومتے ہیں،'' مزدور نے کہا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''یہی تو ہیں۔''

''اچھا، تم چلو،'' مختار صاحب نے کہا۔ پھر مجھ سے بولے، ''چلیے صاحب، ملیکہ یاد کر رہی ہیں...''

''ملیکہ کون؟''

''دھول بن کی مالک وہی ہیں۔ کبھی کبھی باہر سے آنے والوں کو اپنے یہاں بلاتی ہیں۔''

Scanned with CamScanner

"لیکن مجھے کیوں؟"

"شاید آندھی کے دنوں میں آپ کے باہر نکلنے کی وجہ سے۔"

"لیکن آندھی میں باہر نکلنا کوئی نرالی بات نہیں ہے۔"

"نہیں ہے۔ لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ آپ آندھی کے وقت مکان کے اندر نہیں رہ سکتے... ان کا خیال ہے کہ وہ آپ کو جانتی ہیں۔ کم سے کم ان کی والدہ جانتی تھیں، اور شاید ان کے میاں بھی۔"

"ان کے میاں کیا اب نہیں ہیں؟"

"ہیں، لیکن بے ہوش رہتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"آپ والے درخت سے گر گئے تھے۔ سر کے بل گرے تھے۔ اس کے بعد سے..."

"تو سردار انھیں کا ذکر کر رہا تھا،" میں نے سوچا۔ "لیکن وہ اس درخت پر چڑھے ہی کیوں تھے؟" اس عرصے میں بھول گیا کہ میں نے ان سے کچھ پوچھا تھا۔ شاید دوا علاج کے بارے میں کوئی رسمی سوال تھا۔ مختار صاحب کہہ رہے تھے:

"شہر کے ہسپتالوں میں دکھایا گیا، دو جگہ بھرتی بھی رہے۔ عاملوں، جھاڑ پھونک والوں، بنجاروں سے بھی مدد لی گئی، سب بے کار! اب ہر وقت بے ہوش رہتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر رکھ لیا گیا ہے۔ کبھی کبھی کچھ دیر کو ہوش آتا بھی ہے تو ہوش کی باتیں نہیں کرتے۔ ایک تو ان کے منھ سے بات نکلتی ہی نہیں، پھر آواز..." اچانک وہ رک گئے، پھر بولے، "لیجیے ان کا مکان آ گیا۔"

میں نے اپنے بائیں ہاتھ پر بنی ہوئی کوٹھی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنے لڑکپن کے مکان کو دیکھ رہا ہوں جو کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور میں اسے بھلانے میں بڑی مدت کے بعد کامیاب ہوا تھا۔ اس مکان کی رُوکار، برآمدے کے در اور اندر ڈیوڑھی بالکل اُسی مکان کی سی تھی۔

مختار صاحب اندر چلے گئے تھے اور میں اپنے اس مکان کی ایک ایک چیز کو یاد کر رہا تھا۔ اس کے رہنے والے، میرے بزرگ، ان کی صورتیں بلکہ آوازیں تک مجھے یاد آنے لگیں۔ اپنے

Scanned with CamScanner

یہاں کے ملازم، مہمان اور آئے دن کے ہنگامے، وہ لوگ جن میں سے اب کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے ان سب کو بھلا دیا تھا، لیکن یہ میری بھول تھی۔ بچپن کی دوسری یادوں کی طرح یہ یادیں بھی میرے دماغ میں کہیں موجود تھیں اور اب ایک ایک کر کے یا ایک ساتھ تازہ ہو رہی تھیں۔

یہ سب شاید چند لمحوں کے اندر ہو گیا۔ مختار صاحب کو گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی اور اب وہ واپس آ کر مجھ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آیئے، بلا رہی ہیں،'' انھوں نے کہا اور میں ان کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کا یہ مردانہ حصہ تھا اور میرے مکان کے مردانے سے خاصا مختلف تھا۔ زنانے حصے کو ایک دروازہ باقی مکان سے الگ کرتا تھا۔ اُدھر سے عورتوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک بچہ یکساں آواز میں رو رہا تھا۔ مختار صاحب نے اس دروازے پر دستک دی اور بلند آواز سے کہا، ''بتا دو، وہ آ گئے ہیں۔''

میں نے اتنی دیر میں مردانے حصے کو دیکھ لیا تھا۔ ایک بڑا کمرہ تھا اور اس سے متصل دو چھوٹے کمرے۔ بڑے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ چھوٹے کمروں میں معمولی دفتری سامان بے ترتیبی سے ڈھیر تھا۔ کتابیں بھی بہت سی تھیں، زیادہ تر درختوں کے بارے میں۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مختار صاحب نے مجھے انھی میں سے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

کچھ دیر ملیکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے کوئی پختہ عمر کی عورت سمجھ رہا تھا لیکن وہ جوان اور مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس سے بات کرنے میں مجھے کچھ تکلف ہوگا، لیکن عمروں کے فرق نے اس تکلف کو باقی نہیں رہنے دیا۔ پھر بھی کچھ دیر تک میں اس سے بہت سنبھل کر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے کچھ رسمی سوال پوچھے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے، یہاں کا راستہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا، وغیرہ۔ میں نے سرسری طور پر سردار سے ملاقات کا حال بتا دیا، پھر خاموش ہو گیا۔ ملیکہ نے مختار صاحب سے پوچھا:

''آپ نے انھیں سب بتا دیا ہے؟''

''سب نہیں۔ یہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''اب بات کر لیجیے،'' ملیکہ نے کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ''آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں؟''

''میں جس طرح کی زندگی گذار رہا ہوں،'' میں نے جواب دیا، ''اس میں پسند ناپسند کا سوال نہیں ہوتا۔ جو بھی جہاں بھی مل جائے،'' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس وقت کھانا کھا چکا ہوں۔ آپ میرے لیے تکلیف نہ کیجیے۔''

ملیکہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے وہ سوال کیا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ ''آپ کا مکان بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے؟''

''یہ ہماری امّی نے بنوایا ہے۔ شادی سے پہلے وہ جس مکان میں جایا کرتی تھیں وہ انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں دھول بن میں جب ہمارے ابوان کے لیے مکان بنوا رہے تھے تو امی نے ان سے ویسا ہی مکان بنوانے کی فرمائش کی، اور اس کا نقشہ جیسا ان کو یاد تھا انھیں بنا کر دکھایا...''

اچانک وہ مجھے یاد آ گئیں اور میں نے ملیکہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا، ''معاف کیجیے، آپ کی والدہ کا نام زینت بیگم تو نہیں تھا؟''

''آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟''

''وہ اکثر ہمارے یہاں آ کر مہمان رہا کرتی تھیں۔''

ملیکہ نے مختار صاحب کی طرف دیکھا اور وہ بولے، ''عجیب! عجیب!''

ملیکہ نے مجھ سے پوچھا، ''یہ کب کی بات ہے؟''

''زمانے کا ٹھیک خیال نہیں، لیکن اس وقت میں لڑکا سا تھا۔''

''تو وہ آپ کو یاد کیونکر رہ گئیں؟''

''وہ میرا آندھی میں گھومنا بڑے شوق سے دیکھتی تھیں۔ باقی گھر کے لوگ تو مجھے روکتے تھے، ڈراتے بھی تھے۔ لیکن میں آندھی کے آثار نظر آتے ہی دوڑ کر ان کو بتا دیتا تھا اور وہ کسی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ اس وقت ہمارے شہر میں رنگین آندھیاں آیا کرتی تھیں۔ انھیں بھی شاید یہ آندھیاں اچھی لگتی تھیں۔''

زینت بیگم بہت خاموش طبع اور اپنی بیٹی ہی کی طرح نازک اندام تھیں۔ وہ میری والدہ کو کسی

Scanned with CamScanner

سفر میں ریل پر ملی تھیں۔ میری والدہ میں کچھ ایسی بات تھی کہ خاندان بھر کے لوگ اور باہر والے بھی اپنے دکھ درد ان کے سامنے کھل کر بیان کر دیتے تھے اور ان کی غم خواری سے تسلی پا جاتے تھے۔ زینت بیگم کی زندگی میں بھی کچھ پریشانیاں تھیں۔ وہ جب ہمارے یہاں آتیں تو دیر دیر تک ہماری اماں سے اکیلے میں باتیں کرتی اور کبھی کبھی روتی تھیں۔ اماں ان کو سمجھاتی بجھاتی تھیں اور وہ مطمئن ہو کر واپس جاتی تھیں۔ پھر کچھ دن تک ان کے خط آتے رہتے تھے جن میں وہ مجھ کو ضرور پوچھتی تھیں اور رنگین آندھیوں سے میری دلچسپی کا بھی ذکر کرتی تھیں۔

مجھے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے اور میں ان میں گم ہو کر بھول چلا تھا کہ اس وقت کہاں بیٹھا ہوں۔ اتنے میں ملیکہ نے مجھ سے پوچھا، ''وہ آپ کے یہاں کب تک آتی رہیں؟''

''میرا لڑکپن ہی تھا۔''

''یہ سب میرے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں،'' ملیکہ نے اپنے آپ سے کہا، پھر اٹھتے اٹھتے مختار صاحب سے بولی، ''یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ انھیں سب بتا دیجیے۔'' اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

مختار صاحب کچھ دیر چپ بیٹھے رہے، پھر کہنے لگے، ''سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور کیا کیا بتاؤں۔''

''آپ کو جو کچھ یاد آتا جائے، بے تکلف بتایئے،'' میں نے کہا۔ ''ضرورت ہوگی تو بیچ میں کچھ پوچھ لوں گا۔'' اور مختار صاحب نے بتانا شروع کیا:

''زینت بیگم میری بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی کم عمر میں ہو گئی تھی۔ میاں رئیس زادہ اور طوائفوں کا شوقین تھا۔ بیوی سے زیادہ مطلب نہیں رکھتا تھا۔ دو سال تک زینت بیگم اس کی وجہ سے بہت پریشان رہیں۔ اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر وہ نہیں سدھرا اور آخر ایک طوائف کے کوٹھے ہی پر مر گیا۔ پھر بھی اس کے پاس کافی دولت بچ گئی تھی، اس لیے زینت بیگم کو پیسے کی تنگی نہیں ہوئی۔ بس تنہائی سے گھبراتی تھیں اور کبھی کبھی کسی دوسرے شہر میں نکل جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں ریل کے ایک سفر میں آپ کی والدہ سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ زینت بیگم کو بہت پسند کرتی تھیں اور اکثر انھیں اپنے یہاں بلا لیتی تھیں۔ میں اُس زمانے میں بے روزگار تھا۔ عمر بھی کم تھی۔ زینت بیگم مجھے اپنے

ساتھ رکھتی تھیں۔ آپ کی والدہ ان سے دوسری شادی کے لیے اصرار کیا کرتی تھیں۔ آخر وہ راضی ہو گئیں۔ آپ کی والدہ نے ان کے لیے، بہت سوچ سمجھ کر بڑے صاحب کا انتخاب کیا۔ ان کی بھی ایک شادی ہو چکی تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ تھی لیکن آپ کی والدہ کو یقین تھا کہ وہ زینت بیگم کی بڑی قدر کریں گے، اور واقعی...''

''آگے بتائیے۔''

''وہ بہت قابل آدمی تھے۔ ان کو معلوم نہیں کیا کیا آتا تھا۔ دولت مند بھی تھے۔ شہر میں ان کی کئی بڑی کوٹھیاں اور دوسری جائیداد تھی۔ لیکن آپ کی والدہ ان کی شادی میں شریک نہیں ہو سکیں۔ اس سے کچھ دن پہلے ہی آپ کے مکان کا واقعہ...''

''مجھے معلوم ہے،'' میں نے ان کی بات کاٹ دی، ''آپ آگے سنائیے۔''

''میں نے کہا کہ بڑے صاحب کو معلوم نہیں کیا کیا آتا تھا، لیکن ان کی اصل دلچسپی تعمیری کاموں اور درختوں میں تھی۔ اسی لیے انھوں نے دھول بن کی یہ اجاڑ زمین خریدی اور اس کے لیے معلوم نہیں کہاں کہاں سے درختوں کے گملے لا کر رکھے، اور یہاں کئی مکان بنوائے جن میں غریبوں کے لیے بڑا مکان سب سے شاندار تھا۔ اس کے علاوہ...'' وہ پھر رکے، پھر بولے، ''ان کے چھوٹے بھائی باپ کی زندگی ہی میں مر گئے تھے اور پھر ماں بھی ختم ہو گئیں اور انھوں نے اپنے یتیم بھتیجے کو پالا تھا، میرا مطلب ہے چھوٹے صاحب کو، اور زینت بیگم سے شادی کے وقت انھوں نے ان سے اجازت لے لی تھی کہ چھوٹے صاحب کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔ اس وقت چھوٹے صاحب قریب بارہ برس کے تھے اور شہر کے کسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ زینت بیگم کے یہاں بھی شادی کے دوسرے سال ملیکہ پیدا ہوئی، اور چھ سال کی ہو گی کہ وہ بھی شہر کے اسکول میں داخل کر دی گئی۔ لیکن زینت بیگم اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکیں، اس لیے بڑے صاحب نے دوسرے ہی سال اسے اسکول سے اٹھا لیا اور یہیں دھول بن میں اسے اپنی نگرانی میں تین ماسٹروں سے پڑھواتے رہے۔ وہ چھوٹے صاحب سے بہت مانوس ہو گئی تھی اس لیے بڑے صاحب نے ان کی پڑھائی کا انتظام بھی دھول بن ہی میں کیا۔''

''آگے سنائیے،'' میں نے پھر انھیں ٹوک دیا۔ کسی کی بات سننے کا یہ مہذب طریقہ نہیں تھا،

لیکن اس وقت مجھ کو یہ ساری تفصیل غیر دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ مختار صاحب کو بھی شاید میری اکتاہٹ کا اندازہ ہو گیا اور وہ رک کر کچھ سوچنے لگے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے کہا، ''آپ اپنا حال بتائیے۔'' اور انھوں نے ذرا دلچسپی کے ساتھ بتانا شروع کیا:

''زینت بیگم نے بھی ان کے ساتھ شادی کی ایک شرط رکھی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گی۔ بڑے صاحب کو ان کی ہر شرط منظور تھی۔ اس طرح میں بھی یہاں آ گیا اور بڑے صاحب مجھے بھی اسی طرح چاہنے لگے جس طرح اپنے بھتیجے کو چاہتے تھے۔ ایک دن بولے، 'بھئی مختار، تمھارا تو نام ہی مختار ہے۔ ہم تمھیں دھول بن کی جائیداد کا مختار بناتے ہیں۔'''

''دلچسپ آدمی تھے بڑے صاحب،'' میں نے کہا۔

''لاجواب آدمی تھے۔ دھول بن کو بسانے کے لیے انھوں نے شہر سے آدمی چھانٹ چھانٹ کر ان کو مکان مہیا کر دیے۔ جن کی اتنی حیثیت بھی نہیں تھی ان کے لیے بڑا مکان تھا۔ پہلی ہی کھیپ میں وہ سردار کو بھی پکڑ لائے۔ کہتے تھے، ہر بستی میں ایک آدھ فقیر ہونا ضروری ہے۔''

''مجھے تو زیادہ تر لوگ بہت غریب نظر آئے۔''

''اس لیے کہ وہ واقعی غریب ہیں۔ اکثر ان میں سے کاریگر اور مستری قسم کے لوگ ہیں جن کا کام شہر میں نہیں چلتا تھا۔ سردار بھی ایک درگاہ کے سامنے بیٹھا مکھیاں مارا کرتا تھا۔ یہاں اس کا بھی کام چل نکلا۔ وہ دھول بن کا سب سے پرانا باشندہ ہے، اور دھول بن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

''بڑے صاحب اس سے بے تکلف تھے؟''

''وہ ہر ایک سے بے تکلف ہو جایا کرتے تھے۔ اور ہنسی کی بات پر اتنا زبردست قہقہہ لگاتے تھے کہ درختوں پر سے چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔''

درختوں کے ذکر پر مجھے یاد آیا:

''مختار صاحب، دھول بن کے آس پاس کوئی درخت۔۔۔''

''بہت تھے۔ سب کٹوا دیے بڑے صاحب نے۔ بس وہ آپ والا درخت ناپ کے لیے چھڑوا دیا۔'' وہ کچھ اور بتانے جا رہے تھے کہ لیکن رک گئے اور مجھے سلام کر کے چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

اس رات میں نے اپنے درخت کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور میں درخت کو دیکھتے ہوئے سو گیا۔ سویرے اٹھ کر میں نے پھر اس کو غور سے دیکھا۔ اس کی شاخیں بہت گھنی اور بے ترتیب سی تھیں لیکن اس کی ہر شاخ چار میں سے کسی ایک سمت اشارہ کرتی تھی۔ بے سمت شاخ اس درخت میں کوئی نہیں تھی۔ اب مجھ کو وہ درخت بہت انوکھا اور ہزاروں درختوں میں سب سے الگ معلوم ہونے لگا۔ کم سے کم مجھے یہی یقین تھا کہ میں اسے ہزاروں درختوں کے بیچ میں پہچان لوں گا۔

دوسرے تیسرے دن آندھی ختم ہوگئی اور دھول بن میں دن کا کاروبار شروع ہو گیا۔ ایک دن سردار بھی ملا اور میں نے قریب قریب سارا دن اس سے باتیں کرنے میں گذار دیا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ بنجاروں کی ٹولی واپس اپنے پڑاؤ پر آ گئی ہے۔ اس نے بنجاروں کے چودھری کا نام بھی لیا۔ ''چودھری بلّم بوڑھا ہو گیا ہے مگر ابھی ٹانٹھا ہے۔''

بلّم؟ کیا ماضی کے سارے بھوت یہیں دھول بن میں جمع ہو رہے ہیں؟ میں نے بدمزگی کے ساتھ سوچا۔ جب میں شروع میں گھر سے نکلا تھا تو کچھ دن بلّم کی ٹولی میں بھی رہا تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ سردار کے پاس سے اٹھ کر میں بنجاروں کے پڑاؤ پر پہنچا۔ چودھری بلّم نے فوراً مجھے پہچان لیا۔

رات بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ میں زیادہ تر اس کی گردشوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اس نے بتایا کہ بڑے صاحب کے لیے بہت سے درخت اسی کی ٹولی نے ڈھونڈھ کر نکالے تھے۔

''چودھری، یہ بتاؤ،'' میں نے پوچھا، ''وہ درخت جو چھوڑ دیا گیا ہے...''

''ہمیں اس کا نام نہیں معلوم۔ بڑے صاحب کہیں سے لائے تھے۔ یا شاید وہ پہلے سے لگا ہوا تھا۔ بڑے صاحب اس کی ٹہنی بھی کسی کو توڑنے نہیں دیتے تھے۔''

رات زیادہ آ گئی تھی۔ میں پڑاؤ ہی پر سو گیا۔ سویرے مختار صاحب کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو وہ بلّم سے پوچھ رہے تھے کہ اس سے میری جان پہچان کس طرح ہوئی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہم آپ کو درخت کے نیچے ڈھونڈھ رہے تھے۔ آج آپ کو ملیکہ سے ملنا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''کس وقت؟''

''تھوڑی ہی دیر میں مل لیجیے تو اچھا ہے۔ ملیکہ آپ کو اپنی کہانی سنائیں گی جس طرح زینت بیگم آپ کی والدہ کو سناتی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آپ سے باتیں کر کے ان کا دل ہلکا ہو جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ملیکہ سے ملا۔ آج وہ بہت اچھا لباس پہنے تھی اور سوگواری کا انداز جو اس پر طاری رہتا تھا، آج نہیں تھا۔ معمولی گفتگو کے بعد اس نے بتانا شروع کیا:

''ابو امی کے دیوانے تھے۔ امی نے آندھیوں کی شکایت کی تو وہ آندھیاں روکنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ معلوم نہیں کون کون سے درخت جمع کر کے گملوں میں لگا لیے، اور ان کی بڑی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گملوں کے پودے کئی برس پرانے تھے۔ ابو نے بتایا کہ جب یہ گملوں سے زمین میں لگائے جائیں گے تو ایک دو برس میں چھتنار درخت ہو جائیں گے۔ ایک دن وہ اور چھوٹے صاحب بہت خوش خوش امی کے پاس آئے۔ کچھ درخت جو انھیں نہیں مل رہے تھے، اب بنجاروں کی مدد سے مل گئے تھے۔ درختوں کا سلسلہ بہت دور سے شروع ہوتا اور ہر درخت آندھی کی گرد کے لیے چھلنی کا کام کرتا، اور آخری درخت تک آتے آتے گرد غائب ہو جاتی، صرف ہوا رہ جاتی، وہ بھی بہت تیز نہیں۔ ایسا ان کا کہنا تھا۔

''اس دن آندھی دو دن پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ابو اسی آندھی میں چھوٹے صاحب کے ساتھ باہر نکل گئے اور آپ والے درخت سے ناپ ناپ کر دوسرے درختوں کی جگہ پر نشان بنا رہے تھے۔ اچانک ان کے گردے میں، شاید گردے ہی میں، ایسا شدید درد اٹھا کہ وہ وہیں کے وہیں ختم ہو گئے۔''

اس کے بعد وہ کچھ دیر چپ رہی۔ میں بھی چپ رہا۔ پھر اس نے کہا، ''امی اس کے بعد خاموش رہنے لگیں۔ باتیں بہت کم کرتی تھیں۔ لیکن ایک رات چھوٹے صاحب نے خواب میں زرد آندھی آتی دیکھی۔ سویرے اٹھے تو دہشت زدہ تھے۔ اس دن معلوم ہوا کہ وہ زرد آندھی، بلکہ شاید رنگین آندھی سے ڈرتے ہیں۔ ان کا ڈر دور کرنے کے لیے امی نے آپ کے آندھی میں گھومنے کے کئی قصے سنائے اور چھوٹے صاحب کا خوف جاتا رہا۔ بلکہ وہ آپ کا ذکر اس طرح کرنے لگے جیسے ان سے آپ کی پرانی ملاقات ہو۔

Scanned with CamScanner

"چھوٹے صاحب کا خوف دور کرنے کی کوشش میں امی نے آپ کے یہاں اپنی مہمانیوں کو اور آپ کی والدہ کو اس طرح اور اتنی دیر تک یاد کیا کہ بیمار ہو گئیں اور کچھ دن بعد سوتے میں خاموشی کے ساتھ گذر گئیں۔ اگر مختار ماموں نہ ہوتے تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟" مجھے مختار صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ معلوم نہیں کس وقت آ کر بیٹھ گئے تھے۔ "کیوں یہ سب سوچتی ہو؟"

"چھوٹے صاحب کے لیے ابو کے بعد امی کا صدمہ بہت بڑا تھا لیکن انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور درختوں کے کام میں لگ گئے،" ملیکہ نے کہا، "لیکن..." اس کی آواز رک گئی۔ "مختار ماموں، آپ بتا دیجیے۔"

"بار بار پوچھ کر کڑھنے سے کیا فائدہ، بیٹی،" مختار صاحب نے خاندان کے بزرگ کی طرح کہا۔ "کتنی بار تو سن چکی ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ چھوٹے صاحب درخت سے گر کر..."

"ایک بار پھر بتائیے۔ آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔"

"بتاتا ہوں، لیکن رونے نہ لگنا۔ تمھاری صحت کو نقصان پہنچے گا۔"

"اب کہاں روتی ہوں۔"

"ضبط کرتی ہو۔ وہ اور بھی نقصان کرتا ہے۔" مختار صاحب نے بتانا شروع کیا، "خیر، تو چھوٹے صاحب نے پھر بڑے صاحب کا چھوڑا ہوا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے گڈھے ٹھیک کرائے جو بڑے صاحب کے بعد بھر چلے تھے۔ پھر آپ کے درخت کی شاخوں..."

"یہ آپ لوگ اسے میرا درخت کیوں کہنے لگے ہیں؟" میں نے زرا الجھ کر ان کی بات کاٹی۔

"آپ اس کے نیچے رہتے ہیں نا؟" ملیکہ نے کہا۔ "اس کے نیچے کوئی اور نہیں رہتا۔ پھر اس کا نام بھی کسی کو نہیں معلوم۔"

مختار صاحب بولے، "چھوٹے صاحب نے پھر اس کی شاخوں کی سیدھ لے لے کر سب درختوں کی جگہیں مقرر کیں۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے، اور ایک بار پھر پورے منظر کا جائزہ لینے کے لیے درخت کے اوپر چڑھ گئے۔ سب نے انھیں منع بھی کیا، لیکن اتنی دیر میں وہ اس کی نچلی شاخ پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے انھیں گرتے دیکھ لیا لیکن مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ سر کے بل گرے ہیں۔ پھر وہ

Scanned with CamScanner

بہت اونچائی سے نہیں گرے تھے۔ ان کے منھ سے نکلا: 'ملیکہ' اور وہ ہنستے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں احتیاطاً انھیں پکڑا کر لا رہا تھا کہ اچانک وہ گر گئے۔ کانوں سے خون بھی بہنے لگا اور وہ بالکل بے ہوش ہو گئے۔ فوراً شہر کے ہسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے بعد سے جو جو علاج ہوئے، آپ کو پتا ہے۔''

کچھ دیر بعد بلّم ملیکہ کو سلام کرنے آیا۔ باتوں باتوں میں ملیکہ نے اس سے پوچھا، ''چھوٹے صاحب کو نہیں دیکھو گے؟''

''اسی لیے تو ہم آئے ہیں۔''

ملیکہ نے مجھ سے کہا، ''آپ بھی انھیں دیکھ لیجیے۔ ہم نے رات کو انھیں خواب میں دیکھا تھا۔ خیال ہوا کہ آج شاید ان کو ہوش آئے۔''

''خوابوں کا بھروسا نہیں،'' میں نے سوچا، اور بلّم، مختار صاحب اور ملیکہ کے ساتھ بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اور وہاں میں نے اس شخص کو دیکھا جو مجھ کو اپنا دوست کہتا تھا اور جسے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے، اور کچھ ہے بھی یا نہیں۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پکارا، ''چھوٹے صاحب!'' پھر اس کے نتھنوں پر ہاتھ رکھا، اس کے پپوٹوں کو آہستہ سے کھولا اور بند کیا، اس کے کان کی لووں کو دیکھا۔ میں کسی ماہر معالج کی طرح مریض کا معائنہ کر رہا تھا لیکن اس سے میرا مقصد کچھ معلوم کرنا نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن سب لوگ مجھے ایسی امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ مجھے اپنا اناڑی پن ظاہر کرنا بے رحمی کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ معائنے کے دوران میں نے بار بار اسے پکارا۔ ہر پکار پر سب تھوڑا آگے جھک کر کبھی چھوٹے صاحب کو، کبھی مجھ کو دیکھنے لگتے تھے، لیکن چھوٹے صاحب جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ مجھ کو وہاں ایک اجنبی شخص بھی نظر آیا۔ وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے غور سے دیکھا۔ سردار تھا۔ اس وقت قاعدے کا صاف ستھرا لباس پہن کر چھوٹے صاحب کو دیکھنے آیا تھا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی اور خاموشی کے ساتھ گردن جھکائے پلٹ گیا۔

Scanned with CamScanner

میں نے معائنہ ختم کیا اور مختار صاحب سے پوچھا، ''کبھی کچھ بولتے بھی ہیں؟''

''وہی ایک پکار 'ملیکہ' جوان کے ہونٹوں پر درخت سے گرتے وقت تھی۔''

''میں اس پکار کا مطلب سمجھتی ہوں،'' ملیکہ بولی۔ ''کہتے ہیں، اس درخت کو رہنے دینا۔'' پھر مجھ سے پوچھا، ''آپ نے ان کو دیکھ لیا؟ یہ ٹھیک ہو جائیں گے؟''

''مجھ سے پوچھ رہی ہو، ملیکہ؟'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ مجھے اپنی وہ عزیزہ یاد آ گئی تھیں جو جھولے پر سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھیں، پھر بیس پچیس سال تک ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ان کے ڈاڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں اور چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا صرف ذکر سنا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ یا بہت کچھ مبالغہ ہو۔ میں نے ان کا خیال ذہن سے نکال دیا اور ملیکہ کو جواب دیا، ''ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں۔ بظاہر انھیں کوئی مرض نہیں ہے۔''

پھر اچانک میرا دل دھول بن سے اچاٹ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا، یہاں کیوں پڑا ہوں۔ دنیا مجھے ویسی ہی معلوم ہونے لگی جیسی اپنا گھر چھوڑتے وقت معلوم ہوئی تھی۔ ابھی خاصا دن باقی تھا۔ میں نے درخت کے نیچے جا کر اپنا سامان اکٹھا کیا۔ آخری بار اس درخت کو دیکھا۔ ملیکہ، مختار صاحب، سردار، چودھری، کسی سے بھی رخصت نہیں ہوا۔ بستی کے باہر چھوٹے چھوٹے گڈھوں سے بچتا ہوا دور نکل آیا اور کسی نئی شہری آبادی کی تلاش میں چل پڑا۔

❄❄

Scanned with CamScanner

اگلے صفحات میں آپ چودھری محمد نعیم کے تین ایسے مضامین کا اردو ترجمہ دیکھیں گے جو ہماری تہذیبی اور ادبی تاریخ پر ایک منفرد تنقیدی اور پرتجسس زاویے سے نظر ڈالتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحریریں اس سے پہلے بھی آج میں شائع ہوتی رہی ہیں اور ان کے تسلسل سے اس گہرے شغف کا علم ہوتا ہے جو مصنف کو اس تاریخ میں آنے والے تغیرات کا بغور مطالعہ کرنے سے ہے۔ یہ مطالعہ پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اپنی تاریخ اور کلاسیکی تحریروں سے ایک گہرا لگاؤ اور ایک ایسی روشنی پیدا کرتا ہے جس کی بدولت یہ تاریخ اپنی موجودہ زندگی سے مربوط محسوس ہونے لگتی ہے۔

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

اردو شاعری کی سرپرستی

مغل اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان ایک موازنہ

شاعر وہ ہے جو شاعری سے روزی کماتا ہو۔

غلام ہمدانی مصحفی (1748-1824)

اس مضمون کا مقصد اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اردو شاعروں اور ان کے مربیوں کے درمیان تعلق کا جائزہ لینا ہے، خاص طور پر ان تبدیلیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے جو سیاسی اقتدار کے مغلوں کے ہاتھوں سے انگریزوں کے ہاتھوں میں، علامتی اور حقیقی معنوں میں، منتقل ہونے کے نتیجے میں رونما ہوئیں۔ اس مقصد سے میں تین اردو شاعروں محمد تقی میر (1732-1810)، اسداللہ خاں غالب (1797-1869) اور محمد حسین آزاد (1830-1910) کی ادبی زندگی کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لوں گا۔ ان میں سے پہلے دو کو قبل از جدید اردو کے عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا ہے جبکہ تیسرے نے اردو میں جدید شاعری اور تنقید کو وجود میں لانے میں بنیادی اور دوررس اہمیت کا حامل کردار ادا کیا۔ تاہم ان شاعروں کی جانب متوجہ ہونے سے پہلے میں شاعری اور اس کے مربیوں کے موضوع پر چند پرانے کلاسیکی ماخذ سے رجوع کروں گا اور فارسی کے بعض شاعروں اور ابتدائی مغل بادشاہوں کے باہمی تعلقات پر بھی نظر ڈالوں گا۔ مضمون کے اس ابتدائی حصے میں میں 'ادب' (protocols) کے

Scanned with CamScanner

زمرے سے متعلق دو کتابوں میں سے اس شبیہ اور کردار کے بارے میں چند واضح بیانات اخذ کروں گا جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انھیں اسلامی/ فارسی روایت کے شاعروں نے اپنالیا تھا۔

گیارھویں صدی کے مصنف کیکاؤس ابن اسکندر نے اپنی شاندار کتاب قابوس نامہ (سنہ تحریر 1082) میں شاعری کو ان کارآمد اور قابل قدر فنون کی فہرست میں شامل کیا ہے جنھیں حاصل کرنا اس کے بیٹے پر — جو اس کتاب کا مخاطب تھا — لازم تھا تاکہ وہ اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکے۔ [1] پہلے وہ ان خصوصیات کا ذکر کرتا ہے جو شاعری میں عموماً موجود ہونی چاہییں — مثلاً سادہ، نہ کہ پیچیدہ، زبان؛ استعاروں کا نمایاں استعمال — اس کے بعد وہ مربیوں کی مدح میں لکھی جانے والی نظموں کے بارے میں کچھ خاص باتیں کہتا ہے۔ ''تعریف میں وہ باتیں کہو جو ممدوح کے مناسب حال ہوں۔ اگر اس نے کبھی اپنے ہاتھ میں سبزی کاٹنے کی چھری تک نہ لی ہو تو یہ مت کہو کہ تیری تلوار شیر کی گردن کاٹ چکی ہے۔'' [2] تاہم جلد ہی مصنف کا عملیت پسند طرز فکر حاوی آجاتا ہے اور وہ لکھتا ہے: ''لیکن شاعر پر واجب ہے کہ اپنے ممدوح کی طبیعت سے آگاہ ہو کہ وہ کن باتوں کو پسند کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک تم وہ نہ کہو گے جو وہ سننا چاہتا ہے تو وہ تمھیں وہ عطا نہ کرے گا جو تم پانا چاہتے ہو۔'' [3] وہ مزید کہتا ہے کہ ''دایم تازہ روی و خندان باش و حکایات و نوادر سخن و مضحکات بسیار حفظ کن و در پیشِ ممدوح گوی کہ شاعر را ازیں چارہ نبود۔'' (ہمیشہ اپنی صورت بشاش رکھ اور پُرلطف و مضحک قصے ممدوح کے سامنے سنانے کے لیے ازبر کر لے، کیونکہ ان کے بغیر شاعر کو قطعی مفر نہیں۔) کیکاؤس نے اپنی ان ہدایات کی مثالوں کے طور پر کوئی قصے نقل نہیں کیے، نہ اس بات کی کوئی وجہ بیان کی ہے کہ کسی رئیس کو شاعری کی سرپرستی کیوں کرنی چاہیے۔ لیکن وہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ شاعر کو اپنی روزی شاعری ہی کے ہنر سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کے لیے اسے نہ صرف قصیدہ نگاری بلکہ شاعری کی دوسری اصناف پر بھی مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ شاعر اپنے مربی کو بہت سے طریقوں سے خوش کرتا ہے، اور شاعری کے ہنر میں مناسب مہارت ایسے لوگوں کے لیے بہت کارآمد ہے جو کسی بادشاہ کی مصاحبت اختیار کرنا چاہتے ہوں۔

مگر قابوس نامہ کا مصنف خود شاعر نہیں تھا؛ وہ محض ایک معمولی جاگیردار تھا۔ اس کا اصل سروکار اپنے بیٹے کو عملی مشورے دینے سے تھا، اور اس کے نقطۂ نظر سے پیسہ کمانے کے لیے شاعری بھی

Scanned with CamScanner

ویسا ہی کار آمد طریقہ تھا جیسے تجارت۔ درحقیقت اختیار کیے جانے کے لائق پیشوں کی جو فہرست اس نے تیار کی، اس میں ترتیب کے لحاظ سے تجارت کا مقام پہلا ہے، اس کے بعد طب، ستارہ شناسی اور پھر شاعری کی باری آتی ہے۔ اس سے مختلف تناظر کے لیے ہمیں ایک اور متن سے رجوع کرنا ہوگا جسے ایک شاعر نے لکھا ہے: یعنی سمرقند کے نظامی عروضی کی کتاب چہار مقالہ (سنہ تحریر اندازاً 1152)[4]۔

نظامی کی کتاب کا خطاب عمومی طور پر مربی بادشاہوں سے ہے۔ وہ تاکید سے کہتا ہے کہ ہر بادشاہ کو اپنی صحبت میں، کچھ ایسے لوگ رکھنے چاہییں جو حسنِ تدبیر ورائے میں افضل اور اکمل ہوں تاکہ اسے حکمرانی کی ذمے داریاں نبھانے میں مدد دے سکیں۔ ایسے لوگوں میں وہ چار کی خاص نشاندہی کرتا ہے۔ ''اما دبیر وشاعر ومنجم وطبیب از خواصِ پادشاہ ہند واز ایشان چارہ ای نیست۔ قوامِ ملک بہ دبیر است وبقاے اسمِ جاودانی بہ شاعر وصحتِ بدن بہ طبیب۔'' (چنانچہ بادشاہ کے خاص ندیم چار ہیں: دبیر، شاعر، ستارہ شناس اور طبیب، اور انھیں کسی صورت بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انتظام وانصرام دبیر (معتمد) کے ذریعے ہوتا ہے؛ بقاے اسمِ جاودانی شاعر کے ہاتھوں ہوتی ہے؛ معاملات کے اوقاتِ کار ستارہ شناس کی مدد سے طے ہوتے ہیں؛ اور جسمانی صحت کا خیال طبیب رکھتا ہے۔''[5]

نظامی شاعروں کے باب میں 'بقاے اسمِ جاودانی' کے موضوع پر پھر لوٹتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ''پس پادشاہ را از شاعرِ نیک چارہ نیست۔ ... زیرا کہ چوں پادشاہ بہ امرے کہ ناگزیر است مامور شود، از لشکر وگنج وخزینۂ او آثار نماند، ونامِ او بہ سببِ شعرِ شاعراں جاوید بماند۔'' (بادشاہ ایک اچھے شاعر کو کبھی ترک نہیں کر سکتا... کیونکہ جب بادشاہ کو وہ آخری بلاوا موصول ہوتا ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، تو اس کے بعد اس کی فوج، اس کا خزانہ اور اس کا توشہ خانہ، ہر چیز کا نشان مٹ جاتا ہے؛ لیکن خود اس کا اپنا نام شاعر کے کلام میں ہمیشہ باقی رہتا ہے۔)[6] اس کے بعد وہ کچھ ایسے شاعروں کا تذکرہ کرتا ہے جن کے کلام نے پڑھنے والوں کے حافظے میں سامانی اور غزنوی سلاطین کے ناموں کو باقی رکھا۔ تاہم اس نے ایسی کوئی مثال نہیں دی کہ کوئی بادشاہ خود اپنی زندگی میں کسی شاعر کی قصیدہ گوئی کی بدولت مشہور ہوا ہو۔ اس بات پر یقین کرنا دشوار ہے کہ کسی شاعر سے معاملہ کرتے ہوئے کسی بادشاہ کے ذہن میں بعد میں آنے والوں کا اور اپنے لافانی بنائے جانے کا خیال رہتا ہوگا۔ اسے

Scanned with CamScanner

حاصل ہونے والے فوائد یقیناً اس سے کہیں زیادہ فوری نوعیت کے ہوتے تھے: یعنی محفل کا لطف اور اچھی صحبت۔ یہ بات ان واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے جنھیں نظامی نے اپنی بات کی تائید میں درج کیا ہے۔ اور ان کی تمہید میں وہ کہتا ہے کہ ''اما در خدمتِ پادشاہ ہیچ بہتر از بدیہہ گفتن نیست کہ بہ بدیہہ طبع پادشاہ خرم شود، و مجلس ہا برافروزد، و شاعر بہ مقصود رسد۔'' (بادشاہوں کے حضور برجستگی سے بڑھ کر کوئی شے نہیں، کیونکہ اسی سے بادشاہ کی طبیعت بشاش ہوتی ہے، مجلسیں روشن ہوتی ہیں، اور شاعر کو اپنا مقصود حاصل ہوتا ہے۔)[7] ''بدیہہ گفتن رکنِ اعلیٰ است در شاعری، و بر شاعر فریضہ است کہ طبع خویش را بہ ریاضت بداں درجہ رساند کہ در بدیہہ معنی انگیزد، کہ سیم از خزینہ بہ بدیہہ بیرون آید، و پادشاہ را حسبِ حال بہ طبع آرد۔'' (بدیہہ گوئی یا برجستگی شاعری کے فن کا بنیادی رکن ہے۔ شاعر پر فرض ہے کہ اس باب میں ریاضت کر کے اپنے بدیہہ کو بھی ہر طرح وقیع بنا دے، کیونکہ خزانے سے چاندی اسی سے نکلتی ہے، اور اسی سے بادشاہ کو کوئی بات فوراً منظورِ خاطر ہو جاتی ہے۔)[8]

اس نے جن واقعات کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے ان سب میں برجستہ شعر کہنے یا اپنے حافظے سے کسی اور کا شعر برمحل سنانے کی اثر انگیزی کا پتا چلتا ہے، اور اس کے نتیجے میں شاعر کو حاصل ہونے والے انعامات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ بیشتر واقعات بہت طویل اور مفصل ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے ایک مختصر واقعہ ہی نقل کر سکتے ہیں جس کا اختتام حسنِ اتفاق سے ایک ایسے تبصرے پر ہوتا ہے جو ہمارے موجودہ مقصد کے لیے مفید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان کے الک خانی حکمران سلطان خضر بن ابراہیم (fl. 1079-95) کے دربار میں کئی شاعر تھے۔ ان میں امیر امعق ملک الشعرا تھا جبکہ ایک اور شاعر رشیدی دوسرے مقام پر تھا۔ ایک بار رشیدی کی غیر موجودگی میں سلطان نے امعق سے رشیدی کی شاعری کے بارے میں رائے دریافت کی۔ امعق نے جواب دیا: ''اس کا کلام تو نہایت اچھا ہے، پاکیزہ اور درست، لیکن اس میں نمک کی کمی ہے۔'' بعد میں رشیدی کے آنے پر سلطان نے اسے چھیڑنے کے لیے اسے امعق کی رائے بتائی اور شعر میں اس کا جواب دینے کی فرمائش کی۔ رشیدی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے:

شعر ہاے مرا بہ بے نمکی
عیب کردی، روا بود، شاید

شعرِ من ہمچو شکر و شہد است
وندریں دو نمک نکو ناید
شلغم و باقلیست گفتۂ تو
نمک، اے قلتباں، ترا باید

(تو نے میرے کلام میں یہ عیب نکالا کہ وہ بے نمک ہے۔ بجا ارشاد۔ میرا کلام تو شہد و شکر کے مثال ہے، اس کو نمک کی کیا ضرورت۔ نمک کی حاجت تو، اے بے غیرت، تجھے ہے، کیونکہ تیرا کلام پھیکی ترکاریوں کی طرح ہے۔)

نظامی لکھتا ہے:

خضر خان کے دربار میں زرِسرخ سے بھری چار کشتیاں رکھی رہتی تھیں جن میں سے ہر ایک میں ڈھائی سو دینار ہوتے تھے، اور سلطان مٹھیاں بھر بھر کر سکے بطور انعام دیا کرتا تھا۔ اُس روز اس نے چاروں کشتیاں رشیدی کو انعام میں دینے کا حکم دیا جو اس کے اعلیٰ ترین اعزاز اور شہرت کا باعث ہوا۔ کیونکہ جس طرح اچھا شاعر بادشاہ کی ناموری کا سبب بنتا ہے اسی طرح شاعر بھی بادشاہ سے بھاری انعام پا کر شہرت حاصل کرتے ہیں، اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔[9]

شاعروں کے بارے میں نظامی کے بیان سے ہم مندرجہ ذیل نتائج برآمد کر سکتے ہیں: (1) مربیوں کو عمدہ شاعروں کے کلام میں مذکور ہونے کے باعث آنے والی نسلوں میں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ (2) وہ شاعروں کو بھاری انعامات دے کر نہ صرف اپنے زمانے میں ناموری حاصل کرتے ہیں بلکہ بعد میں بھی، جب ان واقعات کا ذکر کتابوں میں آتا ہے۔ (3) شاعروں کو اپنے مربی سے نہ صرف روزی حاصل ہوتی ہے بلکہ عزت اور شہرت بھی ملتی ہے اور تاریخ میں مقام بھی حاصل ہوتا ہے۔ (4) شاعر اپنے مربی کو خوش کرنے کے لیے کئی طریقوں سے کام لیتے ہیں: ان کی مدح میں قصیدے لکھ کر؛ ان کی فرمائش پر شعر موزوں کر کے؛ اپنی برجستگی اور پُرلطف حاضر دماغی کے ذریعے؛ اور فوری فرمائش پر فی البدیہہ شعر کہہ کر۔ جس بات کا نظامی نے صاف لفظوں میں تذکرہ نہیں

Scanned with CamScanner

کیا لیکن جسے اس کے درج کیے ہوئے کئی واقعات میں دیکھا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ بیشتر شاعر اپنی حیثیت کے بارے میں خاصے حساس تھے۔ نظامی خود بھی شاعر تھا اور اس کا اپنا مفاد اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔ لیکن ہمارے اخذ کردہ اس نتیجے کی وافر تصدیق شعرا کے تذکروں اور دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ شاعروں کو احساس رہتا تھا کہ خزانے کی کنجی کس کے ہاتھ میں ہے، لیکن عام طور پر وہ گڑگڑانے اور بھیک مانگنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ اپنی بابت ایک حد تک احترام کے رویے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اور اکثر ان سے خوف بھی کھایا جاتا تھا؛ ان میں سے بیشتر کسی کی مدح کے ساتھ ساتھ ہجو بھی یکساں روانی کے ساتھ کرنے پر قادر ہوتے تھے۔ جیسا کہ قابوس نامہ کا مصنف لکھتا ہے، ''ہر چہ ضدِ مدح بود ہجا باشد'' (مدح کی ضد ہجو ہے۔)[10] ہم مضمون کے اس حصے کا اختتام کرتے ہوئے انوری (سنہ وفات اندازاً 1152) کے اشعار یاد کر سکتے ہیں جس نے اپنے ایک مربی سے مخاطب ہو کر لکھا تھا:

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را
یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نہ داد، ہجا
ازیں سہ بیت دو گفتم، دگر چہ فرمائی

(امیدوار شاعر تین شعر کہتا ہے: پہلا اپنے مربی کی مدح میں، دوسرا حسنِ طلب میں، پھر تیسرے شعر کی باری آتی ہے۔ اگر مربی انعام سے نوازے تو اس کی شکر گذاری میں، اور اگر انعام کی توقع پوری نہ ہو تو اس کی مذمت میں۔ حضور، پہلے دو شعر میں لکھ چکا: تیسرے کے بارے میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔)[11]

•

اکبر (زمانۂ حکمرانی 1556-1605)، جس سے ہندوستان پر مغل راج کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، شاعروں کی سرپرستی کیا کرتا تھا جیسا کہ بادشاہ کے طور پر اس کے منصب کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے دربار میں ملک الشعرا کا عہدہ قائم کیا اور اس پر پہلے ایران کے ایک شاعر غزالی کو اور پھر آئینِ

Scanned with CamScanner

اکبری کے مصنف ابوالفضل کے بڑے بھائی فیضی کو فائز کیا۔ ابوالفضل کے مطابق دربار میں مختلف وقتوں میں انچاس شاعر حاضر ہوئے اور ان کے علاوہ بہت سے شاعروں نے دور دراز کے مقامات سے اکبر کے قصیدے لکھ کر بھیجے۔ [12] لیکن اکبر شاعری کا اتنا شوق نہ رکھتا تھا جتنا تاریخ اور قصے کہانیوں کا۔ شاعری کی صرف ایک تصنیف ایسی ہے جس کا تعلق اس کی براہ راست سرپرستی سے بیان کیا جاتا ہے، فیضی کی مثنوی نل دمن۔ تاہم ملک الشعرا کی حیثیت سے فیضی کو صرف 'چار سو سواروں' کا عہدہ حاصل تھا جبکہ اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل، جو فلسفی اور مدبر، مورخ اور انشا پرداز تھا، ترقی کر کے ڈھائی ہزار سوار کے منصب تک پہنچ گیا۔

اکبر کے ذہن میں بیشتر غیر درسی (non-didactic) شاعری کے بارے میں شبہات تھے۔ انھیں ابوالفضل نے اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ آئینِ اکبری کے باب ''قافیہ سنجاں'' میں وہ لکھتا ہے:

''راہی بہ نہاں خانۂ معنی بردہ اندو روشن ضمیر شان تابش گاہِ ایزدی فیض، لیکن بسیارے گرانمایگی گوہر نشاسند و بہ آرزوے کمتر خواستہ باز فروشند در ستائش فرومایگانِ روزگار بسپرند و بہ نکوہش فروہیدۂ مردم زبان برآلایند، وگرنہ پیوندِ الفاظ بس شگرف باشد چہ جاے دریافتِ والامعنی شعر۔ آنکہ سخن را بہ سخن ضم کند قطرۂ از خونِ جگر کم کند۔ ... ازیں رو گیتی خداوند بدینان نہ پرداز دو مشتی خیالی راوز نے نہ نہد۔ نادان اند کہ شہریار را بدیں طرزِ گفتار دل نکشد و بدیں رہگزر ازیناں خاطر برگرفتہ دارد۔''

(یہ لوگ معنی کے نہاں خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کے روشن ضمیر آسمانی رحمتوں سے منور ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر اپنی صلاحیت کی صحیح قدر سے ناواقف ہوتے ہیں اور اکثر اسے حقیر خواہشات کی نذر کر دیتے ہیں۔ اسے بے حقیقت لوگوں کی تعریف کرنے میں صرف کر دیتے ہیں یا پھر دانشمندوں کی ہجو سے اپنی زبان گندی کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو الفاظ کو ایک دوسرے سے جوڑنا ایک بلند رتبہ فن ہے، اور عمدہ اشعار کی اعلیٰ خیالی کا کہنا ہی کیا!... اسی سبب جہاں پناہ شاعروں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے اور نہ ان کی خیالی باتوں میں کوئی اہمیت دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جو نادان ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ شہریار کو شاعری سے دلی دلچسپی نہیں اور ان کا دل شاعروں سے پھر چکا ہے۔) [13]

Scanned with CamScanner

اکبر کے اپنے الفاظ، جنھیں ابوالفضل نے ایک دوسری جگہ درج کیا ہے (دفترِ پنجم، ''دل آویز گفتارِ شہنشاہی'') کہیں زیادہ کفایت سے اس کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں: ''چوں اساسِ شاعر بر ناراست گزاری است و در پیشگاہ خاطر پذیر فتگی نیابد۔'' (چونکہ شاعر اپنی بنیاد جھوٹ پر رکھتے ہیں، اس لیے خاطر ان کو قبول نہیں کرتی۔)[14] اور یہ کہ ''بازیگر بادست و پا اصول آورد و شاعر بہ زبان۔'' (بازیگر اپنا فن ہاتھ پیروں سے دکھاتے ہیں، شاعر زبان سے۔) لیکن اس بات کی تصدیق کہ وہ شاعری سے کسی قدر لطف اندوز ہوتا تھا، تیسرے اقتباس سے ہوتی ہے: ''ہر کہ شعرِ دیگرے گزیں تضمین می کند یا بجا می خواند، پایہ او و خویشتن وا می نماید۔'' (جو شخص کسی اور کا شعر عمدگی سے تضمین کرتا ہے یا اسے برمحل پڑھ دیتا ہے، وہ اپنا اور اس شاعر کا رتبہ نمایاں کر دیتا ہے۔) (آئینِ اکبری، ص 587)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے دو اقتباسات میں اکبر کا شاعری کی بابت وہی رویہ سامنے آتا ہے جو قابوس نامہ کے مصنف کا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی پسندیدہ کتابوں میں سے تھی — اسے اس نے کئی بار پڑھوا کر سنا تھا۔

اکبر کا بیٹا جہانگیر (زمانۂ حکمرانی 28-1605) شاعری سے کہیں زیادہ گہرا شغف رکھتا تھا اور اس کے تزک میں ان شاعروں کے باقاعدہ حوالے ملتے ہیں جو اس کے دربار سے متعلق تھے۔ وہ ان موقعوں کا حال بیان کرتا ہے جب اس نے بعض شاعروں کو انعامات دیے اور وہ ان کے اشعار بھی نقل کرتا ہے۔ شاہجہاں (زمانۂ حکمرانی 59-1628) نے بھی اپنے دربار میں ملک الشعرا مقرر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور وہ اپنے دادا کے مقابلے میں فنِ شاعری کا کہیں زیادہ قدردان تھا۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے کئی شاعروں کو سونے میں تلوایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے دور کے زیادہ عمدہ شاعر شاہی دربار سے متعلق تھے، جبکہ اکبر کے زمانے میں بہتر شاعروں کی سرپرستی یا تو اکبر کے امرا کرتے تھے یا دکن کے سلاطین۔ جہاں تک لافانی شہرت کے انتظام کا تعلق ہے، اس سلسلے میں اکبر نے اپنے پسندیدہ نثر نگار ابوالفضل پر انحصار کیا، جبکہ جہانگیر نے خود اپنی تزک لکھی؛ صرف شاہجہاں نے اپنے ملک الشعرا سے فرمائش کی کہ وہ اس کے عہد کی تاریخ لکھے — منظوم تاریخ! اسی شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک موقعے پر اپنے مربی کی شان کا دفاع یہ نکتہ بیان کر کے کیا تھا کہ اگر وہ خود کو 'شاہِ جہاں' کہتا ہے تو درست کہتا ہے، کیونکہ 'ہند' اور 'جہاں' کے اعداد یکساں ہیں۔[15] تاہم ان

Scanned with CamScanner

تینوں مغل مربیوں میں کوئی بھی خود شاعر نہ تھا، چنانچہ ان میں سے کسی کو اپنے شعروں پر اصلاح کرنے یا اپنے لیے شعر کہہ کر دینے کے لیے کسی شاعر کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے برخلاف، جہانگیر خود کو فن شاعری کا ماہر سمجھتا تھا اور کئی واقعات میں یہ ذکر ملتا ہے کہ اس نے شاعروں کو اصلاح دی۔ اس قسم کی مہارت اکبر کے امرا حکیم ابوالفتح اور عبدالرحیم خانخاناں میں بھی اعلیٰ درجے کی تھی، جنھیں ان کے دربار کے شاعر سچ مچ اپنا مربی سمجھتے تھے، یعنی ایسا شخص جو مادی اور تخلیقی دونوں اعتبار سے ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس دور کے شاعر اپنے مربیوں کی شان میں اور خاص تقریبات کی مناسبت سے قصیدے لکھتے اور ادبی مجالس میں شریک ہوتے — تاہم وہ اپنے مربیوں کی شاعری پر اصلاح نہیں دیتے تھے — اور بیش قیمت انعامات پاتے تھے۔ [16]

ان ابتدائی مغل بادشاہوں کے برعکس، اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے بادشاہ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ عالم ثانی (زمانۂ حکمرانی 1806-1759) اور بہادر شاہ ثانی (زمانۂ حکمرانی 57-1837) دونوں شعر کہتے تھے اور انھوں نے کئی شاعروں کو اپنا استاد مقرر کیا۔ لیکن انھوں نے اس مقصد سے کوئی نیا منصب یا عہدہ نہیں قائم کیا اور نہ کسی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ بہادر شاہ کے استاد ذوق کو 'ملک الشعرا' نہیں بلکہ 'خاقانی ہند' کہا جاتا تھا جس سے محض ان کی قصیدہ گوئی کی مہارت کی تصدیق ہوتی تھی۔ [17] درحقیقت معلوم ہوتا ہے کہ 'ملک الشعرا' کا خطاب عطا کرنے کا منصب اٹھارھویں صدی کے بعض اردو شاعروں نے خود سنبھال لیا تھا — مثلاً مرزا محمد رفیع سودا کو ان کے دو معاصر شاعروں نے 'ملک الشعرا' قرار دیا، جبکہ اس کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ سودا کو یہ خطاب مغل دربار سے عطا ہوا ہو۔ [18] بلاشبہ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل خود مختاری اس وقت تک کس زار حالت کو پہنچ چکی تھی۔ دوسری جانب چند سال بعد جب اودھ کے خود ساختہ بادشاہ غازی الدین حیدر نے امام بخش ناسخ کو ملک الشعرا کا خطاب دینا چاہا تو ناسخ نے خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ خطاب عطا کرنے کا حق یا تو مغل بادشاہ کو ہے یا سرکار برطانیہ کو۔ [19] بہرحال، 1857 سے پہلے کے سو برس وہی تھے جن کے دوران شمالی ہند میں اردو شاعری نے شاندار ترقی کی اور میر اور غالب جیسے اعلیٰ اردو شاعروں کو، ان کی زندگی کے بیشتر حصے میں، خطیر تو نہیں البتہ معقول سرپرستی میسر رہی۔ اب ہم ان کے تجربات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

میر (پ 1723) نے اپنی خودنوشت سوانح ذکرِ میر میں بیان کیا ہے کہ ان کے باپ محمد علی آگرہ میں درویش کے طور پر خاصی شہرت رکھتے تھے، اگرچہ کسی اور شہادت سے تاحال اس کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔ محمد علی نے دو شادیاں کیں اور ایک وقت تھا کہ ان کے پاس بہت سے ملازم تھے؛ لیکن میر نے ایسے موقعوں کو بھی بیان کیا ہے جب زندگی کہیں زیادہ دشوار تھی۔ ہم آسانی سے فرض کر سکتے ہیں کہ درویش کے طور پر محمد علی کے بہت سے مرید رہے ہوں گے جو ان کی اور ان کے خاندان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوں گے — یہ عمل اگر ثواب کا کام سمجھا جائے تب بھی اسے ایک طرح کی سرپرستی ہی کہا جائے گا۔

باپ کی وفات کے بعد میر نے — جن کی عمر اس وقت صرف گیارہ برس کی تھی — دہلی جا کر صمصام الدولہ تک رسائی پانے کی کوشش کی جو ان کے باپ کے واقفکاروں میں سب سے ممتاز شخص تھے، اور ایک وسیلے کی مدد سے ان سے ایک معمولی ماہانہ وظیفہ جاری کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ سید اور درویش کا فرزند ہونے کی حیثیت سے میر اس قسم کی سرپرستی کی توقع رکھتے تھے۔ جب ان کے اس مربی کی وفات کے بعد ان کا وظیفہ بند ہوگیا، تب میر دوبارہ دہلی گئے اور وہیں رہ گئے۔ یہاں انھوں نے کسی قدر تعلیم حاصل کی اور رفتہ رفتہ شعرگوئی میں بھی ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ تب انھوں نے مشاعروں میں شرکت شروع کر دی اور جلد ہی ان کی شاعری کی شہرت ہونے لگی — اور اسی سے انھیں (بطور شاعر) اپنا پہلا مربی بھی میسر آیا۔ یہ ایک معمولی رئیس رعایت خاں تھا جس نے میر کو اپنا رفیق مقرر کرلیا۔ اس کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ میر نے رعایت خاں کی شان میں قصیدے لکھے ہوں یا اس کی شاعری پر اصلاح دی ہو۔ میر کا کام غالباً صرف گفتگو اور شاعری سے رئیس کا دل بہلانا اور موقع آنے پر اس کا رازدار بنتا رہا ہوگا۔ لیکن جلد ہی میر کا ان سے اختلاف ہوگیا۔ ایک چاندنی رات میں رعایت خاں اپنی مہتابی پر بیٹھا ایک نوعمر گویے کا گانا سن رہا تھا کہ میر وہاں آپہنچے۔

> (خان نے) جب مجھے دیکھا تو کہنے لگا، ''میر صاحب، اسے اپنے دو چار شعر ریختہ کے رٹا دیجیے، پھر یہ لڑکا انھیں بستہ نگار کی دھن میں بٹھا کر گا لے گا۔'' میں نے کہا، ''میں اس گوں کا آدمی نہیں ہوں۔'' خان کہنے لگا، ''تمھیں میرے سر کی قسم۔'' چونکہ نوکری کا معاملہ تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اسے یاد کرا دیے۔ مگر یہ بات میری طبعِ نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر

Scanned with CamScanner

دو تین دن بعد خانہ نشین ہو گیا۔ اُس نے ہر چند لطف کیا، نہیں گیا اور وہ نوکری چھوڑ دی۔ 21

میر نے اپنے مربی کو اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ انھیں اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی — ہتک انھیں اس بنا پر محسوس ہوئی کہ انھیں ایک ایسے فرد سے اپنے برابر کے درجے کا سلوک کرنے پر مجبور کیا گیا جسے وہ سماجی حسبِ مراتب میں اپنے سے بہت ادنیٰ سمجھتے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ شاعر اپنے مربی کی خدمت بجالانے کو تیار تھا لیکن اس تعلق کے کچھ اصول تھے جن پر دونوں فریقوں کا کاربند رہنا ضروری تھا۔

اگلے چند سال میر کا تین دوسرے مربیوں سے تعلق رہا جن میں سے آخری راجہ جگل کشور ایک معمولی درجے کا امیر تھا جس نے میر سے ''اپنے اشعار پر اصلاح کرنے کو کہا۔ میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور ان کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔'' 22 لیکن اسی راجہ جگل کشور کے وسیلے سے آخرکار میر کی ملاقات ایک زیادہ اثردار امیر اور نائب وزیر راجہ ناگرمل سے ہوئی جس نے میر کو اپنا مصاحب اور رازدار مقرر کر لیا۔

میر نے چودہ برس راجہ ناگرمل کی نوکری میں گزارے۔ راجہ جگل کشور کے برخلاف راجہ ناگرمل خود شاعر نہ تھا، صرف شاعری کا قدردان تھا۔ میر کو اشعار پر اصلاح نہ کرنی پڑتی تھی۔ شاعر اور مربی اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے رہے، یہاں تک کہ ایک موقع آیا جب میر کو ایک بار پھر اپنی توہین کا احساس ہوا۔ ایک بار جب دونوں دہلی کے باہر ایک قافلے میں اقامت گزیں تھے، راجہ نے میر کو اپنا سفیر بنا کر ایک سیاسی معاہدے کے لیے بھیجا۔ معاہدہ کامیابی سے طے پا گیا، تاہم راجہ نے بعد میں معاہدے کے برخلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ میر اس کے ساتھ مجبوراً دہلی واپس چلے آئے لیکن پھر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد، میر لکھتے ہیں، ''میں گدائی کے لیے نکل پڑا اور لشکرِ شاہی کے ہر سردار کے در پر گیا۔ چونکہ شاعری کے سبب میری شہرت بہت تھی، لوگ گونہ عنایات میرے حال پر مبذول کرتے تھے۔ بارے (ان کی تھوڑی بہت امداد سے) کتے بلی کی سی زندگی گزارتا رہا۔''23 اگلے سات آٹھ برس میر پر بہت کٹھن گزرے۔ ان کی گزربسر بہت سے اشخاص کی مہربانی سے ہوتی رہی جن میں شاہ عالم ثانی بھی تھا جو خود دوسرے کے رحم و کرم پر زندگی

Scanned with CamScanner

گزار رہا تھا۔ میر لکھتے ہیں، ''فقیر ان دنوں گوشہ نشین تھا۔ بادشاہ نے اکثر طلب کیا، نہیں گیا۔... کبھی (کسی تقریب سے) بادشاہ... کچھ بھجوا دیتے تھے۔''24 یہاں میر پورا سچ نہیں بول رہے ہیں۔ ان کی کلیات میں شاہ عالم ثانی کی مدح میں کہا گیا ایک قصیدہ موجود ہے۔ انھوں نے اسے ضرور بادشاہ کے حضور میں نذر کیا ہوگا لیکن غالباً انعام سے ناامید ہوے ہوں گے۔

1781 کے آخر تک میر دہلی سے نکل جانے کو بیتاب ہو چکے تھے۔ ان کی عمر ساٹھ برس کو پہنچ رہی تھی اور شاعر کے طور پر ان کی شہرت نہ صرف دہلی میں مستحکم ہو چکی تھی بلکہ شمالی ہند کے اردو ثقافت کے تمام مراکز میں پھیل چکی تھی۔ میر نے لکھنؤ کے حکمران نواب آصف الدولہ سے سلسلہ جنبانی کی اور ایک وسیلے سے اس کی خدمت میں ایک قصیدہ بھیجا؛ یہ وسیلہ غالباً سالار جنگ تھا جس سے میر کی واقفیت اپنے سوتیلے ماموں (خانِ آرزو) کے توسط سے تھی۔ میر کے مطابق سالار جنگ نے:

> یہ کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہِ عنایت زادِراہ کے لیے کچھ مرحمت فرمادیں تو میر ضرور آ جائے گا۔ انھوں نے سرکار سے کچھ (زادِراہ) لے کر مجھے خط لکھا کہ ''نواب والا جناب تمھیں طلب فرماتے ہیں، جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔'' میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا، خط پاتے ہی لکھنؤ کے لیے چل پڑا۔

لکھنؤ میں وہ پہلے سالار جنگ کے گھر گئے۔ میر لکھتے ہیں:

> چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نوابِ عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے، ''میر محمد تقی ہو؟'' (پھر) بڑی عنایت سے بغلگیر ہوے اور اپنے ساتھ نشست گاہ پر لے گئے اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سنائے۔ میں نے کہا، ''سبحان اللہ، بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔'' فرطِ مہربانی سے مجھے بھی (شعرخوانی کا) موقع دیا۔ اُس روز میں نے غزل کے چند شعر سنائے۔ جب نواب صاحب اٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ نے کہا کہ ''میر حسب الطلب آ گئے ہیں۔ اب بندگانِ عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں۔'' (نواب آصف الدولہ نے) فرمایا، ''میں کچھ (تنخواہ) مقرر کر کے تمھارے پاس اطلاع بھیج دوں گا۔'' دو تین دن بعد یاد فرمایا۔ میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا۔ سماعت

Scanned with CamScanner

فرمایا اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کر لیا۔''25

نواب نے، جو خود بھی شاعر تھا، اگرچہ معمولی درجے کا، میر کے ساتھ خاصا اچھا سلوک کیا؛ ان کی تنخواہ مقرر کر دی جو، بعض ذرائع کے مطابق، دو سو روپے ماہوار تھی، اور بعض کے مطابق تین سو روپے۔ لیکن اس امر میں شبہ ہے کہ میر کو کبھی پوری تنخواہ ملی ہو — اُن دنوں کسی کو بھی پوری تنخواہ شاذ ہی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری ناامیدیوں کا بھی سامنا ہوا۔ میر نے نواب کی خاطر تین شکارنامے لکھے تھے۔ تیسرے شکارنامے کے اختتام سے کچھ پہلے میر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح فردوسی نے شاہنامہ اور کلیم نے شاہجہاں نامہ لکھ کر اپنے ممدوحوں کو دائمی شہرت عطا کر دی، اسی طرح انھوں نے بھی اپنے ممدوح آصف الدولہ کا نام یہ شکارنامے لکھ کر روشن کر دیا ہے۔ لیکن نظم کے بالکل آخر کے دو شعر:

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

صاف ظاہر کرتے ہیں کہ میر کو خاطرخواہ کامیابی نہیں ہوئی، اور انھیں مقطع:

بہت کچھ کہا ہے، کرو میر بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

لکھنے کے بعد نظم میں ان دو شعروں کا اضافہ کرنا پڑا۔ 26

بہت ممکن ہے کہ نواب اور میر کے بیچ کوئی ادب و آداب کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ میر کی خودنوشت سوانح میں مارچ 1789 تک کے واقعات درج ہیں اور بعض داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک میر نے خانہ نشینی اور کسی قدر عسرت کی زندگی دوبارہ اختیار کر لی تھی۔ ان کی زندگی کے بعد کے برسوں کے لیے ہمیں ایک اور ذریعے سے رجوع کرنا ہوگا، یعنی محمد حسین آزاد کا تذکرہ آبِ حیات (پہلی اشاعت 1880) جس میں میر کی زندگی کے ایسے واقعات درج ہیں جو

Scanned with CamScanner

آزاد نے پڑھے یا سنے تھے۔ آزاد نے نواب آصف الدولہ سے میر کی علیحدگی کا حال یوں بیان کیا ہے۔

ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب، کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے تھے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا، آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں، متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا، جو شعر ہوگا وہ آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب صاحب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب، آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا، کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا، بازار میں باتیں کرنا آدابِ شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔[27]

آزاد کے مطابق، اگلے نواب، سعادت علی خاں، نے آخر آخر میر کی کسی قدر سرپرستی کی، اور اس کی بھی کچھ دوسری شہادتیں موجود ہیں کہ جب 1810 میں میر کا انتقال ہوا تو وہ عسرت کا شکار نہیں تھے۔ اس وقت تک لکھنؤ میں برطانوی موجودگی خاصی مستحکم ہو چکی تھی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض افسر اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن اردو سے انگریزوں کی دلچسپی کا بڑا مرکز کلکتہ تھا جہاں متعدد اردو ادیبوں کو فورٹ ولیم کالج کے لیے کتابیں تیار کرنے کے کام پر ملازم رکھا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کا انتخاب کرتے وقت لکھنؤ کے ریزیڈنٹ نے میر کے نام پر بھی غور کیا تھا لیکن میر کی کبر سنی کے باعث یہ ارادہ ترک کر دیا گیا تھا۔ اس پر لکھنؤ کے خوش طبعوں نے پھبتی کسی کہ ”کلکتہ میں شاعری کی جادر خواستِ حمالی ہے۔“[28]

اس کے برخلاف غالب (پ 1797) ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی کے خاصے

Scanned with CamScanner

ممنونِ احسان تھے۔ [29] انھوں نے لکھا ہے: ''من کہ درنامہ از جنبش خامہ گہر فرومی ریزم، از کودکی نمک پروردۂ سرکارِ انگریزم۔'' (میں کہ میرے قلم سے موتی ٹپکتے ہیں، بچپن سے انگریزی حکومت کا نمک خوار ہوں۔) [30] وہ کرائے کے فوجیوں کے ایک وسط ایشیائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے — ان کے والد نے الور کے راجہ کی خدمت میں جان دی تھی اور چچا نے آگرہ کے قلعے پر قبضہ کرنے میں مراٹھوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔ درحقیقت غالب کو زندگی بھر اس پنشن میں سے حصہ ملتا رہا جو انگریزوں نے ان کے چچا کے نام ان کی خدمات کے عوض جاری کی تھی۔

غالب نے آگرہ میں پرورش پائی اور خاصی تعلیم گھر پر رہ کر حاصل کی، تاہم انھیں کسی پیشے کی باقاعدہ تربیت میسر نہ ہوئی۔ اس کے باوجود، غالب کے لفظوں میں کسی قدر تصرف کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانے نے ان کے اجداد کے نیزوں کو قلم کی نوک میں بدل دیا۔ غالب اپنی شادی کے بعد 1810 میں دہلی منتقل ہوئے اور ایک نوجوان شریف زادے کی حیثیت سے شہر کی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا اور انیس برس کی عمر کو پہنچنے تک ان کا دیوان مکمل ہو چکا تھا۔ پھر انھوں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور اگلے تیس برس قریب قریب فارسی ہی میں لکھا۔ اس دوران غالب کا کوئی مربی نہ تھا، اگرچہ انھوں نے مربی حاصل کرنے کی کئی بے سود کوششیں کی تھیں۔ انھوں نے لکھنؤ کے حکمران نصیرالدین حیدر کی مدح میں قصیدہ لکھ کر بھجوایا لیکن اس کے عوض انھیں اس انعام کا ایک پیسہ بھی نہ ملا جو کہا جاتا تھا کہ دینا منظور ہوا تھا۔ اس سے پہلے کلکتہ کے سفر کے دوران وہ لکھنؤ میں ٹھہرے تھے اور وہاں کے بااثر وزیر آغا میر سے ان کی ملاقات طے ہوئی تھی لیکن یہ ملاقات ہو نہ سکی۔ غالب نے فارسی نثر کی ایک تحریر انھیں پیش کرنے کے لیے خاص طور پر تیار کی تھی جس میں کوئی نقطوں والا حرف استعمال نہیں ہوا تھا۔ لیکن، جیسا کہ، انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا، ''کیونکہ دوسرے فریق نے مجھے اپنے مساوی حیثیت دینے سے انکار کیا...'' [31] مشہور دہلی کالج میں ان کی بطور استاد تقرری پر بھی غور کیا گیا، لیکن وہاں بھی رکھ رکھاؤ کا ویسا ہی مسئلہ سامنے آ گیا اور غالب نے پیشکش نامنظور کر دی۔ انھوں نے مغل دربار میں منصب حاصل کرنے کی بھی کوششیں کیں لیکن انھیں کئی سال تک کامیابی نہ ہوئی۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کی سرپرستی نہ کی جبکہ اکبر شاہ کے ولی عہد نے ایک اور شاعر، ذوق، کو اپنا استاد چنا۔

Scanned with CamScanner

آخر کار 1850 میں، نئے بادشاہ کے وزیر اور بادشاہ کے روحانی مرشد کی کوششوں سے غالب کو مغل دربار میں بار ملا۔ بہادر شاہ ثانی، متخلص بہ ظفر، نے انھیں خلعت اور کئی بلند بانگ خطابات مرحمت کیے — نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ — اور ان سے چھ سو روپے سالانہ مشاہرے کے عوض خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ درحقیقت اس میں غالب کا کام محض قدیم واقعہ نگاروں کے بیانات کو، جنھیں بادشاہ کے وزیر نے پرانے کاغذوں میں سے برآمد کیا تھا، مرصع فارسی نثر میں لکھنا تھا۔ 1854 میں غالب کو ولی عہد نے چار سو روپے سالانہ تنخواہ پر اپنا استاد مقرر کیا۔ اسی سال، ذوق کا انتقال ہونے پر، غالب کو بادشاہ کے استاد کا درجہ بھی مل گیا، لیکن اس سے ان کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ انھیں لکھنؤ کے حکمران واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدے لکھ کر بھجوانے کے عوض وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ وظیفہ ملنے لگا۔ یہاں چند ایسے واقعات پر نظر ڈالنا کارآمد ہوگا جن سے غالب اور ان کے مربی بادشاہوں کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

1851 میں بادشاہ کی چہیتی بیوی نے غالب سے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی پر سہرا کہنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے اپنے سہرے کا اختتام اس تعلّی آمیز بیان پر کیا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بادشاہ نے اس تعلّی کو نظر انداز کر دینے کے بجائے اپنے استاد سے اس کے جواب میں سہرا لکھنے کو کہا۔ ذوق نے اپنے سہرے کا خاتمہ اس شعر پر کیا:

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

جب غالب کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا تو انھوں نے عذرخواہی میں ایک نظم لکھی جس میں بہرحال ایسے اشعار بھی شامل تھے:

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

Scanned with CamScanner

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے [32]

ان شعروں اوران جیسے دوسرے شعروں میں چھپے نشتر یا تو بادشاہ کی نظر میں نہ آ سکے یا اس نے محض سطح پر موجود انکسار کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ نہ صرف غالب کی نوکری قائم رہی بلکہ ذوق کے انتقال پر ان کا عہدہ بھی مل گیا۔

تاہم بادشاہ اور غالب ایک دوسرے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا اور وہ بادشاہ کی مدح میں بھی اردو سے زیادہ فارسی سے کام لیتے تھے، جبکہ بادشاہ اردو شاعری کا شوقین تھا اور اس میں بھی ایسے اسلوب کا جو غالب کے اسلوب سے قطعی مختلف تھا۔ غالب بادشاہ کے شعروں پر نیم دلی سے اصلاح کرتے اور خود انھیں بھی بہادر شاہ ظفر سے داد ملی تو شاعری پر نہیں بلکہ پڑھنے کے انداز پر۔ [33] لیکن ان دونوں کا ساتھ ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ غالب اپنے عہد کے عمدہ ترین شاعر اور بہادر شاہ، برائے نام ہی سہی، بادشاہ تھا۔ مغل دربار میں غالب کے منصب کا تقاضا تھا کہ وہ قریب قریب ہر روز مقررہ وقت بادشاہ کے ساتھ گزاریں۔ ان صحبتوں میں بذلہ سنجی اور فی البدیہہ شاعری کے موقعے نکلتے رہتے تھے جن سے آقا کی طبیعت خوش ہوتی تھی۔ ان سے خاص تقریبات مثلاً بادشاہ کی سالگرہ یا عید بقرعید پر موقعے کے مناسب نظمیں کہنے کی بھی توقع کی جاتی تھی۔ اس توقع میں ایک چالاکی بھی پنہاں تھی: اگر غالب اشعار نذر نہ کر سکتے تو انھیں بادشاہ کو نقد کی صورت میں نذر پیش کرنی پڑتی۔ غالب بیشتر موقعوں پر اپنی رقم اور توانائی بچانے کی غرض سے کوئی مختصر سی نظم کہہ کر لے جاتے جو بعض اوقات محض دو چار شعروں پر مشتمل ہوتی، اور کم از کم ایک موقعے پر انھیں اس سلسلے میں بادشاہ کے وزیر کی سرزنش بھی سننی پڑی۔ [34]

ایک اور موقعے پر جب لکھنؤ سے یہ افواہ دہلی پہنچی کہ بہادر شاہ نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے، تو غالب سے اس افواہ کی تردید میں ایک نظم لکھنے کو کہا گیا۔ غالب اگرچہ خود شیعہ تھے، انھیں شاہی حکم کی تعمیل میں فارسی میں ایک مختصر نظم لکھنی پڑی جس کا راوی انھوں نے خود بادشاہ کو بنایا۔ بعد میں، غالب کے سوانح نگار کے مطابق، انھوں نے اپنے اس عمل کی وضاحت لکھنؤ کے ایک شیعہ بزرگ سے اس طرح کی: ''میں ملازمِ شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس

Scanned with CamScanner

مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔"[35]

قصیدہ نگاری کے سلسلے میں بھی، جو انھیں معلوم تھا کہ وابستۂ دولت شاعر کے طور پر ان کا ناگزیر فریضہ ہے، غالب کا رویہ ایسا ہی بے پروایانہ تھا۔ اس کا پتا ایک معنی خیز واقعے سے چلتا ہے جس کا تعلق اودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ سے تھا۔ غالب نے اسے اپنے ایک اور خط میں یوں بیان کیا ہے:

> جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا، یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گذرا نہ تھا، میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا؟ اس قصیدے سے مجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔[36]

لیکن 1857 کے واقعات نے ان مربیانہ تعلقات کا خاتمہ کر دیا۔ غالب کا اب صرف ایک باقاعدہ مربی رہ گیا، نواب رامپور، جس نے غالب کو اسی سال اپنا استاد مقرر کیا تھا۔ نواب اور اس کے جانشین نے غالب سے احترام کا سلوک کیا اور ان کے مرنے تک ان کی خاصی مدد کرتے رہے۔ البتہ 1857 سے پہلے اور بعد میں دوسرے ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں سے سرپرستی حاصل کرنے کی غالب کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔

میر اور غالب دونوں کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جو اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اس بنا پر اپنے ہندوستانی مربیوں سے احترام کی توقع بھی کرتے تھے اور پاتے بھی تھے۔ اور جب کبھی کوئی ایسا موقع آتا جب انھیں اپنے وقار کو خطرہ محسوس ہوتا تو وہ فوری ردعمل کرتے تھے۔ انھوں نے تعلیم گھر پر پائی تھی اور جب اپنے اندر شاعری کی صلاحیت دیکھی تو اسے اُجالنے کی پوری کوشش کی، میر نے مختصر عرصے کے لیے ایک استاد کی مدد سے اور غالب نے صرف اپنے بل پر۔ ہم نہیں جانتے کہ ان دونوں نے خود کو شاعری کے پیشے کے لیے تیار کرنے کی غرض سے وہی طریقہ اختیار کیا جو نظامی عروضی

Scanned with CamScanner

نے تجویز کیا تھا، یعنی قدیم شاعروں کے بیس ہزار اور جدید شاعروں کے دس ہزار اشعار زبانی یاد کرنا، 37 لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے نزدیک شاعر ہونا ایک مسلمہ پیشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کی خدمت کرنے کو تیار تھے اور وہ فرائض بھی ادا کرنے کو تیار تھے جنھیں ادا کرنے کی ان سے روایتی طور پر توقع کی جاتی تھی۔ انھوں نے مصاحبی کی، رازداری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، مبارکبادی کی نظمیں کہیں، استاد کے فرائض انجام دیے، یہاں تک کہ اپنے مربی کے نام سے شعر بھی کہے اور اپنی تحریروں کو ان کے دفاع کے لیے بھی استعمال کیا۔ اور ان میں سے ہر موقعے پر ان کا مربی کوئی کارپوریٹ ادارہ نہیں بلکہ ایک فرد ہوتا تھا جو شاعروں کی صحبت سے محظوظ ہوتا اور اس صحبت اور ان کی شاعری پر، اور کسی رقیب کے دربار کے بجائے اپنے دربار سے ان کی وابستگی پر، خوشی اور فخر محسوس کرتا تھا۔ ان شاعروں اور ان کے مربیوں کے درمیان کئی روایات قائم تھیں جن میں ایک دوسرے کی جانب عیاں یا پنہاں ذمے داریاں بھی شامل تھیں۔ احترام احترام کو اور وفاداری وفاداری کو جنم دیتی تھی۔ جس طرح مربی شاعر کی مادّی بہبود کا خیال رکھتا تھا اسی طرح شاعر اپنے مربی کی مفروضہ کامیابی اور خوشحالی کے احساس میں اضافہ کرتا تھا؛ اس میں ایک مخصوص فرد کا دوسرے مخصوص فرد سے تعلق قائم ہوتا تھا خواہ کتنا ہی سطحی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔

لیکن جوں جوں انگریز اقتدار اور سرپرستی کے منصبوں پر فائز ہوتے گئے، یہ صورت حال رفتہ رفتہ لیکن بہت بنیادی طور پر تبدیل ہوتی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں میں بلاشبہ ایسے افراد موجود تھے جو اردو اور فارسی شاعری کے دلدادہ تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے، لیکن ان کو ان تمام خدمات کی ضرورت نہ تھی جو یہ شاعر مہیا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جو شے ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان رشتے کا تعین کرتی تھی وہ کمپنی یا تاجِ برطانیہ کا مفاد تھا۔ چنانچہ وہ ایسی بہت سی اقدار کو جو ہندوستانیوں کے نزدیک قیمتی اور پسندیدہ تھیں، کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد نے میر کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے:

> گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالیشان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدردانی سے بااس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علوے حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے، میر صاحب کو ملاقات کے لیے بلاتے، مگر یہ پہلوتہی کرتے اور کہتے کہ ”مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا

Scanned with CamScanner

مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل۔"38

میر کی یہ بات اس امر کی روشنی میں کسی قدر غیر منصفانہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی کلیات کا پہلا —اور شاندار— ایڈیشن کلکتہ کے کالج آف فورٹ ولیم کے زیر اہتمام ان کی وفات کے چند ماہ بعد، 1811 میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کی بات کے پیچھے جو وسیع تر سچائی ہے وہ قائم رہتی ہے اگر ہم یہ حقیقت ذہن میں رکھیں کہ اس اشاعت کا مقصد شاعر کو عزت دینا نہیں بلکہ کالج کے لیے تدریسی مواد فراہم کرنا تھا۔

غالب خود کو فخر سے انگریزی سرکار کا نمکخوار کہا کرتے تھے۔ لیکن پیٹر ہارڈی کے عمدہ تبصرے کے مطابق "انھوں نے جو نمک کھایا اس سے نہ ان کا گلا بند ہوا اور نہ ہر انگریزی چیز ان کے لیے قابل قبول ٹھہری۔"39 غالب خود کو جتنا شاعر خیال کرتے تھے اتنا ہی 'ہندوستان کے فطری اشراف' میں شامل بھی سمجھتے تھے۔ دونوں حیثیتوں سے وہ مناسب سرپرستی کی توقع رکھتے تھے، اگرچہ شاعر اور شریف زادے کے طور پر الگ الگ مربیوں سے۔ انھیں انگریزوں سے اپنے چچا کی پنشن میں حصہ ملتا رہا اور انھوں نے بہت سا وقت اور کوشش زندگی بھر پہلے اس پنشن میں اضافے اور، 1857 کے بعد، اس کی بحالی کے سلسلے میں صرف کی۔ اس کوشش کے دوران ان کی ملاقات دہلی میں اور کلکتہ میں بھی، جہاں انھوں نے اسی سلسلے میں دو سال گزارے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے افسروں سے ہوئی۔ انھوں نے بہت سے انگریزوں کی مدح میں قصیدے کہے جن سے وہ اپنے مقدمے میں مدد کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے 1836 اور 1869 کے درمیان دہلی کے دورے پر آنے والی کئی ممتاز انگریز شخصیتوں اور گورنر جنرل اور وائسرائے کے عہدوں پر فائز ہونے والوں کے لیے خیر مقدمی نظمیں بھی کہیں۔ ان کے نزدیک یہی مناسب بات تھی: یہ لوگ 'سردار' تھے اور وہ ان کے نمک خوار۔ اگر انھوں نے اپنے مغل مربی کی خاطر عید کے موقعے کی نظمیں کہیں تو دسمبر 1837 میں کرسمس کے موقعے کا قصیدہ لارڈ آکلینڈ کے لیے بھی کہا۔ اگرچہ انھیں شاعر کے طور پر انگریزوں کی جانب سے تسلیم نہیں کیا گیا، پھر بھی جو واحد ہنر ان کے پاس تھا اس سے، اور انکسار کے تمام موزوں روایتی

اظہاروں سے کام لے کر انھوں نے ان کی خدمت کی۔ لیکن 1842 میں جب انھیں دہلی کالج کی ملازمت کی پیشکش ہوئی تو انھوں نے وہ احترام حاصل کرنے پر اصرار کیا جو ان کے نزدیک ان کا معاشرتی حق تھا۔ کالج میں فارسی کے معلم کی جگہ خالی تھی اور حکومت ہند کے سیکرٹری مسٹر ٹامسن کو — جو اتفاق سے غالب کے اچھے واقفکار بھی تھے — دہلی کے کئی اہل علم لوگوں کا انٹرویو لینا تھا۔ غالب کو سب سے پہلے طلب کیا گیا اور وہ سیکرٹری کے کیمپ میں پالکی میں سوار ہو کر پہنچے۔

> صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسبِ دستور قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ اُدھر سے آئے نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے پھر جا کر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں، نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ 41

غالب کو اس کا اندازہ نہ تھا، مگر تب تک ہندوستان کے حاکموں کے ادبی مذاق میں بھی ایک گہری تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ نے 1850 کی دہائی میں انھیں اس کام پر مقرر کیا تھا کہ واقعہ نویسوں کے قدیم بیانوں کو مرصع فارسی زبان میں تحریر کریں، جبکہ انگریزوں نے 1800 میں اوسط درجے کے ادیبوں کو فورٹ ولیم کالج میں یہ کام سونپا کہ فارسی کی کئی مقبول کتابوں کو سادہ اردو زبان میں منتقل کریں۔

غالب اپنی زندگی کے آخری دور سے پہلے انگریزوں سے شاعر کے طور پر اپنی حیثیت تسلیم کیے جانے کے متقاضی نہ ہوے۔ البتہ 1855 میں انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کا جو پہلا قصیدہ لکھا اس میں یہ تقاضا مضمر تھا لیکن اسے صاف درخواست کے طور پر بیان نہ کیا گیا تھا۔ لیکن 1857 کے واقعات پر مبنی اپنی کتاب دستنبو میں — جو بغاوت کے دوران لکھی گئی — اور 1860 میں لارڈ کیننگ کی

Scanned with CamScanner

مدح میں کہے گئے قصیدے میں انھوں نے خود کو اعلیٰ درجے کا شاعر تسلیم کیے جانے کی صاف لفظوں میں درخواست کی۔ ''بازنطین اور ایران کے بادشاہوں کا قاعدہ تھا،'' انھوں نے لکھا، ''کہ اپنے شاعروں اور قصیدہ گویوں کو طرح طرح سے نوازتے تھے۔ ان کا منہ موتیوں سے بھر دیتے، انھیں سونے میں تلوا دیتے یا گاؤں کے گاؤں یا خزانے انھیں انعام میں دے دیتے۔''[42]

اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ غالب کی یہ درخواست منظور ہوئی ہو یا اس پر سنجیدگی سے غور بھی کیا گیا ہو، اگرچہ غالب نے اشتباہ کو رفع کرنے کی غرض سے ان قدیم اور مبہم فارسی لفظوں کے عام فہم متبادل بھی لکھ دیے تھے۔ اس صورت حال میں خاصی ستم ظریفی پائی جاتی ہے، کیونکہ غالب اپنی جس شے پر فخر کرتے تھے، یعنی فارسی لکھنے کی غیر معمولی دستگاہ، وہ انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں بے فائدہ پیش کی — انھوں نے نفیس فارسی میں ان کے قصیدے کہے اور 1857 کے واقعات کے بارے میں خاص انگریزوں کے مطالعے کے لیے اپنی کتاب، عربی لفظوں سے یکسر احتراز کرتے ہوئے، خالص ترین فارسی میں تحریر کی۔ جبکہ اسی وقت وہ اپنے خطوں میں بے مثل اور شاندار اردو نثر تخلیق کر رہے تھے، جو ٹھیک وہی چیز تھی جو انگریز حاکموں کو درکار تھی مگر جس کا انھیں غالب کی وفات کے بہت بعد علم ہوا۔ ان خطوں کا پہلا مجموعہ اکتوبر 1868 میں شائع ہوا؛ غالب نے 15 فروری 1869 کو وفات پائی۔

غالب کے اردو خط شائع ہونے سے دو مہینے پہلے الٰہ آباد گورنمنٹ گزٹ میں ایک اعلان شائع ہوا: نوٹیفکیشن نمبر 791A، مورخہ 20 اگست 1868۔[43] اس کا پہلا پیراگراف یہ تھا:

> ہرگاہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ صوبجات شمالی و مغربی کی زبان میں تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے لیے عزت مآب جناب لیفٹیننٹ گورنر صاحب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انعامات دیے جائیں گے ورناکیولر میں مفید کتابوں کی تیاری پر، جو منظور شدہ انداز و اسلوب کی ہوں اور جن کا تعلق سائنس یا لٹریچر کی کسی بھی صنف سے ہو۔[44]

ان اعلان کردہ انعامات میں سب سے بڑا ایک ہزار روپے کا تھا اور کہا گیا تھا کہ لیفٹیننٹ گورنر، سر ولیم میور، ''ہر سال اس طرح کے کم از کم پانچ انعامات دے سکتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

یہ بات غیر اغلب ہے کہ غالب نے یہ اعلان دیکھا یا اس کی بابت سنا ہو۔ لیکن اگر انھیں اس کا علم ہو بھی جاتا تو یہ بات مشتبہ ہے کہ انھوں نے اپنے خطوں کے مجموعے کو اس انعام کا ممکنہ مستحق سمجھا ہوتا۔ کیونکہ اعلان کا ایک کلیدی لفظ ''مفید'' تھا۔ ''مفید ادب کیا ہوتا ہے؟'' غالب نے سوال کیا ہوتا۔ یا بلکہ یہ کہ ''وہ کون سا ادب ہے جو غیر مفید ہو؟'' اور اگر بالفرض انھوں نے یہ اعلان دیکھ بھی لیا ہوتا اور اپنی کتاب اس کے لیے داخل بھی کردی ہوتی تو شادی اور معاشقوں کے بارے میں ان کے تمسخر آمیز تبصروں کے باعث ان کی کتاب یقیناً غیر موزوں قرار پاتی، کیونکہ اعلان میں درج تھا کہ ''ایسی کتاب جس میں اخلاقیات کے خلاف کوئی بات ہو'' قطعی طور پر قبول نہیں کی جائے گی۔ اور بھی زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ غالب اس اعلان کی ایک اور شق کو پڑھ کر ناراض نہیں تو دم بخود ضرور ہو جاتے، کہ ''ہندوستانی خواتین کے لیے مناسب کتابیں خاص طور پر قبولیت اور انعام کے لائق سمجھی جائیں گی۔'' عورتوں کے لیے خاص کتابیں؟ وہ پُرشفقت لہجے میں تبصرہ کرتے کہ دیکھیے، صاحب لوگوں کا تخیل اس کے بعد کیا سامنے لاتا ہے!

تاہم اس مختصر اشتہار نے نئے حاکموں کی ادبی اقدار کو پوری طرح واضح کر دیا: کوئی ادب اسی وقت سرپرستی کے لائق ہوگا جب وہ کسی فردی تسکین کے بجائے معاشرتی بہبود کا باعث ہو۔ اس سے یہ پتا بھی چلا کہ ادب کی درجہ بندی اب نئے طریقوں سے کی جائے گی: اخلاقی ادب، غیر اخلاقی ادب، بالغوں کا ادب، بچوں کا ادب، عورتوں کا ادب۔ اس اشتہار کا جدید اردو ادب کے ارتقا پر عموماً اور اردو کے نثری فکشن کے ارتقا پر خاص کر بہت نمایاں اثر ہوا۔ اس نے نذیر احمد کے قلم کو تحریک دی جن کے ناولوں نے اصلاحی تحریروں کی ایک طویل فہرست کے لیے نمونے کا کام کیا۔ اس کے علاوہ اس وجہ سے کہ ان ناولوں کو اردو بولنے والے اسکولی بچوں کی آنے والی کئی نسلوں کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا تھا، انھوں نے بہت سے ایسے دوررس نتائج پیدا کیے جن کی تفصیل میں جانا اس موقعے پر ممکن نہیں۔ [45] نئے مربیوں کو نہ صرف بعض خاص خیالات کو انعامات کے ذریعے بڑھاوا دینے اور بعض دوسرے خیالات کو نظر انداز کر دینے کا اختیار حاصل تھا بلکہ انھیں یہ غیر معمولی طاقت بھی حاصل تھی کہ اپنے وضع کیے ہوئے تعلیمی نظام کے ذریعے سے منظور شدہ خیالات کو دور دور تک پھیلا سکیں، اور یہ تعلیمی نظام رفتہ رفتہ معاشی فوائد اور معاشرتی مقام حاصل کرنے کا بنیادی ذریعہ بن گیا۔

Scanned with CamScanner

اگر چہ اس گزٹ نوٹیفکیشن میں یہ بیان شامل تھا کہ ''ایسی کتاب... نثر میں بھی ہو سکتی ہے اور نظم میں بھی،'' ایسی کسی انعام یافتہ کتاب کا پتا نہیں چلتا جو نظموں پر مشتمل ہو۔ شاعری (خواہ فارسی کی ہو یا اردو کی) روایتی طور پر اعلیٰ تخیل کا اظہار اور دانائی اور لطف کا منبع تصور کی جاتی تھی، لیکن نئے مربیوں کی نظر میں وہ اپنے قبل از جدید ورثے سے ضرورت سے زیادہ بندھی ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ اعلان کردہ مقاصد کے لیے کچھ خاص کارآمد نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود یہ لوگ اس پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ''شاعری بڑی تعلیمی قدر و قیمت رکھتی ہے۔'' یہ گتھی چند سال بعد مئی 1874 کو لاہور میں سلجھی جہاں نظامت تعلیم عامہ کے زیر اہتمام ایک خاص اجلاس منعقد کیا گیا جس میں انگریز اہلکار اور ہندوستانی شرفا بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اجلاس کے پہلے مقرر محمد حسین آزاد تھے جن کی کتاب آبِ حیات کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔

محمد حسین آزاد (پ 1830) ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے جنھوں نے اور کاموں کے علاوہ کچھ عرصہ دہلی کالج میں پڑھایا بھی تھا اور 1836 میں دہلی کا پہلا اردو اخبار بھی جاری کیا تھا۔ مولوی محمد باقر شاعر ذوق کے بہت قریبی دوست بھی تھے جنھیں آزاد نے ہمیشہ اپنا استاد مانا۔ آزاد نے دہلی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کے اخبار میں کام شروع کیا جو اس وقت تک جاری رہا جب انگریزوں کے 1857 کی بغاوت کے بعد مولانا محمد باقر کو سزائے موت دے دی۔ تب آزاد دہلی سے فرار ہو کر پہلے لکھنؤ اور پھر پنجاب چلے گئے جہاں کئی چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد انھیں لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ رفتہ رفتہ ان کی صلاحیت اور تعلیمی قابلیت کو تسلیم کیا جانے لگا اور 1874 کے اس عام اجلاس کے وقت آزاد گورنمنٹ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو چکے تھے۔

آزاد نے، جو اس موقعے سے پہلے بھی اردو کی مقبول عام شاعری کی بابت اپنی ناگواری کا اظہار کر چکے تھے، اس اجلاس میں اپنے ہم وطنوں سے التجا کی: ''اے انگریزی کے سرمایہ دارو، تم اپنے ملک کی نظم کو ایک ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمھیں افسوس نہیں آتا۔ تمھارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمھیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانے اور نئے توشہ خانے سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ

Scanned with CamScanner

وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اس کا ادا کرنا واجب ہے۔"47 اپنی تقریر کے آخر میں آزاد نے، جو ایک متحرک شخصیت تھے، اپنی بات کی مثال کے طور پر اپنی مختصر نظم "رات" پڑھ کر سنائی۔

ان کے بعد کرنل ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ (Col. W. R. M. Holroyd)، ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم پنجاب کی باری آئی۔ "یہ اجلاس اس لیے منعقد کیا گیا ہے،" کرنل ہالرائیڈ نے کہا، "کہ اردو شاعری کی ترقی کے ذرائع تلاش کیے جائیں جو آج زوال کی حالت میں ہے۔ اس مقصد سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ شرفا، دانشور اور شاعری اور دیگر ادبی اصناف سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس جانب توجہ مرکوز کریں... "48 اس کے بعد کرنل نے ایک خط پڑھ کر سنایا جو سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے موصول ہوا تھا: "عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر ایک اور چیز تجویز کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جس کا اس [نصابی کتابوں کی] کمیٹی نے کوئی ذکر نہیں کیا اور جو اعلیٰ حضرت کی رائے میں محکمۂ تعلیم کے افسروں کی توجہ کے لائق ہے۔... اردو تدریس کی جو کتابیں اس وقت استعمال میں ہیں یا جن نئی کتابوں کی کمیٹی نے سفارش کی ہے، ان میں شاعری شامل نہیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ شاعری بڑی تعلیمی قدر و قیمت رکھتی ہے۔... اس کے پیش نظر مجھے یہ دریافت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ کیا ہمارے ثانوی اور ہائی اسکولوں کے نصاب میں اردو شاعری کا ایک ایسا انتخاب شامل کیا جا سکتا ہے جس کا مقصد اخلاقی تعلیم دینا اور ہمارے احساسات اور خیالات کی فطری تصویر پیش کرنا ہو۔ ...اگر... گورنمنٹ اسکولوں کی مدد سے غیر فرقہ وارانہ نوعیت کی مقامی شاعری لکھی جائے جو رفتہ رفتہ اس شاعری کی جگہ لے لے جو اس وقت رائج ہے، تو یہ یقیناً آگے کی جانب ایک اہم قدم ہوگا۔"49

اس کے بعد ڈائرکٹر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے اجلاس کے ممتاز شرکا کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ "ایک نئے انداز کے مشاعرے کی بنا ڈالیں جس میں مصرعِ طرح کے بجائے ایک موضوع دیا جائے جس پر شاعر نظمیں لکھیں اور انھیں عام اجلاسوں میں پڑھا جایا کرے۔... اگر یہ تجویز کامیاب رہی تو 1874 کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی اور لوگ ان شاعروں کو یاد رکھیں گے جن کی کوششوں کے نتیجے میں شاعری زوال سے نکل کر کمال کے درجے تک پہنچی۔ میری تجویز ہے کہ ایسے اجلاس ہر مہینے منعقد ہوا کریں اور اگلے مہینے کے اجلاس کے لیے شاعر برسات کی مدح میں نظمیں لکھیں۔"50

نیک دل کرنل نے بعد میں آزاد کی تقریر اور نظم کی نقلیں محکمۂ تعلیم کے وسائل استعمال کرتے ہوئے پورے ملک میں تقسیم کرائیں۔ اس نے بہترین نظموں کے لیے انعامات کا بھی اعلان کیا۔ اس طرح اردو میں نئی شاعری کا دور شروع ہوا جب برسات، جاڑا، امید، حب وطن، امن اور انصاف جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ یہ ماہانہ اجلاس خاصی باقاعدگی سے ایک سال تک منعقد ہوتے رہے اور بعض شاعروں کو معمولی انعامات بھی دیے گئے۔ اس کے بعد محکمۂ تعلیم کی دلچسپی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد انگریزوں کی جانب سے اردو شاعری کی سرپرستی کا دوسری جنگ عظیم کے زمانے تک کوئی سراغ نہیں ملتا، جب محکمۂ پبلسٹی نے بہت سے شاعروں کو معاوضے پر رکھا۔ لیکن یہ الگ قصہ ہے۔

تاہم خلوص پر مبنی اور کسی قدر تدریسی نوعیت کی شاعری کی جانب یہ رجحان جاری رہا۔ [51] اسے سرسید احمد خاں کی بھی تائید حاصل ہوئی جنھوں نے آزاد کی حمایت میں ایک مضمون لکھا، اور الطاف حسین حالی کی صورت میں ایک نمایاں عملی کارکن بھی دستیاب ہوا جنھیں لاہور کے درسی کتابوں کے دفتر میں ملازمت ملی اور جنھوں نے چند ماہانہ مشاعروں میں شرکت بھی کی۔ جس طرح نذیر احمد نے اپنے ایک انعام یافتہ ناول میں اردو ادب کے بیشتر موجودہ ذخیرے کو — جو ان کے خیال میں غیر اخلاقی اور زوال آمادہ تھا — نذرِ آتش کر دیا تھا، اسی طرح حالی نے 1879 میں شائع ہونے والی اپنی مسدس مدوجزرِ اسلام میں اسے ''عفونت میں سنڈاس سے بدتر'' قرار دیا۔ [52] حالی ہی نے آگے چل کر اردو میں ادبی تنقید کی پہلی کتاب لکھی جس میں اردو کی پوری شاعری کا جائزہ لے کر اسے مفید اخلاقی، سچے، حقیقت پسند اور خلوص پر مبنی مضامین اور خیالات سے عاری پایا۔ [53] ہندوستان کے نئے حاکموں نے جن تعلیمی اداروں کو جاری کیا، بڑھایا اور چلایا، ان کے اثر سے اردو بولنے والے طالبعلموں کی کئی نسلوں کے ذہنوں میں یہ خیالات اور رویے راسخ ہو گئے۔ اردو کے کلاسیکی ورثے کو اس کے اصل ادبی رنگ میں دیکھا جانا بہت سالوں بعد ہی ممکن ہو سکا۔ یہ اسی سرپرستی کا اثر تھا جو انفرادی تسکین کے بجائے اجتماعی بہبود کو اہمیت دینے کا بھی دعویٰ رکھتی تھی اور جس کے پاس وہ وسائل بھی تھے کہ اپنی ترجیحات کو اس پیمانے پر پھیلا سکے جو کسی مغل اعظم سے بھی ممکن نہ ہوا تھا۔

❀❀

Scanned with CamScanner

حواشی

1 کیکاؤس ابن سکندر، قابوس نامہ، مرتبہ امین عبدالمجید بدوی، تہران، 1963۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے، A Mirror for Princes، ترجمہ ریوبن لیوی، لندن، 1951۔

2 کیکاؤس بن اسکندر، قابوس نامہ، ص 173۔

3 ایضاً۔

4 نظامی عروضی سمرقندی، چہار مقالہ، انگریزی ترجمہ: ایڈورڈ جی براؤن، ای جے ڈبلیو میموریل اولڈ سیریز XI.2، لندن، 1978، ری پرنٹ۔

5 ایضاً، ص 21۔ ملحوظ رہے کہ جہاں تک قابوس نامہ میں ابواب کی ترتیب سے ظاہر ہوتا ہے، ان پیشوں کا حفظِ مراتب یہ ہے: تجارت، طب، ستارہ شناسی، شاعری، موسیقی، درباداری، مصاحبی، دبیری۔ لیکن اس ترتیب کو اس سے الٹ، یعنی بڑھتی ہوئی اہمیت کے اعتبار سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، کیونکہ اگلے تین ابواب بالترتیب وزارت، سپہ سالاری اور بادشاہت کے بارے میں ہیں۔ تاہم، اس سے اگلے دو باب کاشتکاری اور تصوف کے موضوع پر ہیں! نیچے حاشیہ 12 بھی دیکھیے۔

6 ایضاً، ص 45۔

7 ایضاً، ص 51۔

8 ایضاً، ص 58۔

9 ایضاً، ص 7-76۔

10 قابوس نامہ، ص 173۔

11 بحوالہ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، اعظم گڑھ، 1972، ری پرنٹ، ص 50-249۔

12 ابوالفضل علامی، آئینِ اکبری، انگریزی ترجمہ ایچ بلوکمین، دوسرا ایڈیشن، نظرثانی ڈی سی فلٹ، کلکتہ، 1939، ص 617، ff.۔ ابوالفضل نے دنیا کے لوگوں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے: جنگجو، کاریگر اور تاجر، اہل علم اور کاشتکار۔ چار زمروں کی یہی تقسیم شاہی دربار میں بھی پائی جاتی ہے: امرا، محصول جمع کرنے اور تنخواہیں ادا کرنے والے، اہلِ علم مصاحبین، اور خدام۔ ابوالفضل کے مطابق شاعر تیسرے زمرے میں آتے ہیں، اور اس زمرے میں اول مقام فلسفیوں کا ہے (یعنی غالباً خود ابوالفضل کا)۔ شاعر طبیبوں اور ستارہ شناسوں کے بعد لیکن کاہنوں سے پہلے آتے ہیں۔

13 ایضاً، ص 18-617۔

14 ابوالفضل علامی، آئینِ اکبری، جلد سوم، ترجمہ ایچ ایس جیریٹ، نظرثانی جادوناتھ سرکار، کلکتہ، 1948،

Scanned with CamScanner

ص 432۔ بعد کے دو اقتباسات بھی دیکھیے۔

15 شبلی نعمانی شعر العجم، اعظم گڑھ، 1956، ری پرنٹ، جلد سوم، ص 188۔

16 ایضاً، متعدد مقامات۔ مزید دیکھیے، عزیز احمد، 'Safawid Poets and India'، مشمولہ *Iran*، XIV، 1976، ص 32-117۔

17 تنویر احمد علوی، ذوق: سوانح اور انتقاد، لاہور، 1963، ص 9-65۔ مجھے علوی کے اس خیال کو تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ خطاب ملک الشعرا کے مساوی تھا۔

18 خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، علی گڑھ، 1966، ص 90-86۔

19 محمد حسین آزاد، آب حیات، لاہور، 1917، ری پرنٹ، ص 2-352۔

20 محمد تقی میر، ذکرِ میر، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، 1928۔ انگریزی ترجمہ: سی ایم نعیم، *Zikr-i Mir: The Autobiography of the Eighteenth Century Mughal Poet: Mir Muhammad Taqi 'Mir'*، نئی دہلی، 1999۔ ذیل کے تمام حوالے اسی انگریزی ترجمے کے ہیں۔

21 سی ایم نعیم، ذکرِ میر، ص 72۔ غالب کو بھی، جن کا ذکر آگے آتا ہے، موسیقی کا شوق تھا اور انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایک بار اپنی ایک غزل ایک گویے کو یاد کرائی تھی۔ دیکھیے باغ دودر، مرتبہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، 1968، دوسرا ایڈیشن، ص 225 (حواشی)۔ البتہ غالب نے ایسا اپنی خوشی سے کیا تھا نہ کہ کسی مربی کے کہنے پر۔

22 نعیم، ذکرِ میر، ص 76۔

23 ایضاً، ص 107۔

24 ایضاً، ص 116۔

25 ایضاً، ص 19-118۔

26 محمد تقی میر، کلیاتِ میر، کانپور، ، پانچواں ری پرنٹ، ص 563۔ یہ دو شعر مقطعے کے بعد آتے ہیں، جو غالباً اس نظم کا اصل اختتام رہا ہوگا۔

27 آزاد، آبِ حیات، ص 7-206۔

28 مرزا علی لطف، تذکرہ گلشنِ ہند (1801)، مرتبہ عطا کاکوی، پٹنہ، 1972، ص 8-77۔

29 غالب سے متعلق کتابیات خاصی وسیع ہے۔ سوانحی تفصیلات کے لیے انگریزی کے دو بہترین ذرائع ہیں: رالف رسل اور خورشید الاسلام، *Ghalib: Life and Letters*، لندن، اور رالف رسل

Scanned with CamScanner

(مرتب)، Ghalib: The Poet and His Age، لندن، 1972۔

30 غالب، دستنبو، مشمولہ اردوئے معلی (غالب نمبر، حصہ دوم، فروری 1961)، مدیر خواجہ احمد فاروقی، ص 131۔

31 ایس اے آئی ترمذی (مرتب)، Persian Letters of Ghalib، نئی دہلی: غالب اکیڈمی، 1969، ص 13۔

32 سرپرستی اور شہرت کے سلسلے میں رقابت کے اس معاملے اور دوسرے معاملوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے محمد یعقوب امیر، اردو کے ادبی معرکے، نئی دہلی، 1982۔

33 الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، اردو حصہ، مرتبہ مالک رام، نئی دہلی، 1971، ص 102۔

34 غالب کے اپنے الفاظ، بحوالہ قصائد و مثنویاتِ فارسی، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، 1969، حصہ مثنویات کا ص 60۔

35 حالی، یادگارِ غالب، ص 89۔ (خط بنام یوسف مرزا، 28 نومبر 1859)

36 رسل اور خورشید الاسلام، Ghalib: Life and Letters، ص 222۔

37 چہار مقالہ، ص 50-49۔

38 آزاد، آبِ حیات، ص 221۔

39 پیٹر ہارڈی، 'Ghalib and the British,' مشمولہ Ghalib: The Poet and His Age، ص 63۔

40 قصائد و مثنویاتِ فارسی میں اس قسم کے انیس فارسی قصیدے شامل ہیں، جن میں ہم کوئی درجن بھر مختصر فارسی اور اردو نظمیں بھی شامل کر سکتے ہیں جو اسی نوع کی ہیں۔ اگرچہ غالب اپنے مخالفوں کی مذمت عموماً خاصے تیز لہجے میں کرتے ہیں، لیکن اس قسم کے جو فقط تین شعر انھوں نے ایک انگریز شخص (فرانسس ہاکنز، ریزیڈنٹ دہلی) کی نکتہ چینی میں لکھے ان میں وہ بہت محتاط معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ اس شخص نے ان کا پنشن کا کیس عملاً تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ دیکھیے غالب، قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، 1969، ص 19۔

41 رسل اور خورشید الاسلام، Ghalib: Life and Letters، ص 63۔

42 غالب، دستنبو، ص 150۔

43 دیکھیے میرا مضمون ''نذیر احمد کا انعامی ادب''، مشمولہ سہ ماہی آج، کراچی، شمارہ 26، سرما/بہار 1994۔

44 ایضاً، ص 3-292۔

Scanned with CamScanner

45 دیکھیے میرا مضمون جس کا حوالہ اوپر حاشیہ 43 میں دیا گیا ہے۔

46 آزاد سے متعلق معلومات بڑی حد تک دو ذرائع سے حاصل کی گئی ہے: محمد صادق، *Muhammad Husain Azad: His Life and Works*، لاہور، 1965، اور اسلم فرخی، محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، کراچی، 1965۔

47 محمد حسین آزاد، ''نظم میں انقلاب''، مشمولہ مقالات محمد حسین آزاد (جلد اول)، لاہور، مجلس ترقی ادب، سنہ ندارد، ص 450۔ بحوالہ فرخی، محمد حسین آزاد، ص 234۔

48 محمد صادق، *Muhammad Husain Azad*، ص 2-31۔

49 ایضاً۔

50 ایضاً۔

51 ان معاملات پر معنی خیز اور مفصل بحث کے لیے دیکھیے فرانسس پریچٹ، *Nets of Awareness: Urdu Poetry and Its Critics*، برکلے، 1994۔

52 حالی کی مسدس کے مکمل انگریزی ترجمے اور قابل قدر تجزیے کے لیے دیکھیے کرسٹوفر شیکل اور جاوید مجید، *Hali's Musaddas: The Flow and Ebb of Islam*، نئی دہلی، 1997۔

53 دیکھیے لارل اسٹیل، 'Hali and His Muqaddamah: The Creation of a Literary Attitude in Nineteenth Century India,' مشمولہ *Annual of Urdu Studies*، 1:1981، ص 1 تا 45۔

Scanned with CamScanner

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

شرر کا گذشتہ لکھنؤ

'ہندوستان'، 'مشرق'، 'تمدن' اور 'آخری' کی معنوی تہہ داری

عبدالحلیم شرر 1860 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، لیکن ان کے لڑکپن کے کئی سال کلکتہ سے باہر واقع مٹیابرج میں گزرے جہاں ان کے والد اودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے۔[1] بالغ ہونے کے بعد شرر مختلف وقتوں میں حیدرآباد میں مقیم رہے جہاں وہ مختلف حیثیتوں میں نظام اور اس کے ایک امیر کی ملازمت سے وابستہ رہے۔ انھوں نے انگلستان کا سفر بھی کیا جہاں ایٹن (Eton) کے مقام پر انھوں نے اسی حیدرآبادی امیر کے بیٹے کے اتالیق کے طور پر خدمات انجام دیں؛ وہ وہاں تین برس رہے۔ تاہم، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا اور وہیں انھوں نے 1926 میں وفات پائی۔ تب تک شرر اردو کی ایک غیر معمولی طور پر مشہور شخصیت بن چکے تھے۔

شرر کا تحریری کام کم از کم اکیس سوانح عمریوں، اٹھائیس تاریخی ناولوں، چودہ سماجی ناولوں، مقبولِ عام تاریخ کی پندرہ کتابوں، چھ ڈراموں، بہت سی شاعری اور بے شمار مضامین پر مشتمل ہے؛ ان مضامین کے صرف ایک انتخاب کو آٹھ جلدوں میں جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اردو میں نظمِ معرّا کو متعارف کرانے کا سہرا بھی ان کے سر باندھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی رسالے مرتب اور شائع کیے جن کے تمام مشمولات خود ان کے لکھے ہوئے ہوتے تھے؛ ان رسالوں میں سب سے

Scanned with CamScanner

مشہور دلگداز تھا۔ شرر کی بیشتر طویل تحریریں انھی رسالوں میں قسط وار چھپیں۔

انیسویں صدی کے وسط کے لکھنؤ کے فنون اور ثقافت کا شرر کا مطالعہ بھی دلگداز ہی میں 1913 سے 1920 تک ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کے عنوان سے قسط وار شائع ہوا تھا۔ جب، کچھ برس بعد، ان کے مضامین کے کئی جلدوں پر مشتمل مجموعے کی ایک جلد کے طور پر ان مضامین کو دوبارہ شائع کیا گیا تو غالباً ناشر نے، یا شرر نے خود، اس عنوان میں ''یعنی گذشتہ لکھنؤ'' کے الفاظ بڑھا دیے۔ اس کے بعد سے اس کتاب کا ذکر گذشتہ لکھنؤ ہی کے نام سے کیا جاتا ہے، اور یہ ہمیشہ بازار میں دستیاب رہی ہے۔[2] 1975 میں، جب اس کتاب کا انگریزی ترجمہ *Lucknow: The Last Phase of An Oriental Culture* کے عنوان سے شائع ہوا تو اسے علمی حلقوں کی وسیع تر توجہ حاصل ہونے لگی۔[3]

کتاب کے اصل اردو عنوان — ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' — کو پڑھتے ہوئے فوری طور پر جو سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے: کیا ہندوستان مشرق کا حصہ نہیں، یا کیا شرر کا ہم عصر ہندوستانی کلچر مشرقی نہیں؟ زیرِ نظر مضمون کتاب کے عنوان کے لفظوں پر غور کر کے اسی معمے کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مشق کے ذریعے ثقافتی اور سیاسی دونوں قسم کے 'خاتمے' اور 'زوال' کے اس محیط اور بالادست (overarching) بیانیے پر کسی قدر کارآمد روشنی پڑ سکے گی جس کا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے دوران اردو کی ادبی اور سماجی و ثقافتی تحریروں پر گہرا تسلط رہا ہے، اور بعض حلقوں میں اب بھی کسی حد تک موجود ہے۔

عنوان کا پہلا لفظ 'ہندوستان' ہے جس کا انگریزی ترجمہ اب عموماً 'انڈیا' کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شرر کے دور سے کچھ عرصہ پہلے تک 'ہندوستان' سے عام طور پر شمالی ہند کا ایک ثقافتی اعتبار سے مختص علاقہ — یعنی اتر پردیش کا دوآبہ — مراد لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس علاقے کو، نہ صرف وہاں کے رہنے والے بلکہ بہت سے دوسرے لوگ بھی، ثقافتی اعتبار سے منفرد، بلکہ ثقافتی معیار بندی پر مختار خیال کرتے تھے۔ یہ لفظ 'ہندوستان' اپنے خاص محدود معنی میں پوری انیسویں صدی میں نہ صرف اردو بلکہ ہندی میں بھی مستعمل رہا ہے۔[4] یہاں سرسید کی تقاریر سے صرف ایک اقتباس

اس کی مثال کے لیے کافی ہوگا:

ہمارے ہندوستان کے بھائی بنگالیوں نے، جو اس زمانے میں ہندوستان کی تمام قوموں کے فخر اور سرتاج ہیں، کوشش کر کے ایک درجن بنگالی سویلین بنا لیے ہیں۔ مگر ان کے بھائیوں کو، کسی ملک کے ہوں، خواہ پنجاب کے یا ہندوستان کے، مسلمان ہوں یا ہندو، ان کو شرم نہیں آتی کہ وہ پیچھے رہے جاتے ہیں۔ [5]

یہ محدود مفہوم شرر کے زمانے تک معدوم نہیں ہوا تھا۔ مثلاً شرر کے ہم عصر اور دوست شبلی نعمانی کا یہ فارسی شعر جس کا سالِ تصنیف 1911 ہے:

زبمبئ چوں بہ ہندستاں رسم شبلی
زبادہ بگذرم باز پارسا گردم [6]

یہی صورت حال شرر کے زمانے میں 'ہندوستان' سے مشتق لفظ 'ہندوستانی' کی تھی۔ اس لفظ میں شناخت اور ثقافت کی ایسی خصوصیات کو مضمر سمجھا جاتا تھا جو تھیں تو علاقائی لیکن شمالی ہند کے بے شمار باشندے انھیں ہندوستان گیر (pan-Indian) مانتے تھے۔ [7] مزید برآں، بہت سے مسلمان صاحبانِ قلم 'ہندوستانی' کو 'گنگا جمنی' کا مترادف قرار دیتے تھے، یعنی 'ہندو' گنگا اور 'مسلم' جمنا کے مدغم ہونے کا ثمرہ۔ کچھ دوسرے مسلمان دانشور ایسے بھی تھے جن کے لیے 'ہندوستانی' نام تھا ایک بولی کا جو ان کی اردو کی حریف بن بیٹھی تھی اور جس میں ان کے نزدیک ہندو/ ہندی سمجھے جانے والے عناصر ضرورت سے زیادہ شامل تھے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں 'ہندوستان' اور اس سے مشتق لفظ 'ہندوستانی' معنیاتی (semantic) اعتبار سے نزاعی بھی تھے، اور شرر اور ان کے جیسے بہت سے مصنفوں کے لیے یہ دونوں لفظ حوالہ جاتی (referential) اعتبار سے ہمیشہ اتنے ہندوستان گیر نہیں ہوتے تھے جتنا اب ہم سمجھتے ہیں۔ [8] یہ درست ہے کہ شرر نے اپنی کتاب کے عنوان میں لفظ 'ہندوستان' پورے برصغیر کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس لفظ کے محدود اور خود کو دوسروں سے الگ کرنے والے معنی شرر کی سوچ سے پوری طرح معدوم ہو چکے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شرر نے لکھنؤ کے تعلق سے جو بہت سے مبالغہ آمیز دعوے کیے ہیں ان کے پس پشت 'ہندوستان' کا یہی تنگ تر اور پُر تعصب مفہوم کارفرما نہیں تھا۔ [9]

Scanned with CamScanner

یہ ایک تضاد یہ ہے کہ شرر نے 'ہندوستان' کو تو ایک وسیع تر اور شمولیت پسند (inclusive) معنوں میں استعمال کیا، لیکن 'مشرق' کو ایک عجیب طور سے محدود اور استثنا پسند (exclusivist) انداز سے استعمال کر کے 'ہندوستان' اور 'ہندوستانی' کو 'مشرق' سے جدا کر دیا۔ کیوں؟ شرر کے نزدیک ہندوستان کس لحاظ سے مشرق کا حصہ نہیں تھا؟ اور مثال کے طور پر راجپوتانہ ان کی نظر میں اتنا 'مشرقی' کیونکر نہیں تھا جتنا نوابی لکھنؤ؟

جب پڑھنے والا عنوان سے آگے بڑھ کر کتاب کے پہلے جملے تک پہنچتا ہے تو اس کا استعجاب اور بڑھ جاتا ہے:

> اس کے تسلیم کرنے میں شاید کسی کو عذر نہ ہو گا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب و تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گذشتہ دربار اودھ تھا۔ اگلے دور کی یادگار اور بھی کئی درباروں میں موجود ہیں مگر جس دربار پر پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہو گیا وہ یہی دربار تھا۔[10]

ڈاکٹر فاخر حسین، جنھوں نے انگریزی ترجمے کی نوک پلک سنواری اور وضاحتی حاشیے تحریر کیے، ایک فٹ نوٹ میں شرر کی بات میں یہ اضافہ کرتے ہیں: "[درباروں سے] مراد دراصل حیدرآباد، بھوپال اور رامپور کی مسلمان نوابی ریاستیں ہیں جو مصنف کے دورِ حیات میں پھل پھول رہی تھیں اور 1947 تک قائم رہیں۔"[11] فاخر حسین اس بات کی صراحت نہیں کرتے کہ شرر کی مراد ان کے زمانے کی بعض 'غیر مسلمان' ریاستوں، مثلاً میسور، جے پور اور ٹراونکور، سے کیوں نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم، خود شرر نے اس بات کی صریح وضاحت کوئی پچاس صفحے بعد اس طرح کر دی ہے:

> ان دنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے اور ہندو راجہ خود معترف تھے کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی ان میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔[12]

لیکن اگر 'مشرق' اور 'مسلمان' شرر کے نزدیک ہم معنی الفاظ تھے تو انھوں نے اپنی کتاب کے عنوان میں 'مشرقی' کی جگہ 'مسلمان' کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا؟ اور کیا ہارکورٹ اور فاخر حسین 'مشرقی' کا ترجمہ 'اورینٹل' کرنے میں حق بجانب تھے؟ ان سوالوں کا میرے پاس جو جواب ہے اس

Scanned with CamScanner

کے لیے مختصراً اس بحث سے ذرا دور ہٹنے کی ضرورت ہوگی۔

شرر سے پہلے والی نسل کے لیے 'مشرق' کے معنی محض مشرقی سمت کے تھے۔ تاہم، انھی لوگوں کے نزدیک ــــ جن میں سید احمد خاں، الطاف حسین حالی اور نذیر احمد شامل تھے ــــ اس کا ہم معنی لفظ 'پورب' کچھ اضافی معنی بھی رکھتا تھا۔ ان کے لیے 'پورب' اور 'پوربی' سے مراد اُس علاقے کے باشندے اور ان کی ثقافت تھی جو اَب مشرقی اتر پردیش اور شمالی بہار پر محیط ہے۔ ماضی میں چند صدیاں پیچھے لوٹنے پر، جب دہلی کے ایک تغلق سلطان نے دہلی کے مشرق میں پڑنے والے اپنے مقبوضات کے لیے ایک کمانڈر کا تقرر کیا تو اسے 'ملک الشرق' کا خطاب دیا، جس میں 'شرق' کا لفظ دیسی 'پورب' کا متبادل تھا، جس سے جغرافیائی سمت نہیں بلکہ ایک مخصوص علاقہ مراد تھا۔ اس کمانڈر کی موت کے بعد اس کے دو لے پالک بیٹے اور ان کے اخلاف خود مختار شرقی بادشاہوں کے طور پر راج کرنے لگے۔ جب روایت کے مطابق شاہجہاں نے دعویٰ کیا: ''پورب شیرازِ ماست'' (پورب ہمارا شیراز ہے)، تو اس کی مراد جونپور اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے تھی۔ اور جب، دو صدی بعد، مصحفی نے 'پورب' کے امیروں کا مذاق اڑایا تو ان کی مراد اودھ کے رئیسوں سے تھی۔[13]

اگرچہ 'پورب' اور 'پوربی' کے وافر ضمنی معنی شرر اور ان کے ہم عصروں تک باقی تھے، لیکن نئی صدی کے آغاز پر 'مشرق' اور 'مشرقی' سے منسلک ایک نئی اور اتنی ہی طاقتور شے ہندوستان سے بہت دور وجود میں آ گئی۔ یہ دونوں الفاظ یوروپی شرق شناسوں کے مباحث (discourse) سے وابستہ ہو گئے جن کے مطالعات اسلام اور مشرقِ وسطیٰ پر مرکوز تھے اور جن کے نزدیک 'مشرق' یا 'اورینٹ' کے معنی مسلم مشرقِ وسطیٰ، اور اس میں بھی زیادہ تر عرب علاقوں، تک محدود تھے۔ خود عرب ان عالموں کو 'مستشرقین' ــــ یعنی 'شرق' یا 'مشرق' کا مطالعہ کرنے والے ــــ کہتے تھے۔ چنانچہ ہارکورٹ اور فاخر حسین نے انگریزی ترجمے میں 'مشرق' کے مترادف کے طور پر 'اورینٹ' کا لفظ استعمال کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ شرر نے خود بھی یہی کیا ہوتا۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ انھوں نے 'اورینٹ' سے پہلے 'دی' (the) لگایا ہوتا، جبکہ ان دونوں ترجمہ کاروں نے اس سے پہلے 'اے' (a) کا استعمال کیا۔[14] یہ مترجمین، جو شرر کے پانچ دہائیوں بعد اپنا کام کر رہے تھے، 'دی اورینٹ' کے دیگر جغرافیائی خطوں

کے وجود کو تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے، جبکہ شرر اور ان کے ہم عصروں کے لیے 'اورینٹ' یا زیادہ درست طور پر 'مشرق' کے معنی 'اسلامی' یا 'عرب' عناصر تک محدود تھے۔ یہ رواج ان لوگوں نے شروع کیا تھا جو عربی میں لکھتے تھے، مثلاً مصر کے جرجی زیدان اور رشید رضا۔ ہندوستان میں شرر اور شبلی جیسے لوگوں نے، جو عرب مصنفوں کا مطالعہ کرتے اور اکثر ان سے رابطے میں بھی رہتے تھے، اسے جوں کا توں اردو میں منتقل کر دیا۔[15]

جتنا حیران کن یہ اسم صفت 'مشرقی' ہے اتنا ہی وہ اسم مجرد بھی ہے جسے وہ متصف کرتا ہے، یعنی 'تمدن'۔[16] مجھے سب سے پہلے شرر کے عنوان میں جو بات قابلِ توجہ معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ شرر نے اسے تنہا، یعنی لفظ 'تہذیب' کے بغیر، استعمال کیا تھا۔[17] آج کل کی اردو میں لفظ 'تمدن' یا تو 'تہذیب و تمدن' کے فقرے کے دوسرے جز کے طور پر برتا جاتا ہے، یا پھر بمشکل ہی کہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ فقرہ شرر کے زمانے میں بھی عام ہو چکا ہوگا، کیونکہ اسے کتاب کے مذکورہ بالا پہلے جملے میں بھی استعمال کیا گیا ہے: ''اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب وتمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گذشتہ دربار اودھ تھا۔'' ہارکورٹ اور فاخر حسین نے اس کا انگریزی ترجمہ اس طرح کیا ہے:

> "It is unlikely that anyone will question the statement that the late court of Awadh was the final example of oriental refinement and culture in India."

یہ بات عیاں ہے کہ مترجمین نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے اردو کے دو لفظوں کی جگہ انگریزی کے بھی دو ہی لفظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر وہ صرف 'کلچر' کا لفظ لاتے (جیسا کہ خود میں نے اس اقتباس کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے کیا) تب بھی شرر کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

اس تاثر کی تصدیق کے لیے کہ لفظ 'تمدن'، خصوصاً تنہا، اب اردو میں عام طور پر مستعمل نہیں، میں نے ایک چھوٹا سا تجربہ کیا۔ میں نے اردو بولنے والے بیس اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد سے درج ذیل

جملوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی، جن میں سے ایک میں "refinement and culture" کا فقرہ استعمال ہوا ہے:

"It is the finest example of Islamic refinement and culture. It must be preserved."

مجھے جو بارہ جواب موصول ہوئے ان میں سے چھ میں "culture" کا ترجمہ 'تہذیب'، تین میں 'ثقافت' اور ایک ایک میں 'تمدن'، 'تہذیب و تمدن' اور 'کلچر' کیا گیا تھا۔ جہاں تک لفظ "refinement" کا تعلق ہے، اس کے ترجمے کے لیے بہت سے مختلف الفاظ استعمال کیے گئے لیکن ان میں 'تہذیب' اور 'تمدن'، قطعی شامل نہیں تھے۔

آج اگر میں اردو فقرے 'تہذیب و تمدن' کا ترجمہ "civilization and culture" کروں تو کوئی بھی اردو بولنے والا مجھے مکھی پر مکھی بٹھانے والا قرار دے گا۔ اس کا اصرار ہوگا کہ مجھے ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ وہ اس بات کی بھی نشاندہی کرے گا کہ آج کل کی اردو میں انگریزی کا لفظ 'کلچر' بھی بلا تکلف برتا جاتا ہے، اور یہ کہ 'تہذیب' کا لفظ ایسی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں قابلِ لحاظ زمانی گہرائی پائی جاتی ہو جبکہ 'کلچر' ان چیزوں کا احاطہ کرتا ہے جو معاصر دور یا قریبی ماضی کی پیداوار ہوں — چنانچہ 'پاکستانی کلچر'، جبکہ 'اسلامی تہذیب'۔ بعض لوگ 'تمدن' کا لفظ کسی خطے کے باشندوں کے مادّی کلچر کے لیے استعمال کرنے کو ترجیح دیں گے جبکہ لوگوں کی عادات اور نجی ربط ضبط کے اصولوں کے لیے 'تہذیب' کا لفظ برتیں گے۔ بعض ازحد باعلم اشخاص یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ 'تہذیب' کو دور افتادہ اور دیہاتی علاقوں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، جبکہ 'تمدن' شہروں سے مخصوص ہے۔

میرے دوسرے تجربے کے نتائج اس سے بھی زیادہ خلافِ توقع نکلے۔ میں نے یونیورسٹی آف شکاگو کی ریگنسٹائن لائبریری میں 'عنوان کا کلیدی لفظ' والا آپشن استعمال کر کے کئی بک سرچز (book searches) کیں۔ 'تہذیب' کا لفظ 106 کتابوں کے عنوانات میں آتا تھا جن میں سے پوری سو اردو کی کتابیں تھیں جبکہ ایک بنگلہ اور ایک پشتو کی تھی؛ عربی یا فارسی کی صرف چار کتابیں تھیں۔

Scanned with CamScanner

اس کے برخلاف لفظ 'تمدن' 96 کتابوں کے عنوانوں میں ظاہر ہوا، جن میں سے زیادہ تر عربی یا فارسی میں تھیں۔ اردو کے 23 اندراجات میں سے چار شرر کی اسی کتاب سے متعلق تھے اور دو فرانسیسی سے کیے ہوئے پرانے ترجموں سے۔ تیسری سرچ کے لیے جب میں نے 'تہذیب وتمدن' کا فقرہ رکھا تو صرف پانچ کتابیں سامنے آئیں جو سب اردو میں تھیں۔ تمام اردو عنوانوں کا مزید جائزہ لینے سے انکشاف ہوا کہ تنہا 'تہذیب' 96 اردو کتابوں کے عنوانات میں آتا تھا جبکہ تنہا 'تمدن' صرف 16 میں۔ موخر الذکر میں سے تین کی تصنیف یا ترجمے کا زمانہ ایک ہی تھا، یعنی بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیاں، اور دیگر تین ایسی تھیں جو ندوۃ العلما، لکھنؤ، سے متعلق اشخاص نے لکھی تھیں۔ اب یہ بات عیاں ہوگئی کہ اردو میں ان دو لفظوں کے استعمال پر زیادہ گہرائی سے غور کرنا ضروری ہے۔

میرے پاس وہ وسائل نہیں ہیں کہ میں ان دو باہم منسلک سوالوں کی کوئی قابلِ اعتماد تحقیق کر سکوں: (1) اردو کے دانشوروں نے 'ثقافت' اور 'ثقافتی میراث' کے موضوعات پر لکھنا کب شروع کیا، اور (2) لفظ 'تہذیب' کو 'کلچر' یا 'سویلائزیشن' کے معنوں میں برتنا کب شروع کیا گیا۔[18] میں صرف قیاس آرائی کرسکتا ہوں، اور میرا خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں کسی وقت وہ تمام متنوع معاملات جن کو زیر بحث لاتے ہوئے انھیں اس سے پہلے 'ادب' ("protocols")، 'اخلاق' ("moral codes")، 'آئین' ("administrative rules or constitution")، 'رسوم' ("customs")، 'رواج' ("local practices")، 'روایات' ("traditions")، 'فنون' ("arts and crafts") اور دوسرے الگ الگ زمروں میں رکھا جاتا تھا، اب ایک وسیع تر لفظ 'تہذیب' کے احاطے میں آ گئے، جس کا بنیادی مقصد، ظاہراً، ان تمام معاملات کے ایک دوسرے سے اور ایک واحد، تقریباً قائم بالذات (autochthonous) ماضی سے منسلک ہونے کی نشاندہی کرنا اور پھر اس پر زور دینا تھا۔[19] میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایسا کرنے کی ضرورت نوآبادیاتی حاکموں کے اس دعوے کے ردعمل میں محسوس کی گئی کہ ہندوستان میں ان کی کامیابی کا سبب ان کی 'سویلائزیشن' کا برتر ہونا تھا۔ اس کے نتیجے میں ثقافتی برتری اور 'تہذیب پھیلانے کا مشن' جیسے خیالات بھی اس بحث میں در آئے، خصوصاً ان اردو ادیبوں کے ہاں جن میں سے بعض 'تمدن' کا لفظ استعمال کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

لفظ 'تمدن'، میں قیاس کرتا ہوں، اردو کے سماجی و ثقافتی مباحث کی زبان میں 1896 میں داخل ہوا جب سید علی بلگرامی نے گستاو لی بان (Gustave LeBon) کی کتاب *La Civilization des Arabes* کا ماہرانہ ترجمہ شائع کیا اور اسے تمدنِ عرب کا عنوان دیا۔[20] فراوانی سے مصور کیے ہوئے ایڈیشن میں شائع ہونے والی یہ کتاب اس زمانے کی دانشور اشرافیہ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہوگی کیونکہ بلگرامی کو بہت اونچا رتبہ اور شہرہ حاصل تھا۔[21] اپنی وفات سے پہلے بلگرامی نے ہندوستانی سویلائزیشنز کے بارے میں اسی مصنف کی اسی نوعیت کی کتاب *Les Civilisations de l'Inde* کا بھی ترجمہ کیا۔ تمدنِ ہند کے عنوان سے یہ ترجمہ ان کی وفات کے بعد، 1913 میں شائع ہوا۔[22] لی بان کی ان دونوں کتابوں کے درمیان ایک اور کتاب سامنے آئی جو غالباً زیادہ اثر انگیز ثابت ہوئی: محمد حلیم انصاری کا کیا ہوا جرجی زیدان کی مقبولِ عام عربی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا دو جلدوں پر مشتمل ترجمہ، جو 1907 میں شائع ہوا۔[23]

اس زمانے کے مسلمان/ اردو ادبی حلقوں میں زیدان کی مقبولیت کا اب کوئی خاص ذکر نہیں ملتا، اور فی الوقت میں اس پر مزید بحث کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ شبلی نے اپنے قسطنطنیہ اور قاہرہ کے سفرنامے میں ان کے بااثر عربی جریدے الہلال کی سفارش کی تھی اور درحقیقت علیگڑھ کے عربک کلب نے، جس کے بنیاد گذار اور قائد شبلی تھے، اسے اپنے نام جاری بھی کروایا تھا۔[24] شبلی نے زیدان سے بیس برس تک رابطہ برقرار رکھا اور انھیں زیدان کی کتابیں شائع ہوتے ہی موصول ہوتی رہیں۔ دونوں کے بیچ مراسلت بھی جاری رہی۔[25] یہ تعلق 1912 میں اس وقت ٹوٹا جب شبلی نے زیدان کی اِسی تاریخ کو اپنے ایک طویل عربی مقالے میں، جو رشید رضا نے اپنے جریدے المنار میں شائع کیا، سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ شبلی کو کس بات نے اس کتاب کے شائع ہونے کے آٹھ برس بعد اتنا شدید ردعمل ظاہر کرنے پر اکسایا ہوگا، اس بارے میں صرف قیاس ہی لگایا جا سکتا ہے، لیکن ان کا اپنا بیان کردہ سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں اس کتاب کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی تھی۔[26] زیدان نے بائیس تاریخی ناول بھی تحریر کیے، جن میں سے متعدد اردو میں ترجمہ ہو کر مقبول بھی ہوئے۔[27]

لی بان 'تمدن' کے ارتقائی تصور سے کام لیتا ہے: ثقافت سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھتی

Scanned with CamScanner

ہے اور یوں 'بربریت' سے 'تہذیب' کی جانب ارتقا پاتی ہے۔ [28] مزید یہ کہ لی بان اس طبعی ماحول پر بہت زور دیتا ہے جس میں رہتے ہوئے کسی خطے کے باشندے اپنی 'بنیادی' خصوصیات کو ترقی دیتے ہیں اور ان کی ثقافت مخصوص خطوط پر آگے بڑھ کر اپنا روپ لیتی ہے۔ اسے لوگوں کے مادّی کلچر، خصوصاً عمارتوں، سے گہری دلچسپی ہے، اور وہ اس میں آنے والی تبدیلیوں کو 'ترقی' اور 'تنزل' کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ لی بان بڑی حد تک اشرافیہ پسند ہے، اور بعض اعتبار سے صاف صاف نسل پرست بھی۔

زیدان نے اپنی تصنیف میں جن یوروپی عالموں کی کتابوں سے مدد لینے کا اعتراف کیا ہے ان میں لی بان کو سرفہرست رکھا ہے، اور وہ خود اگرچہ عظیم نظریوں کا شائق نہیں، لیکن لی بان میں اور اس میں جو بات مشترک ہے وہ یہ عقیدہ ہے کہ 'ثقافتی ترقی' کی راہ 'سیاسی اقتدار' کے نتیجے میں ہموار ہوتی ہے۔ دونوں مصنفوں کے نزدیک سیاسی تسلط کی توسیع میں مفتوح آبادی کے درمیان 'تہذیب پھیلانے' کے عمل کے شروع ہونے اور برقرار رہنے کا امکان چھپا ہوتا ہے۔ دونوں کے لیے عرب/مسلمان ثقافت کا سب سے شاندار زمانہ وہی ہے جو عباسی خلافت کے تحت عرب/مسلمان فتوحات سے تعلق رکھتا ہے۔ نتیجتاً دونوں کسی ثقافت کے 'زوال' کو اس کے حاملوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمے سے منسلک کرتے ہیں۔

شرر کے نزدیک بھی کسی ثقافت کی 'ترقی' اور 'تنزل' کا تعلق سیاسی اقتدار کے عروج اور زوال سے ہے۔ ان کے مطابق جب دہلی کا اقتدار جاتا رہا اور وہاں کا تاجر طبقہ دہلی کے امرا اور شرفا پر غالب آ گیا، تب ہی فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ کو سیاسی طاقت حاصل ہوئی — اور نتیجتاً وہ ایک منفرد 'تمدن' کو پروان چڑھانے کے قابل ہوئے۔ بعد میں جب لکھنؤ اپنے سیاسی اقتدار سے محروم ہوا تو اس کی ثقافت پر بھی زوال آ گیا۔ لی بان کی طرح شرر بھی تعمیرات کو ایک پیمانے کے طور پر برتتے ہیں۔ ان کے نزدیک آصف الدولہ اور اس کے باپ نے اودھ کی وہ عمارتیں بنوائیں جو تاریخی اہمیت اور پائیدار مضبوطی رکھتی تھیں، جبکہ سعادت علی خاں اور اس کے بعد آنے والوں کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں محض سطحی چمک دمک تھی، کوئی پائیدار قدر نہیں۔ [29]

جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے، شرر کے نزدیک سیاسی تسلط رکھنے والوں کا 'تمدن' زیر تسلط علاقے

میں 'تہذیب پھیلانے' کا منصب ادا کرتا ہے۔ چنانچہ شرر کے بیانیے میں فیض آباد اور لکھنؤ سادہ ورق کے طور پر ہیں جس پر برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ اپنا 'تمدن' تحریر کر دیتے ہیں۔ گویا اودھ کبھی شرقی بادشاہت کا حصہ رہا ہی نہ تھا جس کا تعمیرات، ادب، اور عطر سازی اور قالین بافی جیسی صنعتوں میں ادا کردہ کردار شرر کے لیے ہرگز نامعلوم نہ رہا ہوگا۔ یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ سنی شرر نے شیعہ شرقیوں کو نظر انداز کرنا فرقہ پرستی کی بنیاد پر روا رکھا ہوگا — کیونکہ اودھ کے نواب بھی تو آخر شیعہ ہی تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اس طرزِ عمل کے پیچھے شمالی ہند کی مسلمان اشرافیہ کی ایک مختلف لیکن راسخ عادت کارفرما رہی ہوگی۔ فاخر حسین کے تحریر کردہ تعارف کی ان ابتدائی سطروں پر غور کیجیے:

> تمام تہذیبوں کی طرح ہند مغلیہ تہذیب بھی چند ایسے طاقتور تصورات پر مبنی تھی جن کا تعلق ایک مخصوص معاشرتی سیاق و سباق سے تھا۔ یہ تصورات، جو اداروں، تقریبات، رسوم اور زبان میں ظاہر ہوتے ہیں، ایک نمایاں طور پر طبقاتی معاشرے پر دلالت کرتے ہیں جو خواہ کتنا ہی غیر نمائندہ اور اشرافیہ پسند کیوں نہ رہا ہو، بذاتِ خود اتحاد اور ہم آہنگی کا حامل تھا۔ لیکن ناگزیر طور پر ایسی کوئی تہذیب غیر متحرک نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ نئی قوتیں ابھرتی رہیں، پرانے تصورات کو للکارا گیا اور مسلمہ تنظیم میں خلل آیا۔ ہند مسلم تہذیب کا یہی وہ زمانہ ہے، جب وہ اپنے عروج پر بھی تھی اور اپنے آخری دور سے بھی گزر رہی تھی اور جب اس کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا، جس پر زیرِ نظر کتاب نے توجہ مرکوز کی ہے۔ 30

اس معنی خیز پھسلواں اسلوب پر ذرا غور کیجیے۔ پہلے جملے کی 'ہند مغلیہ تہذیب' پانچویں جملے تک آتے آتے کتنی سہولت سے سرک کر 'ہند مسلم تہذیب' میں بدل جاتی ہے۔ فاخر حسین نے بلاشبہ وہی کیا ہے جو شمالی ہند کے اردو دانشور ایک صدی پہلے سے کرتے آ رہے تھے۔ شبلی نے، اپنے محولہ بالا مضمون میں، لکھا تھا:

> ہندوستان میں مسلمان آئے تو وہ حالت تھی جس کی تصویر بابر نے کھینچی ہے کہ لنگوٹی لگائے پھرتے تھے، یا مسلمانوں نے ایک ایک چیز میں تہذیب و تمدن کی ہزاروں شاخیں پیدا کر دیں۔ مثلاً پہلے گھوڑوں پر ننگی پیٹھ سوار ہوتے تھے یا کمبل وغیرہ ڈال لیتے تھے۔ تیموریوں کے عہد میں گھوڑے کے لیے جو سامان پیدا ہوئے اس کی تفصیل یہ ہے۔ 31

Scanned with CamScanner

(شبلی کی دی ہوئی تفصیل تمام تر ابوالفضل کی آئینِ اکبری سے ماخوذ ہے۔) شبلی کے نزدیک بھی 'ہند مسلم' اور 'ہند مغل' ہم معنی تھے؛ مغلوں سے پہلے کے مسلمان بادشاہوں کے ہونے سے ان کی سوچ میں بظاہر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

شرر کی کتاب کے عنوان کی طرف لوٹتے ہوئے، اگر ہم ان دولفظوں —— 'مشرقی' اور 'تمدن' —— کو ساتھ ساتھ رکھیں اور یہ سوال کریں کہ شرر کے نزدیک اس فقرے کی کیا معنویت تھی، تو اوپر کی بحث کی روشنی میں اس کا جواب ہوگا: مشرقی تمدن = اورینٹل کلچر = اسلامی کلچر = ہند مسلم کلچر = اٹھارھویں صدی کی دہلی کا کلچر = لکھنؤ کا کلچر۔ اس اندازِ فکر کی خطِ مستقیم میں حرکت اتنی ہی مبہوت کر دینے والی ہے جتنی اس میں فرض کی جانے والی ان تمام تصورات کی باہمی برابری۔ جو کچھ اس سے باہر چھوڑ دیا گیا ہے اس کا تو ذکر ہی بے سود ہے۔ یہ عادت اب بھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے، اگرچہ باہمی تعامل اور تبادلے، تعاون اور شمولیت کے تصورات کو رفتہ رفتہ زیادہ وسیع پیمانے پر قبولیت حاصل ہوتی رہی ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تبدیلی کے سبب ہی اب اردو میں 'تمدن' کے مقابلے میں لفظ 'تہذیب' کہیں زیادہ مستعمل ہے اور انگریزی لفظ 'کلچر'، اپنی نسبتاً کم جارحیت کے ساتھ، اردو میں عام ہو گیا ہے۔

آخر میں ہم کتاب کے عنوان کے آخری دولفظوں 'آخری نمونہ' پر غور کرتے ہیں اور یہ پوچھتے ہیں کہ شرر کے لیے کون سا لکھنؤ 'آخری' تھا؟ کیا یہ وہ لکھنؤ تھا جس کا وجود شرر کے اعلان کی رو سے 1857 کے بعد مٹ گیا تھا؟ یا یہ وہ لکھنؤ تھا جسے شرر کے کہنے کے مطابق واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں نئے سرے سے تخلیق کیا تھا اور جو 1887 میں واجد علی شاہ کے مرنے پر ختم ہوا؟[32] تاہم، لکھنؤ، بحیثیت ایک شہر، بادشاہت کے خاتمے کے بعد غائب تو نہیں ہوا تھا؛ اس کا وجود غدر کے بعد بھی قائم رہا اور، شرر کی اپنی شہادت کی رو سے، یہ شہر اس وقت بھی زندہ اور سرگرمِ کاروبار شہر تھا جب انھوں نے اپنی یہ کتاب لکھی۔

یہاں خود کو یہ یاد دلانا کارآمد ہوگا کہ غدر کے بعد لکھنؤ، خاص طور پر اس کی مسلمان آبادی، کا مقدر دہلی سے بہت مختلف رہا تھا۔ دہلی کے فصیل بند علاقے کا پہلے محاصرہ کیا گیا، پھر اس پر گولہ باری

Scanned with CamScanner

کی گئی، اور اس کے بعد وہاں کے شاہی خاندان اور امرا کو ہلاک یا قید کیا گیا۔ فصیل بند شہر کی جو مسلمان آبادی وہاں سے فرار ہو گئی تھی، اسے بہت عرصے تک لوٹنے نہیں دیا گیا۔ دہلی، دوبارہ فتح کیے جانے کے بعد بھی، نوآبادیاتی حاکموں کے صدر مقام کی حیثیت سے آگرہ سے دوسرے درجے پر رہا۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کو کسی محاصرے کا نشانہ نہیں بننا پڑا اور اس کے آباد علاقوں کو غدر کے دوران نسبتاً کم تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں کی مسلمان آبادی کو بھی طویل عرصے کے لیے شہر چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لکھنؤ کو نوآبادیاتی حاکموں کے ایک اہم علاقائی صدر مقام کی حیثیت سرعت سے دوبارہ حاصل ہو گئی اور اس حیثیت سے اس نے اپنے حریف دو شہروں، کانپور اور الہ آباد، کو پیچھے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بڑے اور چھوٹے تعلقداروں اور زمینداروں نے لکھنؤ میں اپنے مستقر قائم کر لیے۔ ان کے ذریعے سے شہر میں پیسہ آیا، اس کی طبعی بحالی تیز ہوئی اور اس کے کاریگروں اور ہنرمندوں کو سرپرستی حاصل ہوئی۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ نئی صدی کے آغاز پر شرر کو وہ بہت کچھ دکھائی نہ دے سکتا تھا جسے انھوں نے اپنے لڑکپن میں لکھنؤ اور مٹیا برج میں دیکھا تھا، لیکن وہ اس سے بے خبر نہیں تھے کہ ماضی کا خاصا بڑا حصہ شہر کے ہندو اور مسلمان اشراف میں، اور انھیں خدمات فراہم کرنے والوں میں، تب بھی باقی تھا۔ دوسرے لفظوں میں، خواہ وہ زیادہ تر ماضی کے بارے میں لکھنے کا دعویٰ کرتے ہوں، شرر ضمناً حال کے بارے میں بھی لکھ رہے تھے۔[33]

ہمارے اس تاثر کی تصدیق ایک اور کتاب سے ہوتی ہے جو شرر کی کتاب کے ساٹھ برس بعد شائع ہوئی: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار۔[34] اس کے مصنف مرزا جعفر حسین کے مطابق لکھنؤ کی قدیم ثقافت کا خاتمہ دراصل 1940 کی دہائی میں ہوا تھا۔

جعفر حسین کے نزدیک کلیدی اہمیت کا لفظ ہمیشہ 'تہذیب' ہے۔ وہ اپنی کتاب کا تعارف یوں کراتے ہیں:

> اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ لکھنؤ ایک انتہائی دلفریب اور گراں قدر تہذیب کا کچھ عرصہ قبل تک مرکز تھا۔ اس تہذیب کی تخلیق میں لکھنؤ کے نوابین، روسا و امرا، امیر اور غریب، عالم اور جاہل، ہندو اور مسلمان، شاعر اور صوفی، رشی اور سادھو، تاجر اور فقیر، سپاہی اور

Scanned with CamScanner

شہری، مرد اور زن سب ہی کا بقدر حیثیت و ہمت وجثہ حصہ تھا۔

اس کے بعد، تیرہ سطروں میں قدیم لکھنؤ کی طرف سے دنیا کو ملنے والے تحفوں کی فہرست بنانے کے بعد، جعفر حسین اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لکھنؤ کی تہذیب اپنی جگہ پر ایک ایسی حسین وجمیل اور پر کیف دنیا تھی جس کو شاہانِ اودھ کے دورِ اقتدار میں بسایا اور آباد کیا گیا تھا۔ ان حکمرانوں نے اس کی بنیاد کچھ ایسی ہنر مندی اور اتنے خلوص و انہماک سے رکھی تھی کہ انتزاعِ سلطنت کے تخمیناً اسی برس بعد تک اس کے آثار موجود تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں یہ عمارت بالآخر پوری طرح نیست و نابود ہو گئی۔[35]

'تہذیب' کے مظاہر (rubrics) — کھانے، تفریحیں، طوائفیں، زبان، شاعری، گھریلو ساز و سامان، رسم و رواج اور ان کے علاوہ بہت کچھ اور —[36] جن کا احاطہ جعفر حسین نے اپنی کتاب میں کیا ہے، کم و بیش وہی ہیں جو شرر کے نزدیک 'تمدن' کی تعریف میں آتے تھے۔ دونوں مصنفوں کے درمیان واحد اہم فرق یہ ہے کہ جہاں شرر بار بار لکھنؤ کے دہلی کا احسان مند ہونے کا ذکر لاتے ہیں وہاں جعفر حسین لکھنؤ کے گن گاتے ہوئے دہلی کا مشکل ہی سے ذکر کرتے ہیں۔[37] اس کے باوجود جعفر حسین خود شرر کا حد درجہ احسان مانتے ہیں۔

خداوندِ عالم جزائے خیر دے مولانا عبدالحلیم شرر کو جن کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت ان کی گراں قدر تصنیف گذشتہ لکھنؤ میں ہم کو اپنے اسلاف کی معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس تصنیف میں تمام حالات شاہی دور سے متعلق ہیں جن کا پرتو بہر حال انیسویں صدی کے اواخر تک شہر کے در و دیوار پر ضوفگن تھا۔ راقم کو وہ زمانہ دیکھنے کا موقع ملا جب ہمارے آثارِ قدیمہ ایک ایک کر کے منہدم ہو رہے تھے۔[38]

تعجب خیز اور خیال انگیز بات یہ ہے کہ لکھنؤ کی خاص لیکن 'گمشدہ اور رفت و گزشت' ثقافت کے معاصر تذکروں میں، جو ہندوستان اور پاکستان کے اردو رسالوں میں اکثر شائع ہوا کرتے ہیں، دونوں مصنفوں کو حق گوئی کے ایک ہی مقام پر فائز رکھا جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ناسٹلجیا میں مبتلا کسی شخص کے لیے اس کا ناسٹلجیا حقیقی معنوں میں تبھی لذت بخش بنتا ہے جب وہ کسی نہ کسی طرح خود کو یقین دلا لے کہ ماضی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

شرر اور جعفر حسین دونوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اور یہی قصہ ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے جو دونوں کتابوں کے یکساں مداح ہیں اور ایک واحد سحر انگیز لکھنؤ کے 'آخری' دنوں کا مشاہدہ کرنے کے سلسلے میں دونوں کے بلند بانگ دعووں کے درمیان کوئی تضاد نہیں دیکھتے۔

❁❁

حواشی

1 اس مضمون کے سلسلے میں میں نے شرر کی زندگی اور کام کے بارے میں درج ذیل کتابوں کو بہت کارآمد پایا: (1) جعفر رضا، عبدالحلیم شرر (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1988)؛ (2) ممتاز منگلوری، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، 1978)۔

2 اس وقت دو خاص طور پر کارآمد ایڈیشن موجود ہیں: (1) عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، مرتبہ رشید حسن خاں (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، 2000) اور (2) عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، مرتبہ اکرام چغتائی (لاہور: سنگِ میل، 2006)۔ آگے دیے گئے تمام حوالے موخر الذکر ایڈیشن کے ہیں۔

3 عبدالحلیم شرر، *Lucknow: The Last Phase of an Oriental Culture*، ترجمہ اور ترتیب، ای ایس ہارکورٹ (E. S. Harcourt) اور فاخر حسین (بولڈر: ویسٹ ویو پریس، 1975)۔ آگے اس کا ذکر H&H سے کیا جائے گا۔

4 انگریز مورخوں اور نقشہ نگاروں کو بھی لفظ 'ہندوستان' کے ان دو معنوں سے جوجھنا پڑا تھا۔ اس بحث کے لیے دیکھیے:

Ian J. Barrow, "From Hindustan to India: Naming Change in Changing Names," in *South Asia: Journal of South Asian Studies*, 26:1 (April 2003), pp. 37–49.

5 مولوی سید اقبال علی (مولف)، سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 1973۔ صفحہ 8-107۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں: ''اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک؟ وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا؟ وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا؟ وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں؟'' (ص 13)۔ ایسی مثالیں تلاش کرنے سے اُس زمانے کی ہندی میں بھی مل سکتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

6 ایک زیادہ جذباتی مثال فانی بدایونی کا مشہور شعر ہے:

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

7 تنگ تر تعریف اب بھی شمالی ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کو جنوبی ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی سے ممیز کرنے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔ اس کا تحقیر آمیز استعمال اکثر پاکستان کی مہاجر مخالف بحث میں سامنے آتا ہے۔ دوسری طرف، پاکستان کے شدید قوم پرست عناصر آج کے ہندوستان کا ذکر ہمیشہ 'بھارت' کے نام سے کرتے ہیں اور 'ہندوستان' کو 1947 سے پہلے کے ہندوستان کے لیے مخصوص رکھتے ہیں۔

8 وقت گزرنے سے صورت حال پوری طرح تبدیل نہیں ہوئی۔ ستمبر 1947 میں اتر پردیش کی لیجسلیٹو اسمبلی کا ایک رکن درج ذیل بیان دے سکتا تھا اور سننے والے اسے پوری طرح سمجھ بھی سکتے تھے: ''اگر آپ کسی بنگالی سے پوچھیں، 'تم مجھے کیا کہہ کر پکارو گے؟' تو وہ کہے گا، 'ہندوستانی۔' اگر مجھے اس سوال کا خود جواب دینا پڑے تو میں بھی خود کو ہندوستانی ہی کہوں گا، کیونکہ اس سے بہتر کوئی نام میرے پاس نہیں۔'' بحوالہ:

Gyanesh Kudaisya, "'Aryavarta,' 'Hind,' or 'Uttar Pradesh': The Postcolonial Naming and Framing of a 'Region,'" in D. Chakrabarty, R. Majumdar and A Sartori (eds), *From the Colonial to the Postcolonial: India and Pakistan in Transition* (New Delhi: Oxford University Press, 2007), p. 266.

اس حوالے کے لیے میں مہندر سنگھ کا ممنون ہوں۔

9 وثوق سے تو نہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب شرر نے لکھنؤ کے لیے دعویٰ کیا کہ وہ 'ہندوستان' میں ایک خاص اسلامی تہذیب کا 'آخری' نمونہ تھا تو انھوں نے یہ ممکن رکھا کہ حیدرآباد کو ایک وسیع تر ہندوستان میں اسی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ کہا جا سکے۔ یہاں لی بان کا ایک جملہ قابلِ توجہ ہے۔ وہ حیدرآباد کے بارے میں لکھتا ہے: 'ہند کے کل شہروں میں حیدرآباد ہی وہ شہر ہے جس میں اس وقت پرانی صدیوں کی قدیم مشرقی شان باقی ہے۔' (تمدنِ ہند، ص 494۔ دیکھیے حاشیہ 22، نیچے۔)

10 شرر، صفحہ 53۔ H&H، صفحہ 29۔

11 H&H، صفحہ 234۔

12 H&H، صفحہ 78۔

13 مصحفی نے اودھ کے امرا کو 'بنگالے کی مینائیں' قرار دیا تھا — ''بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر'' — کیونکہ ان کی زبان سے وہی نکلتا تھا جو ان کے انگریز استادوں کا سکھلایا ہوا ہوتا تھا۔

Scanned with CamScanner

14 اصل اردو متن میں 'مشرق' کا لفظ تعین کی قوت کا حامل ہے کیونکہ اس سے پہلے عدم تعین کی کوئی علامت (کوئی، ایک وغیرہ) نہیں ہے۔ اردو میں عدم تعین کو کئی طریقوں سے ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ تعین کے اظہار کے لیے کوئی نشان نہیں ہوتا۔

15 شرر اور شبلی نعمانی (1857-1914) آپس میں اچھے دوست تھے۔ شبلی ہی کے توسط سے شرر کی ملاقات سید احمد خاں سے ایسے موقعے پر ہوئی جو شرر کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔

16 الیف اسٹائن گاس (F. Steingass)، *Comprehensive Persian-English Dictionary*، Residing in a city; dwelling together in large bodies. اس کے جدید استعمال کے لحاظ سے قریب ترین ترجمہ "Urban or urbanized culture" ہوگا۔

17 اسٹائن گاس: "Purifying . . . adorning . . . amending; correction . . . refinement." آج کل اس کا ترجمہ 'سویلائزیشن' کیا جائے گا۔

18 جب سید احمد خاں نے، دسمبر 1870 میں، اپنے مشہور رسالے کا نام تہذیب الاخلاق رکھا تو انھوں نے 'تہذیب' کو اسمِ فعلی کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن جب انھوں نے ہنری ٹامس بکل (Henry Thomas Buckle) کی کتاب *The History of Civilization in England* کا ترجمہ کیا تو اس لفظ کو 'سویلائزیشن' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا۔ (اس حوالے کے لیے میں ڈیوڈ لیلی ولڈ کا ممنون ہوں۔) جان ٹی پلاٹس نے اپنی *A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English* (1884) میں 'تمدن' کے معنی یوں بیان کیے ہیں: "Residing in a city or town; dwelling together in large bodies (men)." 'تہذیب' لفظ کے معنی بیان کرتے ہوئے اسے ایک اسمِ فعلی کے طور پر برتا گیا ہے اور وہی معنی بیان کیے گئے ہیں جن کی توقع کی جا سکتی تھی: purifying, adorning وغیرہ۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری (1938?) میں "civilization" اور "culture" دونوں الفاظ دیے گئے ہیں۔ 'سویلائزیشن' کے بنیادی معنی 'اصلاح' اور 'تربیت' بیان کیے گئے ہیں، ان کے بعد 'تمدن' آتا ہے اور آخر میں 'تہذیب'۔ 'کلچر' کے جو معنی لکھے گئے ہیں ان میں 'تمدن' نہیں آتا لیکن لفظ کے تیسرے معنی کے طور پر 'تہذیب' آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں لفظ اور ان سے وابستہ تصورات خاصے عرصے تک دھندلے رہے ہیں۔

19 اس سے پہلے لوگ مختلف فنون کے بارے میں الگ الگ لکھا کرتے تھے اور ایک متحد ثقافت کے تصور کو ان پر عائد نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں واحد استثنیٰ، میرے محدود علم کے مطابق، ابوالفضل کے آئینِ اکبری کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس منفرد اکائی کے وجود کا دعویٰ ابوالفضل کرتا ہے اس کا تعلق وہ ایک فردِ نابغہ

Scanned with CamScanner

(شہنشاہ اکبر) سے جوڑتا ہے نہ کہ کسی قوم یا تہذیب سے۔

20 گستاو لی بان (1841-1931) ایک جامع العلوم اور خود آموختہ شخص تھا جسے اب بنیادی طور پر متنوع موضوعات کے علمی نظریات کو عام فہم بنانے والا کہا جاتا ہے۔ ایک مستشرق کے طور پر اس کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جانا اب اتنا عام ہے کہ ایڈورڈ سعید نے اپنی مشہور کتاب میں اس کا صرف ایک بار نام لیا، اور وہ بھی لی بان کے نسل پرستانہ بشریاتی نظریات کے حوالے سے۔ لی بان کے نظریات سے میری نہایت محدود واقفیت رابرٹ اے نائے (Robert A. Nye) کی کتاب *The Origins of Crowd Psychology: Gustave LeBon and the Crisis of Mass Democracy in the Third Republic* (London: Sage Publications, 1975) پر مبنی ہے۔

21 گستاو لی بان، تمدنِ عرب، مترجمہ سید علی بلگرامی (سرگودھا: ظفر ٹریڈرز، 1975)۔ سید علی بلگرامی (1851-1911)، ایک ہفت زباں کثیر العلم شخص تھے اور حیدرآباد اور برطانوی ہند دونوں جگہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ انھوں نے 1894 میں حیدرآباد میں علوم و فنون کی نظامت قائم کی جہاں شبلی نعمانی کو بطور سیکرٹری تعینات کیا گیا۔ (بلگرامی اسی سال ریٹائر ہوئے تھے۔) وہ درجن بھر علمی کتابوں کے مصنف اور مترجم بھی تھے جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کے دوران بہت سے لوگوں نے غور سے ان کا مطالعہ کیا۔ لیکن تمدنِ عرب کے حوالے خال خال ہی ملتے ہیں، اور اس کا دوسرا ایڈیشن کہیں 1936 میں شائع ہوا۔ میں نے اسی دوسرے ایڈیشن کے ایک نئے ری پرنٹ کو استعمال کیا ہے؛ اس میں نواب جیون یار جنگ کا لکھا ہوا ایک کارآمد سوانحی نوٹ بھی شامل ہے۔

22 میں نے درج ذیل ری پرنٹ کو استعمال کیا ہے: گستاو لی بان، تمدنِ ہند، مترجمہ سید علی بلگرامی (کراچی: بک لینڈ، 1962)۔ اس سے پہلے کے کسی ری پرنٹ کا اب تک کوئی حوالہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

23 جرجی زیدان، تاریخ تمدنِ اسلام (دو جلدوں میں)، مترجمہ محمد حلیم انصاری (کراچی: شیخ شوکت علی، 1964)۔ مجھے پتا نہیں چل سکا ہے کہ حلیم انصاری کا ترجمہ کس نے شائع کیا تھا، اور نہ اس کا پہلا ایڈیشن دیکھنے کو ملا ہے۔ اسی سال یعنی 1907 میں زیدان کی تیسری جلد کا ترجمہ بھی شائع ہوا۔ مترجم اسلم جیراجپوری تھے۔ یہ لوہیا ٹائپ میں ہے اور سرورق پر "مدرسۃ العلوم" لکھا ہے۔ مقام کی وضاحت نہیں۔ اغلباً یہ علیگڑھ سے ہی شائع ہوئی تھی گو باقاعدہ کالج کی مطبوعہ نہ رہی ہو۔

24 زیدان کے جریدے نے ابوالکلام آزاد کے 1912 میں شروع ہونے والے اسی نام کے اردو جریدے کے لیے تحریک فراہم کی اگرچہ اس کا اعتراف کبھی نہیں کیا گیا۔ آزاد کے الہلال کی عثمانی خلافت سے اتنی ہی گہری وابستگی تھی جتنی زیدان کے جریدے کی، اور اس کی وضع قطع، جو اردو کے واسطے بالکل نئی تھی، اس کی

Scanned with CamScanner

عربی اصل کے بہت قریب تھی۔ اردو کے محققوں نے آزاد پر زیدان کے اثرات کو قطعاً نظر انداز کیا ہے، لیکن ایان ایچ ڈگلس (Ian H. Douglas) نے اپنی کتاب *Abul Kalam Azad: An Intellectual and Religious Biography* (مرتبہ گیل مینو اور کرستیان ڈبلیو ٹرول، نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1988) میں صفحہ 141 پر اس امر کی مختصر نشان دہی کی ہے۔ زیدان کے بارے میں میری معلومات کا ماخذ تامس فلپ کی کتاب *Gurgi Zaidan: His Life and Thought*، بیروت: اورینٹ انسٹیٹیوٹ، 1979) ہے۔

25 شبلی نے اس تاریخ کی پہلی جلد پڑھنے کے بعد، اگلی جلدوں کی اصلاح کے لیے کچھ تجویزیں پیش کی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''ایک امر کا اظہار کرنا اس موقعے پر ضرور ہے۔ مصنف نے جب اس کتاب کا پہلا حصہ مجھ کو بھیجا تو میں نے اجمالاً کتاب کی تعریف کی۔ لیکن چونکہ میں مصنف کی عادت سے واقف تھا اس لیے میں نے اس کو خط لکھا کہ آپ کو واقعات میں کتابوں کے حوالے دینا چاہیے۔ چنانچہ مصنف نے میرے اس خط کو تمدنِ اسلام کے دوسرے حصے میں نقل کیا ہے اور میری تحریک کے مطابق پچھلے حصوں میں حوالے دیے ہیں۔ لیکن اس میں یہ چالاکی کی کہ چھاپے کی تعیین نہیں کرتا۔ اکثر کتابیں مصر میں بار بار چھپی ہیں۔ مصنف ان کے حوالے دیتا ہے اور یہ نہیں بتاتا کہ کون سے چھاپے کے صفحے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن الاثیر، مسعودی وغیرہ کے جو کثرت سے مصنف نے حوالے دیے ہیں، میں نے مقابلہ کیا تو میرے پاس جو نسخے ہیں ان میں وہ عبارتیں نہیں ملیں۔ لیکن مصنف یہ کہہ سکتا ہے اس نے کسی اور نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ اس کارروائی کی وجہ سے مصنف کی بہت سی خیانتوں کا پردہ رہ گیا۔ ورنہ جن کتابوں میں اس کے حوالے میرے نسخے سے مطابق نکلے، ان میں ایک موقع بھی مجھ کو ایسا نہیں ملا کہ مصنف نے سخت خیانت نہ کی ہو۔'' (شبلی نعمانی، ''تمدنِ اسلام مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری''، مشمولہ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ری پرنٹ 1956)، جلد 4، صفحہ 139، فٹ نوٹ)۔

26 اپنے مقالے کے ایک اور فٹ نوٹ میں شبلی نے کہا: ''جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف نے یہ کتاب چار حصوں میں لکھی ہے جس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے درپردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔... نوبت یہاں تک پہنچی کہ [ندوہ کے؟] فاضل کے امتحان میں اس کے داخل نصاب کرنے کی رائے دی گئی۔'' (ایضاً، صفحہ 133)۔

27 جرجی زیدان کے اردو میں ترجمہ شدہ ناولوں کے نام میرے بچپن میں ناشروں کی فہرست کتب میں ہمیشہ

Scanned with CamScanner

شامل ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک جامعہ ملیہ میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ 1907 میں شائع ہوا تھا، اصل عربی اشاعت کے صرف دو برس بعد، اور اس کا ترجمہ ندوہ کے انھی محمد حلیم انصاری کا کیا ہوا تھا۔ (اس اطلاع کے لیے میں جامعہ کے پروفیسر شمیم حنفی اور سرور الہدیٰ کا ممنون ہوں۔) شرر کا پہلا تاریخی ناول 1888 میں شائع ہوا، یعنی زیدان سے تین سال پہلے، اور ان کے ناولوں کی مقبولیت نے اردو میں زیدان کے ناولوں کی قبولیت کی راہ ہموار کی ہوگی۔ 1900 میں اپنے باپ کی طرف سے زیدان کے ناول پانے پر ایک نوعمر لڑکی کی مسرت کے لیے دیکھیے ساحل احمد، یگانہ (الہ آباد: اردو رائٹرز گلڈ، 1986)، صفحہ 341۔ لی بان اور زیدان کی کتابیں اب بھی کچھ حلقوں میں توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ 24 جولائی 2009 کے اخبار جنگ میں کسی محمد بلال کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں ان دونوں کی کتابوں کا حوالہ بہت جوش سے دیا گیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ ''ہر سائنس کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی اور ہر علم وفن کا سراغ مسلمانوں نے لگایا۔ چودھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے سارے علوم وفنون میں عربی زبان میں کتابیں لکھ کر دنیا کی رہنمائی کی۔ اس بات کی تصدیق خود غیر مسلم مورخین نے بھی کی۔'' اس کے بعد جو دو نام انھوں نے دیے ہیں وہ ہیں گستاوی بان اور جرجی زیدان۔

28 شبلی نے اپنے مقالے ''ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر'' میں لکھا ہے: ''تمدن کا سب سے مقدم اثر یہ ہوتا ہے کہ ضروریاتِ معاشرت بڑھتے جاتے ہیں۔ مثلاً سادہ زندگی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھے اور کیلے کے پتے پر رکھ کر کھانا کھایا۔ تمدن آتا ہے تو یہ سامان ساتھ لاتا ہے کہ چاندنی کا فرش ہے، اس پر زیرانداز، زیرانداز پر طشت یا سیلابچی۔ آدمی نے آفتابہ ہاتھ میں لے کر ہاتھ دھلوا دیے۔ پھر دسترخوان بچھایا گیا، رنگ برنگ کے مختلف برتنوں میں کھانے آئے، کھانوں کی مناسبت سے ہر ہر برتن کا رنگ اور صورت شکل مختلف ہے۔'' (شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، جلد 6، (اعظم گڑھ، 1989 ری پرنٹ)، صفحہ 212۔

29 ''آصف الدولہ کی عمارتوں پر یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیت میں خالص ایشیائی ہیں جن میں نمائشی نہیں اصلی وحقیقی شان وشوکت پائی جاتی ہے۔'' (شرر، صفحہ 75)۔ ''نواب سعادت علی خاں کو... مکانوں اور عمارتوں کا شوق تھا مگر افسوس ان کا یہ شوق کلکتہ وغیرہ میں رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتوں کو دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہوگیا کہ ان کے عہد کی عمارتوں سے وہ پرانی خصوصیتیں جدا ہوگئیں اور اس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا۔ (شرر، صفحہ 80)

30 H&H، صفحہ 9۔

31 شبلی، جلد 6، صفحہ 212۔ شبلی لمحے بھر کو بھی یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہندوستان کی بابت بابر کے بیان کو جوں کا توں

Scanned with CamScanner

تسلیم کر لیا جائے تو یہ اس سے پہلے کے تمام مسلمان حکمرانوں کے خلاف ایک فردِ جرم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ انھوں نے مسلمان 'تمدن' کے 'تہذیب پھیلانے' یا 'مہذب بنانے' کے فرض کو پورا کرنے میں کوتاہی برتی۔

32 ''حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اس کی منتخب صحبت مٹیا برج میں چلی گئی تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا تھا، مٹیا برج لکھنؤ تھا۔'' (شرر، صفحہ 108)۔

33 خاص قسم کے تمباکو کی تیاری میں اصغر علی اور احمد حسین (شرر، صفحہ 304)، کتابوں کی اشاعت کے میدان میں نول کشور (شرر، صفحہ 149)، خطاطی کے شعبے میں جعفر حسین اور علی حسین (شرر، صفحہ 150)، اور رکابداری کے سلسلے میں متعدد لوگوں کی کامیابیاں اس کی مثالیں ہیں۔ شرر کو لکھنؤ میں اپنے ہم عصروں کی اردو پر بھی ناز ہے اور اس شعبے میں وہ کسی 'زوال' کے آثار نہیں دیکھتے۔

34 مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1981)۔ جعفر حسین کی کتاب بھی 1970 کی دہائی میں مضامین کے ایک طویل سلسلے کے طور پر شروع ہوئی تھی۔

35 جعفر حسین، صفحہ 8-7۔ جعفر حسین کے نزدیک لکھنؤ نے دنیا کو جو تہذیبی تحفے دیے ان میں سے چند یہ ہیں: دوپلّی ٹوپی، چوڑی دار پاجامہ، مخمل کے لحاف، زرد مخملی جوتے، تنجن، مزعفر، شیر مال، السلام علیکم کے بجائے آداب اور تسلیمات، صحت زبان پر زور، مرغ بازی اور بٹیر بازی، اور تعلیم یافتہ اور اعلیٰ پائے کی طوائفیں۔

36 تاہم جعفر حسین نے دہلی کے ادیبوں کی خدمات کا اتنا اعتراف تو کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ثقافتی میراث کے بارے میں لکھ کر اسے محفوظ کر لیا، جبکہ اس کے برعکس لکھنؤ کے ادیبوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

37 جعفر حسین، صفحہ 9۔ ایک اور جگہ (صفحہ 254) وہ واضح کرتے ہیں کہ ان کی مراد بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں سے ہے۔

کتابیات

ساحل احمد، یگانہ (اردو رائٹرز گلڈ، 1986)۔

گستاولی بان، تمدنِ ہند، ترجمہ: سید علی بلگرامی (کراچی: بک لینڈ، 1962)۔

گستاولی بان، تمدنِ عرب، ترجمہ: سید علی بلگرامی (سرگودھا: ظفر ٹریڈرز، 1975)۔

مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1981)۔

Scanned with CamScanner

ممتاز منگلوری، شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، 1978)۔

رابرٹ اے نائے (Robert A. Nye)، *The Origins of Crowd Psychology: Gustave LeBon and the Crisis of Mass Democracy in the Third Republic*، (لندن: سیج پبلیکیشنز، 1975)۔

ٹامس فلپ (Thomas Philipp)، *Gurgi Zaidan: His Life and Thought.* (بیروت: اورینٹ انسٹیٹیوٹ، 1979)۔

جعفر رضا، عبدالحلیم شرر (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1988)۔

عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، مرتبہ: رشید حسن خاں (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ، 2000)۔

عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، مرتبہ: اکرام چغتائی (لاہور: سنگ میل، 2006)۔

عبدالحلیم شرر، *Lucknow: The Last Phase of an Oriental Culture*، ترجمہ و ترتیب: ای ایس ہارکورٹ (E. S. Harcourt) اور فاخر حسین (بولڈر: ویسٹ ویو پریس، 1975)۔

شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، جلد 4 (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، 1956، ری پرنٹ)۔

شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، جلد ۷ (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، 1989، ری پرنٹ)۔

جرجی زیدان، تاریخ تمدنِ اسلام (دو جلدوں میں)، ترجمہ: محمد حلیم انصاری (کراچی: شیخ شوکت علی، 1964)۔

Scanned with CamScanner

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

آداب کی پابندی بمقابلہ انفرادیت

دہلی اور لکھنؤ میں وضعداری کی مختصر تاریخ

(اپنے وضعدار دوست نیر مسعود کے نام)

باربراڈیلی منکاف اپنی کتاب *Moral Conduct and Authority: The Place of Adab in South Asian Islam* کے تعارف میں لکھتی ہیں:

> درست نظم وضبط، صحیح طرزِ عمل اور بجا ذوق سے متعلق تمام فیصلوں میں 'ادب' انسانی قوتِ ارادی کے استعمال کو بہت اونچا مقام دیتا ہے۔ یہ تہذیب یافتہ طرزِ عمل اور بدتہذیبی سمجھے جانے والے طرزِ عمل کے درمیان ظاہر یا مضمر انداز میں تمیز کرتا ہے، اور موخر الذکر کو اکثر زمانۂ قبل از اسلام کے رواج کے طور پر بیان کرتا ہے۔[1]

لیکن مسلمانوں کی اکثریت کا خیال کچھ بھی ہو، قبل از اسلام دورِ جاہلیہ بھی تہذیبی آداب سے عاری نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعثتِ اسلام سے چند صدیوں بعد ہی ان آداب کے جاتے رہنے کو نہ صرف نوٹ کیا گیا بلکہ اس پر افسوس بھی ظاہر کیا گیا۔

الہجویری، جو جنوبی ایشیا میں لاہور کے داتا صاحب کے نام سے جانے جاتے ہیں، کشف

Scanned with CamScanner

المحجوب کے معروف مصنف ہیں جو تصوف کا اولین معلوم فارسی متن ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں وہ اپنے زمانے کے انسانی معاشرے کی افسوسناک حالت کی مذمت کرتے ہیں، اور پھر اپنے ایک پیشرو صوفی کی یہ بات اپنی تائید کے ساتھ نقل کرتے ہیں: ''ہمیں ایک ایسے زمانے کا سامنا ہے جس میں نہ اسلام کے آداب ہیں اور نہ جاہلیت کے اخلاق اور نہ مروّت کے اہلام۔''[2]

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، بیشتر اسلامی سرزمینوں کی اشرافی ثقافتوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ ادب اور اخلاق کے متون تیار کیے گئے جن میں وہ آداب بیان کیے جاتے تھے جن کی پاسداری ان ثقافتوں کے ارکان سے ان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں میں مطلوب ہوتی تھی۔ ایسے متعدد متن نوعمر اشرافی مردوں کی تعلیم کا لازمی حصہ ہوتے تھے اور ان میں سے کئی ایک کو اپنے زمان و مکاں سے باہر بھی تسلیم کیا اور پڑھا جاتا رہا۔ مجموع النوادر جس کا زیادہ معروف عنوان قابوس نامہ ہے (گیارھویں صدی)، چہار مقالہ (بارھویں صدی)، اخلاقِ ناصری (تیرھویں صدی)، اخلاقِ محسنی (پندرھویں صدی) اور اخلاقِ جلالی (سولھویں صدی) ایسی کتابیں ہیں جو اناطولیہ سے ہندوستان اور وسط ایشیا تک[3] فارسی خواں برادریوں میں وسیع پیمانے پر پڑھی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں جب ہندوستان میں لیتھو کی چھپائی شروع ہوئی تو دو کتابیں اخلاقِ ناصری اور اخلاقِ محسنی سب سے پہلے چھپنے والی کتابوں میں شامل تھیں اور برسوں تک اسکولوں اور کالجوں میں فارسی زبان کے نصاب کا مستقل حصہ رہیں۔

اگر آداب کو متعین کرنے اور ان پر عمل کرنے کی خواہش اتنی شدید تھی تو ایک سوال لازماً پیدا ہوتا ہے: انھی اشرافی گروہوں کے وہ افراد کیا کرتے تھے جو دوسروں سے مختلف ہونے کی خواہش رکھتے تھے، یعنی دوسرے لفظوں میں جو یہ محسوس کرتے تھے کہ معاشرے کا ادب آداب پر اصرار انھیں ناگوار تسلیم و رضا کا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے؟ آداب کی پابندی کرنے والے سماج میں ایسا کوئی فرد اپنی انفرادیت کے واضح اظہار کے لیے کیا طریقہ اختیار کر سکتا تھا کہ — خود اپنی نگاہوں میں — پوری طرح 'مہذب' کہلانے کے دعوے سے محروم نہ ہو جائے؟

یہاں بھی مجھے صوفیانہ ادب سے ایسی مثالیں تلاش کرنے میں بہت مدد ملی جہاں کسی فرد نے، اپنے طرزِ عمل کو غلط سمجھے جانے کا خطرہ لے کر، اپنے منتخب کردہ اخلاقی اصول پر اصرار کیا۔ اس قسم کی

Scanned with CamScanner

پہلی مثال الہجویری کی کتاب کے اس حصے میں ملتی ہے جہاں ملامتیوں کا احوال بیان کیا گیا ہے جن میں نویں صدی کے صوفی ابو یزید بسطامی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ الہجویری لکھتے ہیں:

> [ایک بار جب ابو یزید] حجاز سے واپسی پر شہر رے میں داخل ہو رہے تھے، شہر کے لوگ انھیں اعزاز دینے کے لیے دوڑ کر ان کے استقبال کو پہنچے۔ ان کی توجہ سے ابو یزید کے استغراق میں خلل پڑا اور ان کا دھیان خدا کی طرف سے ہٹ گیا۔ جب وہ بازار میں پہنچے تو انھوں نے اپنی آستین سے روٹی نکالی اور کھانے لگے۔ سب لوگ ان سے دور ہٹ گئے کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے، جو ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا، کہا: 'دیکھا، میں نے ابھی شریعت کے ایک جز پر عمل کیا تو ان سب نے مجھے رد کر دیا۔'[4]

ابو یزید نے ماہِ رمضان کا ضابطہ نہیں توڑا تھا۔ سفر کی حالت میں ان پر روزہ رکھنا فرض نہ تھا۔ علاوہ ازیں، اپنے اس عمل سے وہ اس اخلاقی حکم کی بھی پابندی کر رہے تھے کہ مذہبی معاملات میں شدت پسندی سے احتراز کیا جائے۔ اس کے علاوہ قدیم اسلامی اخلاقیات کی بحثوں میں ظاہر اور باطن کی جو ثنویت کارفرما رہتی تھی، اس کی رو سے بھی ابو یزید نے 'باطن' کی آواز پر توجہ دی اور 'ظاہر' کو نظر انداز کر دیا۔ تاہم شہر رے کے باشندوں کو صرف وہی دکھائی دیا جو ظاہر تھا، چنانچہ انھوں نے ابو یزید کو رد کر دیا۔

دوسری مثال کا تعلق اس قرآنی قصے سے ہے جس میں خدا نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ نو تخلیق شدہ آدم کو سجدہ کریں۔ بعض صوفیوں نے راندۂ درگاہ فرشتے یعنی ابلیس کو سب سے بڑا موحد قرار دیا ہے، کیونکہ اس نے خدا کے حکم پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اینا ماری شمل لکھتی ہیں:

> ... احمد غزالی (متوفی 1126) نے، جو ابلیس کی بحالی کے کلاسیکی موئید ہیں... یہ تک کہنے کی ہمت کر ڈالی کہ 'جو ابلیس سے توحید کا سبق نہیں لیتا وہ کافر ہے' — اس بات پر کٹر عقیدہ پرست طیش میں آ گئے لیکن انھیں بعد کی متعدد صوفیانہ تحریروں میں اس کی گونج سنائی دی۔[5]

جہاں تک میں ان دونوں واقعات کو سمجھ پایا ہوں، ابو یزید نے اپنی انفرادیت کا تحفظ دکھاوے کی پارسائی کو مسترد کر کے اور وہ طرز عمل اختیار کر کے کیا جو خود ان کی نظروں میں مناسب

Scanned with CamScanner

طرزِ عمل تھا، خواہ اس سے کٹر عقیدہ پرست کتنے ہی برہم کیوں نہ ہوں۔ دوسری جانب ابلیس نے اپنی انفرادیت پر زور دینے کے لیے اپنے اوپر وہ پابندی عائد کی جسے خدا نے خود ہی اٹھالیا تھا، حالانکہ اس عمل کی بنا پر وہ ابدی لعنت کا سزاوار ٹھہرا۔ پہلی مثال میں مطلوبہ 'ادب' کو اضافی حیثیت دے دی گئی — یعنی اسے وقت اور مقام کے بارے میں زیادہ حساس بنایا گیا — جبکہ دوسری مثال میں متعلقہ 'ادب' کو ناقابلِ تغییر بنا دیا گیا، خواہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اگرچہ ان دونوں مثالوں کے کرداروں کا طرزِ عمل اپنے 'ظاہر' میں قابلِ اعتراض تھا، لیکن اہلِ علم و تصوف نے دونوں کے طرزِ عمل کو پارسائی سے تعبیر کیا اور انھیں ان کی 'باطنی' خصوصیت کی بنا پر استثنائی قرار دیا۔

اپنے طرزِ عمل میں دوسروں سے مختلف ہونے، ہمہ گیر اور غیر شخصی آداب کی عائد کی ہوئی تقلید کو ترک کرنے کی یہ آرزو اشرافی اسلامی ثقافتوں میں بھی ضرور ظاہر ہوتی رہی ہو گی اور یہ امر صرف صوفیوں تک محدود نہ رہا ہو گا۔ اپنے مضمون کے بقیہ حصے میں میں انیسویں صدی میں لکھنؤ کی شمالی ہندوستانی ثقافت سے اس قسم کی ایک مثال کو تفصیل سے پیش کروں گا جہاں اس آرزو نے 'وضعداری' کے عنوان سے اپنا اظہار پایا۔

اسمِ مجرد 'وضعداری' اسمِ صفت 'وضعدار' سے مشتق ہے، جس کا لغوی مطلب ہے ایسا شخص جو اپنی خاص وضع، یعنی انداز، اسلوب، قطع یا ہیئت رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں 'وضعدار' وہ شخص ہے جس میں کوئی ممتاز ہیئت یا انداز ظاہر یا مجسم ہوا ہو۔ تاہم انیسویں صدی کی لکھنوی ثقافت میں 'وضعدار' اس سے کہیں زیادہ معنی رکھتا تھا۔ 1908 میں شائع شدہ ایک کتاب سے ایک اقتباس دیکھیے:[6]

> اودھ کے آخری بادشاہ کے عہد میں جس وقت یہاں کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا، مرزا علی رضا بیگ کوتوال شہر بھی بڑے وضعدار گذرے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک سید صاحب سپاہی منش بہت ہی پریشان حال تھے۔ ایک روز ان کی بی بی نے کہا کہ تم سپاہی ہو، کہیں فکرِ معاش میں جاؤ، گھر میں بیٹھے ہوئے کب تک مصیبت اٹھاؤ گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اب شریف کے قدردان نہیں رہے۔ بی بی نے کہا کہ سنتی ہوں، علی رضا بیگ کوتوال بڑے شریف پرور ہیں۔ میر صاحب

Scanned with CamScanner

نے کہا، سنا کرو۔ آخر بی بی نے مجبور کر کے کوتوال صاحب کے پاس بھیج ہی دیا۔ میر صاحب مسلح ہو کر کوتوال صاحب کی صحبت میں گئے اور ان کا پہلو دبا کر بیٹھ گئے۔ حاضرین صحبت کو ان کی یہ حرکت ناگوار گذری اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوتوال صاحب نے بعداً ستفسار مزاج نام ونشان دریافت کیا۔ جب یہ بتا چکے، کوتوال صاحب نے دل لگی سے ان کی بیوی کا نام پوچھا۔ میر صاحب سپاہی منش آدمی، سادات ہونے پر غرہ، یہ سوال ناگوار گذرا، اور جواب دیا کہ بی بی کا نام تو اس وقت یاد نہیں رہا، ہاں سالے کا نام علی رضا بیگ کوتوال مشہور ہے۔ یہ جملہ تمام کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھی اپنے گھر کی راہ لی۔ کوتوال صاحب کی صحبت کے لوگوں نے چاہا کہ ان سے اس گستاخی پر باز پرس کریں مگر انھوں نے منع کیا اور کہا، افسوس، تم نے اس شخص کو پہچانا نہیں۔ دیکھو کیسی وضعداری اور جواں مردی سے اس نے اپنی بی بی کا نام مردوں کی صحبت میں اخفا کیا اور کس بہادری سے مجھے میری صحبت میں اپنا سالا بنا گیا۔ میں بھی اگر وضعدار ہوں تو اس کے قول کو نباہ کے دکھادوں گا۔ دوسرے ہی روز کوتوال صاحب پانچ سو روپیہ نقد اور کچھ تھان مشروع اور کمخواب کے کشتیوں میں لگا کر میر صاحب کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے اور دق الباب کیا۔ میر صاحب گھر ہی میں موجود تھے۔ دریافت کیا، کون ہے؟ جواب دیا، آپ کا سالا علی رضا بیگ۔ میر صاحب بھی وضعدار تھے، جب ان کی بات کو کوتوال صاحب نے اصلی رنگ میں رنگا تو پھر یہ کب اپنی بات سے پلٹتے، فوراً پکار کے کہا کہ سالے سے پردہ کیا، تشریف لائیے۔ کوتوال صاحب مکان میں داخل ہوئے۔ میر صاحب کی بی بی ایک غیر شخص کو دیکھ کر چھپنے لگیں، مگر میر صاحب نے کہا، کیوں چھپتی ہو، یہ تو تمھارے بھائی ہیں۔ کوتوال صاحب نے اپنی (منھ بولی) بہن کے آگے کشتیاں رکھوادیں اور کہا کہ اپنے بھائی کا یہ ہدیہ قبول کرو۔ کشتیاں رکھوادی گئیں اور کچھ دیر کے بعد کوتوال صاحب رخصت ہوئے۔ اُس دن سے اپنی بہن کے یہاں اکثر آیا جایا کیے، بلکہ ایک معقول مشاہرہ بھی ان کا مقرر کر دیا اور برابر ماہ بہ ماہ دیتے رہے۔۔۔۔

کچھ دن بعد کوتوال صاحب کو ایک مہم پیش آئی۔ بادشاہ نے بجائے فوجی افسر کو معین کرنے کے حض ان کی شجاعت اور دلیری کی وجہ سے ان کو ایک سرکش راجہ کا سر کاٹ کر لانے کا حکم دیا۔ یہ اپنے سپاہیوں کو لیے ہوئے مہم پر روانہ ہوئے اور امتحاناً میر صاحب کو خبر نہ کی۔ ان کو یقین تھا کہ میر صاحب سا شجاع اور وضعدار آدمی اس خبر کو سن کر کبھی قدم پیچھے نہ رکھے گا۔ کوتوال صاحب

Scanned with CamScanner

راستے بھر پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے جاتے تھے مگر میر صاحب کا پتا کہاں۔ جب کوتوال صاحب نے کئی بار مڑ مڑ کے دیکھا تو کسی منہ چڑھے سپاہی نے عرض کی کہ حضور بار بار کیا دیکھتے ہیں؟ جواب دیا کہ میر صاحب کو۔ سپاہی نے کہا کہ ایسے جان جوکھم کے وقت کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ حضور نے اُس صحبت میں ان کی وضعداری اور بہادری کی نسبت یوں ہی رائے قائم کر لی تھی۔ کوتوال صاحب کچھ منغض سے معلوم ہوئے، گویا ان کو اس وقت بھی اپنے خیال سے پلٹنے میں تکلیف معلوم ہوئی۔ اسی گفت وشنود میں منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ اس وقت کوتوال کی منتظر نگاہیں بڑی بے چینی اور بے صبری کے ساتھ اِدھر اُدھر میر صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ یکا یک یہ خبر ملی کہ رات کو کوئی شخص راجہ کا سر کاٹ لے گیا۔ کوتوال صاحب نہایت ہی خوش ہوئے اور فخریہ سپاہیوں کی طرف مخاطب ہو کے کہا کہ بس اب چلو، میر صاحب اپنا کام کر گئے۔ واپس آتے ہی میر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ میر صاحب اس وقت گھر میں نہ تھے۔ ان کی بی بی سے میر صاحب کو پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ کہیں باہر ہی گئے ہیں اور رومال میں بندھی ہوئی کوئی چیز آپ کے واسطے رکھ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ رومال پیش کر دیا۔ کوتوال صاحب رومال لے آئے اور اسے کھول کر سپاہیوں کو راجہ کا سر دکھایا، گویا اپنی صحیح رائے قائم کرنے کی داد چاہی۔

یہ قصہ سید محمد ہادی لکھنوی کی کتاب وضعدارانِ لکھنؤ سے نقل کیا گیا ہے۔ اپنے بیان میں مصنف نے اپنی طرف سے دو ذاتی تبصرے شامل کیے ہیں۔ ایک تبصرے میں وہ کوتوال کی تعریف کرتے ہیں کہ ''یہ کوتوال صاحب کی انتہائے وضعداری تھی کہ دوسرے کے قول کو نباہا،'' اور دوسرے میں میر صاحب کو سراہتے ہیں کہ ''یہ تھی میر صاحب کی سچی وضعداری جو وفاداری کی صورت میں ایسے اہم موقعے پر ظاہر ہوئی۔'' یہ بات دلچسپ ہے کہ ہادی لکھنوی کے نزدیک اپنے قصے کے دونوں کرداروں کی بعد کی وضعداری اتنی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ وہ روزمرہ آداب کی ان خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان سے ابتدا میں سرزد ہوئیں: مروج ادب کے لحاظ سے میر صاحب کو چاہیے تھا کہ مجلس کے حاشیے پر بیٹھتے اور بلائے جانے پر ہی کوتوال کے نزدیک پہنچتے، اور کوتوال کو ہرگز واجب نہ تھا کہ برسرِ محفل کسی دوسرے کی بیوی کا نام دریافت کرتا۔

جن دنوں، یعنی 1940 کی دہائی میں، میں لکھنؤ سے کچھ ہی دور واقع چھوٹے سے شہر بارہ بنکی میں بڑا ہو رہا تھا، 'وضعداری' اور 'وضعدار' اس وقت تک اس معاشرے میں زبان زدِ عام تھے۔ لیکن

Scanned with CamScanner

ان سے اس قسم کا طرزِ عمل مراد ہوتا تھا جیسا اسی کتاب میں مندرج ایک اور قصے میں ظاہر ہوتا ہے:

میر سید حسین ساکن محلہ نواز گنج ... اپنے ایک دوست کے یہاں ... روز جایا کرتے تھے اور گھنٹوں نشست رہتی تھی۔ دوست نے ایک دن تذکرۃً کہا کہ بھئی تمھارے نواز گنج کی بالائی اچھی ہوتی ہے، کبھی لیتے نہیں آتے۔ یہ کچھ ہوں ہاں کہہ کر چپ ہو رہے۔ دوست نے اکثر تذکرۃً کہا اور یہ اسی طرح بے توجہی سے سنتے رہے۔ ایک دن پھر دوست نے یاد دلایا تو کہا کہ کل سے ضرور آئے گی۔ میر صاحب جب تک زندہ رہے، روز پاؤ بھر بالائی لایا کیے۔ ان کے دوست نے لاکھ لاکھ منع کیا لیکن یہ اپنی وضع کے خیال سے لاتے ہی رہے اور یہی کہا کیے کہ یہ تو اب وضع میں داخل ہو گئی ہے۔ 7

جیسا کہ مجھے اُن دنوں بتایا جاتا تھا، اور جس طرح میں اب درج بالا قصے کے معنی سمجھتا ہوں، میر صاحب نے ایک ایسے عمل کو خود پر لازم ٹھہرا لیا جو تسلیم شدہ آداب کی رو سے ان پر پہلی بار کے سوا لازم نہ تھا۔ روایتی اصطلاح میں انھوں نے ایک 'واجب' — یعنی ضروری اور مناسب — عمل کو خود پر 'فرض' کر لیا، یعنی ایسا عمل قرار دے لیا جس کا انجام دینا لازم ہے اور جسے انجام دینے میں کوتاہی کو سنگین خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے۔ دوست کے پہلی بار فرمائش کرنے پر میر صاحب پر واجب تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے محلے کی یہ سوغات لے کر آتے؛ یہ بات بھی اتنی ہی مناسب ہوتی کہ اس کے بعد وہ یہ عمل کبھی کبھی جاری رکھتے۔ لیکن انھوں نے اسے خود پر فرض ٹھہرا کر اسے اپنی وضع قرار دے دیا۔ یہ امر کہ بعد میں اپنے دوست کے بار بار منع کرنے پر بھی وہ اپنی وضع پر قائم رہے، اس پر دلالت کرتا ہے کہ وضعداری روزمرہ کے عام آداب پر فوقیت رکھتی تھی۔

مبادا آپ سمجھیں کہ یہ محض خبطی پن ہے، انھی میر سید حسین کا ایک اور قصہ سنیے:

زمانۂ غدر میں ایک صاحب (انگریز) کی لڑکی کو اس کی آیا لے کر جان کے خوف سے بیلی گارڈ کے تہہ خانے میں چھپ رہی اور پھر وہاں سے نکلنے کا موقع نہ پایا۔ بیچارے صاحب اور میم صاحب رات بھر غم سے تڑپا کیے۔ صاحب کی یہ حالت دیکھ کر ان کے خانساماں نے کہا، آپ گھبرائیے نہیں، میں پتا لگاتا ہوں۔ یہ کہہ کر ڈھونڈنے چل کھڑا ہوا۔ خانساماں میر سید حسین کے پاس اکثر آیا کرتا تھا اور ان کی وضعداری اور شجاعت سے بھی خوب واقف تھا۔ ایک رات کو ان

کے دروازے پر آموجود ہوا۔ میر صاحب نکلے اور دریافت کیا کہ خیریت تو ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کے پاس ایک حاجت لے کے آیا ہوں۔ ہمارے صاحب کی لڑکی اور اس کی آیا کھو گئی ہے۔ یہ پتا چلتا ہے کہ بیلی گارڈ کی طرف آئی تھی۔ وہاں ہزاروں لاشیں پڑی ہیں، تنہا جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اگر آپ مدد کریں تو کامیاب ہو سکتا ہوں۔ میر صاحب سے کوئی مدد مانگے اور وہ انکار کریں! بے ساختہ زبان سے نکلا کہ اچھا۔ پھر کیا تھا، فوراً ساتھ ہوئے۔ لاشوں پر سے گذرتے ہوئے اوران میں آیا اور بچے کو تلاش کرتے ہوئے بیلی گارڈ پہنچے۔ تہہ خانے کے اندر بھی آپ ہی تشریف لے گئے اور عورت اور بچے کو ڈھونڈ نکالا اور خانساماں کو اس کے صاحب کے جائے قیام تک پہنچا کر لوٹ آئے۔ صاحب نے خانساماں سے دریافت کیا کہ کیونکر پتا لگا؟ اس بھلے آدمی نے کہا کہ میر سید حسین ایک شخص ہیں، انھوں نے ڈھونڈ دیا۔ صاحب نے ان کا نام اور پتا یادداشت کے طور پر لکھ لیا۔ تسلط کے بعد میر صاحب کے نام طلبی کا ٹکٹ آیا۔ آپ ڈپٹی کمشنر کے اجلاس پر تشریف لے گئے۔ انھوں نے کہا کہ تم نے بہت اچھا سرکار کی خیر خواہی کا کام کیا ہے، اس لیے سرکار تمھیں اس قدر جاگیر انعام میں دیتی ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، فلاں خانساماں نے کیا ہے۔ میں اس جاگیر و انعام کا مستحق نہیں ہوں۔ خانساماں طلب ہوا۔ اس بھلے آدمی نے کہا، جو کچھ کیا میر صاحب ہی نے کیا۔ مگر میر صاحب نے ایک نہ مانی اور وہ سب جاگیر و انعام خانساماں ہی کو دلوا دیا۔[8]

ہادی لکھنوی اس واقعے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: ''وضعداری اس کا نام ہے کہ ایک ادنیٰ خانساماں، جو آمد و رفت کی وجہ سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ میر صاحب ہمارے وقت پر کام آئیں گے، ایک بجے رات کو آ کر جگاتا ہے اور یہ نکل آتے ہیں اور ایسے خطرناک کام کی ہامی بھرتے ہیں اور پھر اس کو اس خوبی سے انجام تک پہنچاتے ہیں۔ اللہ ری وضعداری!''

اب ہم ہادی لکھنوی کے اپنے بیان کی طرف آتے ہیں جنھوں نے اپنی ایک صدی پہلے کی تحریر میں بتایا کہ وضعداری کے ان کے نزدیک کیا معنی تھے۔ اپنے تعارف میں پہلے وہ سوال کرتے ہیں، ''وضعداری ہے کیا؟'' اور پھر کہتے ہیں:

اچھے قول و فعل کی پابندی۔ یہ صفت اس زمانے میں تو معدودے چند آدمیوں میں پائی جاتی

Scanned with CamScanner

ہے مگر کبھی اس کا تعلق ہر شریف سے روح وتن کی طرح تھا۔ ''سر جائے، سودا نہ جائے'' انھیں لوگوں کا مقولہ ہے۔ ''قولِ مرداں جان دارد'' انھیں لوگوں کا اصول۔ بعض نافہموں کا خیال ہے کہ ہر اچھے بُرے قول وفعل کی پابندی کو وضعداری کہتے ہیں۔ اگر کسی کو جوا کھیلنے کی لت ہو اور عمر بھر جوا کھیلا کرے، کسی کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو اور ہر وقت جھوٹ ہی بولا کرے، اس کو بھی وضعداری کہیں گے؛ حالانکہ یہ بدوضعی ہے۔ جو شخص بات بات پر میان سے تلوار گھسیٹتا ہو اس کو شجاع نہیں کہتے، بگڑے دل کہتے ہیں۔ عزت وآبرو بچانے کے وقت، مال ومتاع کی حفاظت کے وقت، حریف سے مقابلے کے وقت تلوار سے کام لینا البتہ شجاعت ہے۔ اسی طرح اچھے قول وفعل کی پابندی وضعداری کہلاتی ہے اور بُرے فعل کی بدوضعی۔

اس کے بعد وہ چند دلچسپ تفصیلیں پیش کرتے ہیں:

وضعداری کے موصوف میں جتنے اوصاف پائے جاتے ہیں، کسی دوسری صفت کے موصوف میں اُتنے اوصاف کا مجتمع ہونا بالکل ہی محال ہے۔ محبت، کفایت شعاری، وفاداری، مستعدی، اوقات کی پابندی، خودداری، حیلہ، دینداری، سب وضعداری ہی کے جلوے ہیں۔ وضعدار جب کسی کے ساتھ محبت کا لفظ استعمال کرے گا، مرتے مرتے نباہے گا۔ وضع اپنی ایسی رکھے گا جسے وہ ہمیشہ قائم رکھ سکے۔ اگر کسی وقت اس کی بہت بڑی آمدنی ہو جائے تو وہ متشیّن نہیں بنے گا بلکہ دوراندیشی سے کام لے کر نازک سے نازک حالت جو رفتارِ زمانہ سے ہو سکتی ہے، پیش نظر رکھے گا اور اپنے انداز سے باہر قدم نہ رکھے گا۔ وہ وعدہ کرنے میں جلدبازی نہیں کرے گا، اور جب وعدہ کر لے گا تو پھر جب تک دم میں دم ہے، اسے وفا کرے گا۔ وہ نہایت ہی مستعد اور پابندِ اوقات ہوگا، اس لیے کہ مستعدی نہ ہونے سے وضعداری ہاتھ سے جاتی ہے، کیونکہ بغیر اس کے قول کی پابندی ممکن نہیں، اور بغیر اوقات کی پابندی کے مستعدی ناممکن۔ وضعدار جس سے جس داشت سے ملے گا اس کو ہمیشہ قائم رکھے گا۔ وہ باحیا بھی انتہا کا ہوگا، اس لیے کہ یہ حیا ہی اس کی ایسی رفیقِ قلبی ہے جو خلافِ وضع افعال کی ممانعت کرتی رہتی ہے۔ وضعدار جس مذہبی عقیدے کو تسلیم کر لے گا، ایسا راسخ العقیدہ ہو جائے گا کہ قیامت میں بھی اُسی عقیدے پر اُٹھے گا۔9

ان تمام خصوصیات کی روشنی میں وضعداری ایک 'اسلوبِ حیات' معلوم ہوتی ہے جس کا انتخاب اس فرد نے اپنے لیے خود کیا ہو۔ بلکہ اپنا اسلوب چننے کا دانستہ عمل ہی وہ بات ہے جو اس فرد کو وضعدار بناتی ہے، لیکن 'حقیقت میں' وضعدار بننے کے لیے اس شخص کو سب سے بڑھ کر ایک صفت کا اظہار کرنا ہوتا ہے: مستقل مزاجی یا استواری۔ اس کے وضعدار طرزِ عمل میں کبھی تبدیلی نہیں آنی چاہیے؛ اسے بدلے ہوئے حالات کے تحت کیے جانے والے سمجھوتوں سے الگ رہنا چاہیے۔

1880 اور 1930 کے درمیانی عشروں کے دوران لکھنؤ کی اشرافی ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مرزا جعفر حسین کی کتاب قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کتاب میں ایک پورا باب وضعداری کے موضوع پر ہے اور اس میں وضعداری کے وہ مختلف نمونے پیش کیے گئے ہیں جو مصنف کے مشاہدے یا سماعت میں آئے۔[10] مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں: ''وضع کے معنی و مفہوم ہیں 'دستور اور ترتیب'۔[11] اس لیے وضعدار اس شخص کو کہنا چاہیے جو اپنی زندگی کے تمام کاروبار، رہن سہن، میل ملت میں ایک ترتیب رکھتا ہو اور متوازن طور پر ایام گذاری کرے۔ جس طرز کو اختیار کرے اسی پر ہمیشہ کاربند رہے۔''[12]

مرزا جعفر کے نزدیک وضعداری ہر طبقے کے افراد میں پائی جاسکتی ہے۔ کوئی وضعدار باورچی اپنا کوئی خاص پکوان صرف کسی خاص مربی کے لیے تیار کرے گا، اور زیادہ معاوضے کے لالچ میں اسے دوسرے لوگوں کو پیش نہیں کرے گا، اور کسی وضعدار دکاندار کو اگر معلوم ہو کہ کوئی چیز اس کی دکان کے کسی بندھے ہوئے گاہک کو پسند ہے تو وہ اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کرے گا۔[15] اس کے بعد مرزا جعفر حسین ایک واقعہ اپنے معنی خیز تبصرے کے ساتھ مفصل بیان کرتے ہیں:

> لکھنؤ کے رؤسا و عمائدین کی تمام معاشرت یوں تو ایک خاص ترتیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی کسی افتاد یا غیر معمولی واقعے یا کسی اتفاق کے سبب سے وہ ترتیب بگڑ جاتی تو اس بگڑی ہوئی صورت کو وہ اس طرح اپنا لیتے تھے کہ وہی ان کی مخصوص وضعداری ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ یا سانحہ یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حیدر حسین خاں مرحوم، جن کے نامِ نامی سے موسوم پھاٹک اب تک چوک میں موجود ہے، شام کے وقت محل سے ہواخوری کے لیے

Scanned with CamScanner

برآمد ہوے۔ اپنی گھوڑا گاڑی پر روانہ ہونے والے ہی تھے کہ مقابل سے آتے ہوے ایک شناسا بزرگ، جو اسی محلے میں رہتے تھے، ان کو آداب وتسلیمات بجالائے لیکن ساتھ ہی مسکرا بھی دیے، جو تہذیب سے گری ہوئی حرکت تھی۔ نواب مرحوم نے جوابِ سلام دیا اور آگے بڑھ گئے، لیکن ان کے مسکرادینے پر خیال جمارہا، جس کی وجہ سمجھنے کے لیے اپنی وضع قطع کا جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ ان کے انگرکھے کا تکمہ کھلا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت کے باعث یا کسی اور وجہ سے وہ تکمہ لگائے بغیر گھر سے برآمد ہی نہیں ہوے تھے بلکہ تکمہ لگانے کا خیال بھی محو ہو گیا تھا۔ ان کو بڑی خفت محسوس ہوئی جس کا ازالہ صرف اس طرح کیا گیا کہ پھر انھوں نے زندگی بھر انگرکھے کا تکمہ نہیں لگایا، اور یہی کھلی ہوئی گردن کا انگرکھا ان کی وضعداری میں داخل ہو گیا۔ اس واقعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلچر کی تعمیر میں اتفاقات کو بھی دخل تھا۔ وہی اتفاقات کبھی کبھی بے ترتیبی کو بھی قبول کرا کے عین ترتیب بنا دیتے تھے۔ [13]

'ادب' سے متعلق متون کے اپنے محدود مطالعے کے دوران میں نے مستقل مزاجی یا استقامت پر کہیں اتنی تاکید نہیں پائی، اور نہ مجھے ان میں کہیں 'وضعداری' کا لفظ ملا۔ چنانچہ اس تصور کی تاریخ کو کھنگالنے کی غرض سے میں نے فارسی اور اردو کی ان لغات سے رجوع کیا جو برصغیر میں تالیف کی گئی تھیں۔

ہندوستان میں مرتب کی جانے والی اہم ترین فارسی لغات سے — جن میں منتخب اللغات (سترھویں صدی) قدیم ترین، اور فرہنگ آنندراج (1888) تازہ ترین ہے — معلوم ہوا کہ ان میں بنیادی لفظ 'وضع' تو ہمیشہ درج ہوتا ہے لیکن اس سے بننے والا اسم صفت 'وضعدار' کہیں نہیں پایا جاتا، حالانکہ 'دار' کے لاحقے والے دوسرے لفظ ملتے ہیں۔ [14] لفظ 'وضع' کے جو مختلف معنی ان لغات میں درج ہیں وہ یہ ہیں:

فرہنگِ نفیسی:

'وضع': نہاد و جای و ترتیب و ساخت و بنا و طرز و روش۔

'وضیع': مردمِ فرومایہ و ناکس۔

Scanned with CamScanner

فرہنگِ آنندراج:

'وضع': طرز و روش، نیز وضع نہادن و بمعنی ترتیب و بمعنی ساختن نیز مستعمل۔

'وضیع': مردمِ فرومایہ دونی و از مرتبہ فرو افتادہ۔

منتخب اللغات:

'وضع': نہادن چیزی در جای و زائیدن و امانت نزدِ کسی گذاشتن۔۔۔و از مرتبہ خود افگندن چیزی را۔

'وضیع': خرمای تر کہ خشک نا شدہ و ظرف گذارند و فرومایہ و ناکس و امانت۔

اس لفظ کے مترادفات کے طور پر فارسی لغات میں 'طرز' یا 'روش' کے لفظ ملتے ہیں۔ ہندوستان کے فارسی دانوں نے غالباً وضعدار کو ایک آزاد، بامحاورہ اظہار کے طور پر درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔[15] تاہم میری توجہ ان میں درج لفظ 'وضیع' کی طرف مبذول ہوئی جو 'وضع' کے قریب ہی درج ہوتا ہے اور جس کا عربی مادہ وہی ہے جو 'وضع' کا ہے۔ 'وضیع' کو فارسی اور اردو دونوں میں 'شریف' کی ضد کے طور پر عام استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے میرا دھیان اس امکان کی طرف گیا کہ ''اپنی مخصوص وضع رکھنا''، بعض صورتوں میں ''قابلِ اعتراض وضع رکھنے'' کے معنی میں بھی برتا جاتا ہو۔

اردو کی اولین قابلِ ذکر لغت، جان شیکسپیئر کی *A Dictionary of Hindustani and English* پہلی بار 1817 میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اسے مرتب کی زندگی میں کئی بار نظرِ ثانی اور توسیع کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس کے تیسرے ایڈیشن میں، جو 1834 میں شائع ہوا، 'وضع' کے درج ذیل معنی دیے گئے ہیں:

"Situation, state, condition, manner, mode, procedure, position, conduct, behaviour."

اس میں 'وضعدار' کی ترکیب موجود نہیں۔

ایس ڈبلیو فیلن کی *A New Hindustani-English Dictionary, with Illustrations from Hindustani Literature and Folklore* کی اشاعت 1879 میں ہوئی تھی۔ اس میں 'وضع' کی ذیل میں لکھا ہے:

"(1) Nature; tenor. (2) Behaviour. 3. Mode; fashion; appearance.

Scanned with CamScanner

4. Style. 5. Description; character; complexion. 6. Deduction; retrenchment."

'وضع بدلنا' کے یہ معنی درج ہیں:

"to disguise oneself,"

اور اگرچہ اس لغت میں 'وضعدار' اور 'وضعداری' کے الفاظ موجود ہیں لیکن ان کے معنی بالترتیب "Stylish; elegant" اور "Style; manner; elegance," دیے گئے ہیں۔

اس کے پانچ برس بعد جان ٹی پلاٹس کی *A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English* شائع ہوئی۔ اپنی پیشرو لغات کے مقابلے میں یہ لغت بہت زیادہ وسیع تھی؛ لیکن اس میں 'وضعدار' کے معنی "Of good appearance or form, &c.; stylish, elegant," اور 'وضعداری' کے معنی "Goodness of form, &c., manner, style, elegance." ملتے ہیں۔

درجِ بالا صفات سے ایسا لگتا ہے کہ پوری انیسویں صدی کے دوران اردو میں بھی اسم صفت 'وضعدار' اور اس سے متعلق اسم مجرد 'وضعداری' سے محض کوئی ایسا شخص یا شے مراد ہوتی تھی جو کوئی خاص ظاہری انداز رکھتی ہو۔ لیکن فرہنگِ آصفیہ مولفۂ سید احمد دہلوی (پیدائش 1846) سے اس خیال کی تصحیح ہوجاتی ہے۔[16] وہ پہلے 'وضع' کے مانوس معنی درج کرتے ہیں، پھر اس سے مشتق دونوں الفاظ - 'وضعدار' اور 'وضعداری' کو شامل کرتے ہیں اور ان کے مترادفات کے دو الگ الگ مجموعے پیش کرتے ہیں۔ 'وضعدار' کے سلسلے میں مترادفات کے پہلے مجموعے میں بارہ معنی شامل ہیں جن کا تعلق ظاہری ہیئت سے ہے؛ ان میں پہلا 'سجیلا' ہے اور آگے چل کر 'طرحدار' اور 'بانکا' بھی ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ مترادفات کا دوسرا مجموعہ 'پابندِ وضع' سے شروع ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کی تفصیلی وضاحت آتی ہے: 'اپنی چال اور روش پر قائم رہنے والا'۔ پھر وہ اس کی مثال کے طور پر اپنا ایک شعر درج کرتے ہیں:

کیا دل چلے ہوتے ہیں وضعدارِ محبت
ہنستے ہوئے جاتے ہیں سرِ دارِ محبت

Scanned with CamScanner

اسی طرح 'وضعداری' کے معنی بھی دو الگ الگ مجموعوں کی شکل میں دیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی مثالوں کے طور پر سید احمد دہلوی نے جو تین شعر درج کیے ہیں وہ تینوں انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے تعلق رکھتے ہیں۔ [17]

ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں کسی وقت 'وضعدار' اور 'وضعداری' نے اردو استعمال میں آزاد، بامحاورہ اظہار کی حیثیت حاصل کر لی۔ [18] ان میں سے ہر ایک کے معنی کے دو دو مجموعے تھے، ایک وہ جس سے 'وضع' کے بارے میں روایتی فہم کا اظہار ہوتا تھا—یعنی ظاہری ہیئت یا شباہت—اور دوسرا وہ جو اس معاشرتی خوبی کو بیان کرتا تھا جس کو اسی زمانے میں نمایاں اہمیت حاصل ہوئی تھی: یعنی اپنے منتخب کردہ ذاتی طرزِ عمل کو مستقل مزاجی سے نباہنا۔ فرہنگ آصفیہ کے اندراجات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شخصی طرزِ عمل کی خوبی کے معنوں میں وضعداری 'زوال پذیر' دہلی میں بھی اتنی ہی نمایاں تھی جیسا کہ 'ترقی پذیر' لکھنؤ میں اس کی بابت ہادی لکھنوی اور اس شہر کے دیگر محب دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر انیسویں صدی کے دہلی اور لکھنؤ میں ایسا کوئی واحد گروہ تھا جس نے اس سلسلے میں امتیاز حاصل کیا کہ اس کے ارکان ایک طرف غیر معمولی، بعض اوقات قابلِ اعتراض ظاہری ہیئت اختیار کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے شخصی طرزِ عمل میں مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے، تو وہ مردوں کی وہ ٹولی تھی جسے 'بانکے' کہا جاتا تھا۔ یہاں مجھے افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ آگے کی سطروں میں میں بانکوں کے بارے میں جو کچھ لکھنے والا ہوں اس کا انحصار بڑی حد تک میری یادداشت پر ہے۔ میں نے اپنے لڑکپن میں اپنے بڑوں سے لکھنؤ کے بانکوں کے بہت سے قصے سنے اور مضامین اور کتابچوں میں ان کے بارے میں بہت سے پُر لطف بیان پڑھے، لیکن اب میں ان مطبوعات میں سے کسی کو بھی تلاش نہیں کر پایا۔ [19]

میری یادداشت میں جو قصے محفوظ رہ گئے ہیں ان میں بانکوں کی ظاہری ہیئت میں کوئی خاص چونکا دینے والی بات ضرور ہوتی تھی، کوئی ایسی بات جسے ان کے اردگرد کی شائستہ معاشرت پوری طرح قبول نہ کرتی تھی۔ مثلاً زنانہ لباس پہننا، یا مردانہ لباس کے ساتھ ناک میں عورتوں کی طرح لونگ

Scanned with CamScanner

پہننا، یا بے تحاشا لمبی مونچھیں رکھنا، یا صرف آدھی ڈاڑھی مونڈنا اور آدھی چھوڑ دینا، جاڑوں میں گرمیوں کے اور گرمیوں میں گرم کپڑے پہننا، یا لوگوں کے سامنے اپنے طرزِ عمل کی کسی ٹیڑھ پر قائم رہنا۔ لیکن انھی بانکوں پر جب کوئی فقرہ کستا یا ناگواری کا اظہار کرتا تو وہ اس کا تصفیہ اسی وقت تلوار سے کر ڈالتے۔ دوسری طرف بہت سے قصوں میں ایسا ہی کوئی بانکا کسی مظلوم کو کسی بدمعاش کی زیادتی سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتا۔ ہادی لکھنوی کا نقل کیا ہوا مقولہ 'سر جائے، سودا نہ جائے' ان قصوں میں اکثر دہرایا جاتا تھا۔ یہ اس اخلاقی موقف کا بڑی صراحت سے اظہار کرتا ہے جس کا یہ بانکے منفرد طور پر دعویٰ رکھتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، کوئی بھی بانکا معاشرے کے اونچے طبقوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا، اور نہ انتہائی نچلے طبقوں سے۔ بانکوں کی اختیار کردہ قابلِ اعتراض ہیئت مجھے اور میرے ساتھیوں کو معاشرے کے اعلیٰ ستونوں کے درست انداز کی تحقیر کرتی معلوم ہوتی تھی جن کی ریاکاری اور بدمعاشی کا پردہ ان قصوں میں فاش ہو جاتا تھا۔

لغات کی طرف لوٹتے ہوئے، میں نے پایا کہ تینوں انگریز لغات نگاروں — فیلن، شیکسپیئر اور پلاٹس — نے 'بانکا' کے بہت سے معنی درج کیے ہیں لیکن ان سب کا تعلق ظاہری ہیئت سے ہے اور بیشتر منفی زاویہ رکھتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ معنی یہ ہیں:

"fop; coxcomb; bully; fashionable and stylish."

سید احمد دہلوی نے اسی سے ملتے جلتے اردو الفاظ 'بانکا' کے مترادفات کے طور پر درج کیے ہیں لیکن ان میں 'وضعدار' کو بھی شامل کیا ہے اور اسے 'طرحدار' کے ساتھ رکھا ہے جس کے اردو میں صرف ایک معنی ہیں: "coquettish in looks and behaviour."۔ سید احمد نے 'بانکا' کے معنی میں دو نئے لفظ 'دلیر' اور 'بہادر' بھی درج کیے ہیں اور مثال کے طور پر 'بانکا جوان ہے' کا فقرہ لکھا ہے۔

میرے علم کی حد تک 'بانکے' کا لفظ پہلی بار 1808 میں لکھی گئی ایک کتاب میں ملتا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا (1817–1753) اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں کے ایک بے حد متنوع شاعر تھے؛ وہ اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے لیکن ان کی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار لکھنؤ میں ہوا۔ اردو میں کثیر شاعری کرنے کے علاوہ انشا نے اردو زبان کے بارے میں ایک کتاب دریائے لطافت بھی — فارسی میں — لکھی۔ اس کتاب میں اردو کے علاقائی اور سماجی تنوع کا نہایت دلچسپ بیان ملتا

Scanned with CamScanner

ہے، جس میں مختصراً دہلی کے بانکوں کا بھی ذکر آتا ہے، لیکن صرف اردو کی ابتدائی نشوونما میں ان کے ادا کردہ کردار کی تردید کے لیے۔[21] وہ لکھتے ہیں:

> یہ بانکے [زبان کی] بحث سے خارج ہیں، کیونکہ بانکے ہر شہر میں ہوتے ہیں۔ دہلی ہو یا دکن کے شہر، بنگالہ ہو یا پنجاب، ان سب کی ایک وضع اور ایک زبان ہوتی ہے۔ یہ لوگ مزاج کے تیز ھے ہوتے ہیں: چلتے بھی اینٹھ کر ہیں، اپنے بدن کو بہت دیکھتے رہتے ہیں اور ہر مونث کو مذکر بولنا ان کی عادت اور طریقہ ہے۔ چنانچہ ہماری بکری کو ہمارا بکرا کہتے ہیں۔[22]

اس آخری خصوصیت سے فوری طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے ان کی آبائی زبان اردو نہیں تھی۔ مایوس کن بات یہ ہے کہ قبل از جدید دور کی دہلی کی ثقافتی زندگی کے بارے میں معلومات کے تین کارآمد ذرائع — درگاہ قلی خاں کی مرقع دہلی (اٹھارھویں صدی)، مرزا سنگین بیگ کی سیر المنازل (انیسویں صدی) اور سید احمد خاں کی آثار الصنادید (انیسویں صدی) — ان لوگوں کے تذکرے سے قطعی خالی ہیں۔

لکھنؤ کی طرف رخ کیجیے تو وہاں کی انیسویں صدی کی ثقافتی زندگی کی معلومات کے دو اہم ذرائع مرزا محمد ہادی رسوا (1857–1931) کا مشہور ناول امراؤ جان ادا (1899) اور عبدالحلیم شرر (1860–1926) کی تصنیف ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (1913–1920) ہیں۔ موخر الذکر کتاب اب عام طور پر گذشتہ لکھنؤ کے عنوان سے مشہور ہے۔

شرر ہمیں بانکوں کے بارے میں کچھ زیادہ بتاتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان کی کتاب میں بانکوں کے ذکر اس پاجامے کے سلسلے میں آتا ہے جو انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھنؤ کے مردوں کا پہناوا تھا۔ شرر کے مطابق، اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں قندھار سے بہت سے مرد آکر دہلی میں رہ پڑے تھے۔ وہ گھیر دار پاجامہ پہنتے تھے جسے گھاگھرے کی طرح بہت سی کلیوں کو ساتھ ساتھ جوڑ کر سیا جاتا تھا۔ پھر شرر لکھتے ہیں:

> وہ لوگ چونکہ بڑے بہادر سمجھے جاتے تھے اس لیے یہاں کے عام سپہ گروں میں ان کی وضع و

لباس اور عادات وخصائل رواج پانے لگے، اور یہ انھی کی برکت اور انھی کی صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانکے بڑے بڑے کلیوں دار پائینچوں کے پاجامے پہنتے۔ دہلی کے آخر عہد میں —[یعنی انگریزوں کے 1803 میں دہلی پر قبضے سے پہلے کے سالوں میں] — بانکوں کی وضعداری و شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادوں نے بانکوں میں داخل ہو کر ان کی وضع اختیار کر لی اور شرفا، جن میں اکثر اپنی اصلی وضع پر تھے اور بہت سے بانکے بنے ہوئے تھے، لکھنؤ میں آئے۔ 23

اس کے بعد شرر ایک اور قسم کے پاجامے کا ذکر کرتے ہیں جو، ان کے مطابق، اس سے پہلے وجود نہ رکھتا تھا اور جسے لکھنؤ والوں نے غازی الدین حیدر (دورِ حکومت 1827–1814) اور ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر (دورِ حکومت 1837–1827) کے زمانے میں بانکوں کے پاجامے میں مناسب تبدیلیاں کر کے تیار کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں:

یہ نیا پاجامہ ہلکا پھلکا اور ہندوستان کی گرمیوں میں نہایت آرام دہ تھا۔ چند ہی روز میں امرا و مہذب لوگوں میں اس قدر مقبول ہو گیا کہ سوا ان لوگوں کے جو بانکپن کا دعویٰ رکھتے تھے، تمام اہلِ فضل وعلم، زہاد و اتقیا اور سارے شرفا اور امرا کی وضع میں یہی پاجامہ داخل تھا۔ ان لکھنؤ میں صرف دو پاجامے تھے۔ ایک تو وہی بانکوں کا کلیوں دار پاجامہ، دوسرا عرض کے پائینچوں کا پاجامہ جو سارے شہر کے مہذب لوگوں کی وضع میں داخل ہو گیا تھا۔ 24 ... بانکوں والے اول الذکر پاجامے کو خود نصیر الدین حیدر نے اپنی وضع میں داخل کر لیا۔ ان کو انگریزی لباس کا بھی شوق تھا، اس لیے یا کوٹ پتلون پہنتے یا کلیوں دار پاجامہ، جس کو فی الحال پنجاب والے غرارے دار پاجامہ کہتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کو یہ پاجامہ اس قدر عزیز تھا کہ انگریزوں کے گون کے مشابہ دیکھ کر انھوں نے اسے اپنے محل کی بیگموں کو بھی پہنانا شروع کیا اور محل کی وضع میں داخل ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی تمام عورتیں اسی کو پہننے لگیں۔ 25

مختصر یہ کہ افغان حملہ آوروں کی گھیر دار شلوار، جس کا ردعمل 1770 کی دہائی کی دہلی میں نفرت اور استہزا کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا، ہوتے ہوتے دہلی کے شرفا کے غیر مقلد لڑکوں کا پسندیدہ پہناوا بن گئی۔ بعد میں یہی خوش باش سپہ گر اس انداز کو اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے جہاں یہ ایک شوقین بادشاہ

Scanned with CamScanner

اور اس کے پرستاروں کو بھا گیا۔ تاہم شہر کے 'مہذب' لوگوں کی اکثریت اس سے الگ تھلگ رہی، لیکن بعد میں اسی سے متاثر ہو کر ایک نئے قسم کا پاجامہ تیار کر لیا۔[26]

شرر سے چند سال پہلے رسوا نے اپنا شاہکار ناول امراؤ جان ادا شائع کیا۔ اس میں لفظ 'بانکا' صرف ایک بار استعمال ہوا ہے، اور ایک ایسے شخص کے بیان میں جو امراؤ جان کے گاہکوں میں سے تھا اور جسے امراؤ جان نے پہلے پہل خاصا نفرت انگیز پایا تھا۔ وہ منظر اس طرح ہے:

> خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک صاحب، جن کی وضع شہر کے بانکوں کی ایسی تھی، سانولا رنگ، چھریرا بدن، ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے، میرے کمرے میں درّانہ چلے آئے اور آتے کے ساتھ ہی سامنے قالین پر بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے یا ابھی انیلے ہیں، رنڈیوں کے یہاں کم جانے کا اتفاق ہوا ہے۔[27]

رسوا کے ہاں 'وضع' اور 'وضعدار' کے لفظوں کا استعمال بھی دو دِلے پن کے تاثر سے خالی نہیں۔ اس تصور کو ناول میں ایسے کرداروں کی نسبت کام میں لایا گیا ہے جیسے کہ مولوی صاحب جن کا جوانی میں اس عورت سے کچھ عرصے کے لیے تعلق رہا تھا جو اب امراؤ جان کی دیکھ بھال کرتی ہے، لیکن وہ اس تعلق کی ذمے داریوں کو عمر بھر نباہتے ہیں۔ یا پھر اس تصور کا ذکر اس اُجڈ عاشق —— دراصل ڈاکو —— کے دوستوں کے بیان میں آتا ہے جو اس گھر کو لوٹنے سے انکار کر دیتے ہیں جہاں امراؤ جان اتفاق سے مہمان ٹھہری ہوئی ہے۔ یہی معاملہ رسوا کی دوسری مشہور کتاب شریف زادہ کا بھی ہے، جو ایک سبق آموز متن کے طور پر ہائی اسکول کے اردو کے نصاب میں کئی دہائیوں تک شامل رہی۔ اگرچہ اس کتاب کے مرکزی کردار کے عزم اور مصیبت کے سامنے اس کی استقامت کی جا بجا تعریف کی گئی ہے لیکن اس کی نسبت 'وضعداری' کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا گیا؛ یہ لفظ پوری کتاب میں صرف ایک بار آیا ہے، اور وہ بھی ایک بے ضرر شوقین مزاج شخص کے بیان میں جو کسی قسم کا عزم نہیں رکھتا۔[28]

شرر کی طرف واپس آتے ہوئے، میری توقع تھی کہ وہ 'وضعداری' کے سلسلے میں اتنے ہی جوش سے مدح خواں ہوں گے جیسے ہادی لکھنوی۔ میں یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ اپنے محبوب شہر کے بانکوں

Scanned with CamScanner

کے چند ایک قصے ضرور سنائیں گے۔ لیکن ان دونوں معاملوں میں انھوں نے مجھے متعجب کر دیا۔ اگرچہ ان کی کتاب لکھنؤ کے بہت سے قابلِ ذکر افراد کے دلآویز قصوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن کسی بانکے کا ایک بھی قصہ شرر کی کتاب میں نہیں ملتا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شرر نے 'وضعدار' اور 'وضعداری' دونوں لفظوں کو، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے، دو الگ الگ طریقوں سے استعمال کیا ہے، لیکن وہ 'وضعداری بمعنی مستقل مزاجی' کے موضوع پر کچھ زیادہ نہیں کہتے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا ثقافتی مظہر تھا جس کی قصیدہ خوانی کی انھیں کچھ خاص خواہش نہ تھی۔

درحقیقت یہ بات بہت جلد ظاہر ہو جاتی ہے کہ شرر ان دونوں لفظوں کو استعمال کرتے وقت ممکن ہے کہ گہرے طنز سے کام لے رہے ہوں۔ ذرا ان کے درج ذیل بیان پر غور کیجیے جو انیسویں صدی میں لکھنؤ میں مقبول جوتوں کے بارے میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لکھنؤ میں بہ عہدِ شاہی [یعنی 1819 کے بعد] ایک نئی قطع کا 'خردنوکا' جوتا ایجاد ہوا جس کو یہاں کے وضعداروں نے ابتداء بہت پسند کیا۔۔۔ تھوڑے دنوں بعد اس خردنو کے جوتے کی آرائش وزیبائش کی طرف [بھی توجہ ہونے لگی]۔

دو دوسری طرح کے جوتوں 'کفشین' اور 'گھیتلا' کا ذکر کرنے کے بعد شرر موخرالذکر کے تعلق سے ایک نیا موضوع چھیڑ دیتے ہیں:

> گھیتلے جوتوں، کفشوں اور ان پر جو کارچوبی کام بنایا جاتا، اس نے مسلمانانِ لکھنؤ میں دو خاص پیشے پیدا کر دیے جن پر بہت سے لوگوں کی معاش کا دارومدار ہو گیا۔ پہلے تو مسلمان موچی، جن کی یہاں ایک مستقل قوم اور برادری ہے۔ یہ لوگ سوا گھیتلے جوتے بنانے کے اور کسی قسم کا جوتا بنانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہیں۔ لکھنؤ میں ان لوگوں کے بہت سے گھر تھے اور سب سچے مسلمان، سفید پوش اور بمقابل دوسرے ادنیٰ طبقے والوں کے ممتاز تھے اور اگلے دنوں نہایت فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اب قدیم وضع ولباس بدلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مردوں کے بعد عورتوں نے بھی گھیتلا جوتا بالکل چھوڑ دیا۔۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موچیوں کا گروہ بالکل تباہ ہو گیا۔ ان کے بیسیوں گھر اجڑ گئے اور جو باقی ہیں قعرِ فنا کے بالکل کنارے ہیں، لیکن ان

Scanned with CamScanner

> لوگوں کی وضعداری کی داد دینا چاہیے کہ لٹ گئے اور تباہ ہو گئے مگر یہ نہ گوارا کیا کہ گھٹیلے جوتوں کے عوض سلیپریں یا بوٹ بنائیں اور رفتار زمانہ کا ساتھ دے کے پہلے سے زیادہ ترقی کریں۔[29]

ناگواری کا یہی تاثر کتاب کے اس حصے میں بھی محسوس ہوتا ہے جو معاشرتی آداب کے بارے میں ہے۔ شرر اس باب کا آغاز ایک سپاٹ بیان سے کرتے ہیں:

> معاشرت میں چوتھی چیز اخلاق و عادات ہیں۔ اس بات میں لکھنؤ والوں نے خصوصیت کے ساتھ نمود حاصل کی۔ یہی چیز لکھنؤ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔[30]

پھر وہ لکھنؤ کے وضعدار شرفا کی آدرش شائستگی کا ذکر کرتے ہیں جس کا اظہار ان کے اپنے بدقسمت دوستوں کی درپردہ مدد سے ہوتا ہے جس کے عوض وہ کچھ طلب نہیں کرتے۔ شرر کہتے ہیں:

> اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کا بظاہر کوئی ذریعۂ معیشت نہ تھا۔ ان کے احباب ایسے مخفی طریقوں سے ان کی کفالت کرتے کہ کسی کو کبھی پتا بھی نہ چل سکتا اور ذرائع معاش کے مخفی رہنے کے باعث وہ سفید پوشی اور امیرانہ وضع کے ساتھ بڑے بڑے امیروں کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور کسی کے سامنے ان کی آنکھ نیچی نہ ہوتی۔

اس کے دو پیراگراف بعد شرر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دولت مندی کے زمانے میں چونکہ شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ امرا و شرفا اور احباب کی مخفی دستگیری پر بسر کر رہا تھا، اس کی وجہ سے محنت، جفاکشی اور وقت کی قدر و قیمت جاننے کا مادہ علی العموم اہلِ لکھنؤ میں فنا ہو گیا اور جو مشاغل انھوں نے اختیار کیے وہ ان کو قومی ترقی کی شاہراہ سے روز بروز دور کرتے گئے۔[31]

معلوم ہوتا ہے کہ شرر اور رسوا دونوں کے نزدیک، جو سیاست اور سماجی بحثوں میں اپنی آزاد خیالی کے لیے معروف تھے، بدلے ہوئے حالات میں ناقابل تغیر وضعداری کی خوبی دراصل خامی نہیں تو ایک ترقی کے راستے کی ایک بھاری رکاوٹ ضرور بن سکتی تھی۔ مرزا جعفر حسین تک نے، جو 'وضعداری' کے بہت قائل تھے، اپنی ایک اور کتاب میں تقریباً ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔ ایک قریبی عزیز کے قرضوں

Scanned with CamScanner

کی کہانی سنانے کے بعد لکھتے ہیں:

> اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ رؤسائے لکھنؤ کی تباہی و بربادی میں ان کی وضعداری، ان کی آن بان اور ان کے غلط قسم کے تخیل شرافت و دیانت کو حقیقتاً دخل تھا، مگر وہ اپنی ان کمزوریوں کو عین صداقت اور حق پرستی ہی سمجھا کیے۔ 32

ہادی لکھنوی نے بھی، جو لکھنؤ کی وضعداری کے بہت بڑے موئید تھے، غالباً مسلمان موچیوں کی احمقانہ ضد کے معاملے میں شرر سے اختلاف نہ کیا ہوتا، لیکن وہ موچیوں کے اس طرز عمل کے لیے 'وضعداری' کا لفظ ہرگز استعمال نہ کرتے: ان کے نزدیک یہ ایک متبرک لفظ تھا جسے مذاق اڑانے کے لیے نہیں برتا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ترقی کے بارے میں شرر کے نکالے ہوئے نتیجے پر سخت ردعمل ظاہر کرتے۔ ہادی لکھنوی کے ''تعارف'' سے یہ سطریں ملاحظہ کیجیے، جو شرر کی کتاب سے بہت پہلے کی نہیں ہیں:

> اس کتاب میں جن وضعداروں کا تذکرہ ہے وہ لکھنؤ کے شباب کے زمانے میں تھے۔ افسوس اُس وضعداری کے دور کے ساتھ ہی اقبال کا دور بھی ختم ہو گیا، گویا دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اقبال کے زمانے میں باوضع اور وضعدار ہونا موجب فخر تھا اور اب اِدبار کے عہد میں بدوضعی اور طرحداری سرمایۂ ناز۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ اگلے باوضع اپنی وضعداری کے اظہار کو مذموم جانتے تھے، اور اب نئی پود اپنی بدوضعیوں کے شرمناک تذکرے فخریہ بیان کرتی ہے۔ وائے بر من و وائے بر انجامِ من۔ اب تو وضعداری کا مفہوم بن سنور کر اور نک سکھ سے درست ہو کر بازاروں میں نکلنا رہ گیا ہے۔ پہلے قول و فعل کی پابندی وضعداری سمجھی جاتی تھی، اب چالبازی اور فطرت اس کی قائم مقام ہے۔ نئی پود اپنی چالبازیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سناسنایا ایک انگریزی لفظ پالیسی استعمال کرتی ہے۔ کسی سے دغا کی، کسی کو جُل دیا تو یہ کہہ کر کہ یہ پالیسی تھی۔ 33

ہادی لکھنوی کا تبصرہ ہمیں بھرپور قوت سے وہ وسیع تر تناظر یاد دلاتا ہے جس میں وہ اور شرر دونوں لکھ رہے تھے، یعنی زوال کا مہابیانیہ جو 1857 کے بعد سے تمام سماجی اور سیاسی موضوعات پر مسلمان شرفا

Scanned with CamScanner

کی فکر پر ہمہ گیر طور پر اثر انداز ہوتا آ رہا تھا۔ [34] ہادی لکھنوی کی جانب سے وضعداری کی تعریف و توصیف 'ترقی' کے ذیلی بیانیے پر قدامت پرست موقف کے حملے کی صورت اختیار کر لیتی ہے؛ ترقی کے اس ذیلی بیانیے کو انیسویں صدی کے ان 'اصلاح پسندوں' کی حمایت حاصل تھی جو سب کے سب شرفا اور مرد تھے اور جو اپنے ہم عصروں کو مصالحت سے کام لینے اور وقت کے ساتھ چلنے کی نصیحت کر رہے تھے۔ اس موخر الذکر موقف کا سب سے مختصر اور جامع اظہار الطاف حسین حالی کی مسدس مدوجزر اسلام کے --جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کی ثقافتی طور پر سب سے زیادہ موثر نظم ہے-- ایک مصرعے میں ملتا ہے:

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی [35]

پوری اٹھارھویں صدی کے دوران فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں 'وضعداری' سے مراد اپنی ظاہری ہیئت میں کسی ایسی خصوصیت کا اظہار کرنا تھا جو غیر روایتی اور انفرادیت پسندانہ نوعیت کی ہو۔ یہ نئی خصوصیت خوش باشی کا دلکش مظہر ہو سکتی تھی لیکن بیشتر 'مہذب' لوگوں کے نزدیک اسے قابل اعتراض بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اگر اکثریت اپنی ٹوپیوں یا پگڑیوں کو سیدھا رکھتی ہو اور اسے 'شرافت' کی علامت گردانتی ہو، تو وضعدار شخص اس کا ٹھیک الٹ کرے گا، یعنی اپنی ٹوپی یا پگڑی کو ٹیڑھا کرے گا، گو اس کی قیمت اسے عمومی ناپسندیدگی کی صورت ہی میں ادا کرنی پڑے۔ اس تمام عرصے میں فارسی لفظ 'وضعدار' ہندی الاصل لفظ 'بانکا' کا مترادف رہا، اور اردو میں ان دونوں لفظوں کو ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے کسی بھی لفظ سے کسی شخص کے طرز عمل میں کسی 'باطنی' خصوصیت کا اظہار منسوب نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح یہ دونوں اصطلاحات کچھ خاص سماجی معنویت نہیں رکھتی تھیں۔

1770 کے عشرے میں تبدیلی آنا شروع ہوئی، جب باہر سے کچھ لوگ آ کر دہلی میں بس گئے جو بہت سے دہلی والوں کی نظر میں دو لحاظ سے اُجڈ سمجھے جا سکتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ حملہ آور فوج کے سپاہی تھے، اور دوسرے اس لیے کہ ان کے اطوار اور عادات دہلی کے شہریوں سے مختلف تھے۔ تاہم انھی دونوں وجہوں سے ان کی ذات میں بہت سے ایسے لوگوں کو دلکشی محسوس ہونے لگی جو اپنے

Scanned with CamScanner

بڑوں اور ہم عمروں سے مختلف ہونے کی آرزو رکھتے تھے۔ یہ باہر والے خود کو وضعدار نہیں سمجھتے تھے، اور نہ خود کو 'بانکا' کہتے تھے، لیکن خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ نام ان کو معاشرے کے ستونوں نے استہزا کے طور پر دیا ہوگا۔ اپنی 'ظاہری' ہیئت کے علاوہ یہ باہر والے بلاشبہ اپنے ساتھ کچھ 'باطنی' خصوصیات بھی لائے تھے جو ان کے اعتقاد کے مطابق ان کی قبائلی شناخت کا لازمی جز و رہی ہوں گی۔ تاہم یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان باہر والوں میں عزت کے شدید احساس، استقلال اور وفاداری کی خصوصیات مقامی باشندوں سے زیادہ پائی جاتی ہوں گی۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ جن مقامیوں نے ان اُجڈ باہر والوں کی 'ظاہری' ہیئت میں پیروی شروع کی تھی انھیں جلد ہی مقبول عام تصور کی رو سے بیشتر باقی لوگوں کی نسبت زیادہ مذکورہ بالا خصوصیات کا حامل سمجھا جانے لگا۔

اٹھارھویں صدی کے ختم اور انیسویں صدی کے شروع ہوتے تک 'وضعدار' اور 'بانکا' ایک دوسرے کے مترادف اور بدل نہ رہے۔ اب 'بانکوں' سے مردوں کا ایک مخصوص گروہ مراد لیا جانے لگا جو اپنی انفرادیت میں ممتاز تھے، اور یہ انفرادیت صرف ان کی ہیئت میں نہیں بلکہ عادات واطوار میں بھی ظاہر ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ ایک اور معنیاتی تبدیلی رونما ہوئی اور انیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے 'وضعدار' کو اردو میں دو الگ الگ معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس لفظ کا ایک مفہوم، جس کا تعلق 'ظاہری' ہیئت سے تھا، اپنے انسلاکات کے اعتبار سے 'سرد وگرم' دونوں رہا — یعنی 'خوش پوش' بھی اور 'چھیلا' بھی — لیکن دوسرا مفہوم، جس میں 'باطنی' خوبیاں مضمر تھیں، واضح طور پر مثبت صورت اختیار کر گیا — 'مستقل مزاج'، کو کسی بھی طرح 'ضدی' سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ صورت حال غدر تک باقی رہی جب شمالی ہندوستان کے مسلمان شرفا ایک سخت ابتلا سے گزرے اور ان میں سے بہت سے اس نقصان کی تلافی کرنے اور آگے بڑھنے کی راہیں ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ ان 'اصلاح پسندوں' میں بعض نے 'وضعداری' کو مطلوبہ اجتماعی ترقی کے راستے کی ایک رکاوٹ کے طور پر دیکھا اور اس کا مضحکہ اڑایا۔ (رسوا اور شرر سے قبل نذیر احمد نے بھی 'وضعداری' کو استہزا کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ توبة النصوح میں فطرت نام کا ایک بدمعاش شخص نصوح کے بڑے بیٹے کلیم کو باپ کے خلاف ورغلاتے ہوئے اس سے کہتا ہے: ''مجھ کو تمھاری وضعداری اور دانشمندی سے شیخ وقت کی تقلید نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی۔'' نذیر احمد، توبة النصوح، دہلی، 2001، ص 219)۔ ان کے

Scanned with CamScanner

موقف کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مخالفوں کو 'وضعداری' میں ایک نہایت پسندیدہ خوبی دکھائی دی جو باقی رکھے جانے کی مستحق تھی نہ کہ محض کسی قسم کی 'ترقی' کی خاطر راستے سے ہٹا دیے جانے کی۔

حقیقی زندگی میں اصلاح پسند کامیاب رہے؛ تاہم لغات کی حد تک قدامت پرستوں کو فتح حاصل ہوئی۔ ان کی فتح کی بے شک وشبہ تصدیق 1925 میں ہوئی جب لاہور کے مولوی فیروز الدین نے اپنی لغت فیروز اللغات شائع کی۔[35] اس میں 'وضعدار' کے معنی درج کرتے ہوئے انھوں نے اس وقت موجود ترتیب کو الٹ دیا اور پہلے معنی کے طور پر اس کی 'باطنی' خصوصیات لکھیں۔ یہ اندراج اس طرح ہے:

'وضع': (1) شکل، صورت، حلیہ (2) ظاہری حالت (3) طور طریق، رنگ ڈھنگ، طرز، چلن (4) بناوٹ، ساخت۔

'وضعدار: (وضع نباہنے والا) اپنے طریقے پر قائم رہنے والا، پابندِ وضع (2) اچھی وضع کا، بجیلا، بانکا، طرحدار۔

'وضعداری': (1) ایک دفعہ اختیار کی ہوئی وضع کو مرتے دم تک نباہنا (2) بانکپن، طرح داری، خوبصورتی (3) سلیقہ، ڈھنگ، طریقہ۔

'وضیع': کمینہ، نیچ، فرومایہ۔

تاہم مجھے اپنے مضمون کا خاتمہ لباس کی تراش خراش کے معاملے پر کرنا ہوگا۔ جہاں تک پاجامے کا تعلق ہے، فتح 'ترقی پسندوں' کے حصے میں آئی۔ شرر کے 'مہذب' طرز سے ایک نئے طرز کی نشوونما ہوئی۔ یہ کپڑے کی مقدار کے اعتبار سے کفایت شعار، کمر اور رانوں پر کم ڈھیلا اور تنگ مہری کا پاجامہ تھا لیکن پنڈلیوں پر کسا ہوا نہیں۔ بہت جلد مسلمان مرد، جوان اور بوڑھے دونوں، اسے پہننے کو ترجیح دینے لگے اور اسے اب تک انیسویں صدی کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کی اس عظیم تحریک کی یادگار کے طور پر 'علیگڑھ کٹ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔[36]

❁❁

Scanned with CamScanner

حواشی

یہ مقالہ پہلی بار لندن میں اکتوبر 2010 میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں پیش کیا گیا جس کا موضوع تھا: "Civility and Its Other: German, British, and South Asian Perspectives, 17th – 19th Centuries," اور جسے جرمن ہسٹاریکل انسٹیٹیوٹ، لندن، اور میکس پلانک انسٹیٹیوٹ فار ہیومن ڈویلپمنٹ، برلن، کے سنٹر فار دی ہسٹری آف ایموشنز نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ مصنف اس کانفرنس کے منتظمین کا اس دعوت اور حوصلہ افزائی کے لیے بیحد ممنون ہے۔

1 باربرا ڈیلی مٹکاف، *Moral Conduct and Authority*، صفحہ 3-4۔

2 علی بن عثمان الہجویری، کشف المحجوب، مرتبہ احمد ربانی، لاہور، 1968، ص 9۔ اصل عربی عبارت: ابتلینا بزمان لیس فیہ آداب الاسلام ولا اخلاق الجاہلیہ ولا اعلام ذوی المروۃ۔ مطبوعہ متن میں 'اعلام' کی جگہ 'احکام' ہے، جو میرے نزدیک سہوِ کاتب ہے، اگرچہ اس سے مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

3 جنوبی ایشیا میں ان متون کی مقبولیت ان کے مخطوطوں کی اس بڑی تعداد سے ظاہر ہے جو ذخیروں میں محفوظ ہے اور اس کے علاوہ سوانحی تحریروں میں ان کے تذکروں سے بھی۔ مثلاً اخلاق ناصری اور قابوس نامہ دونوں شہنشاہ اکبر کی پسندیدہ کتابوں میں شامل تھیں، جو "اسے متواتر پڑھ کر سنائی جایا کرتی تھیں،" جیسا کہ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئینِ اکبری میں لکھا ہے۔ ادب اور اخلاق سے متعلق تحریروں کے بارے میں مزید مطالعے کے لیے باربرا مٹکاف کی مرتب کردہ کتاب *Moral Conduct and Authority* اور مظفر عالم کی تصنیف *The Languages of Political Islam in India, c. 1200–1800* سے رجوع کیجیے۔

4 الہجویری، کشف المحجوب، ص 62۔

5 اینا ماری شمل، *Mystical Dimensions of Islam*، صفحہ 195۔ شمل نے سترھویں صدی کے صوفی شہید سرمد کے، جن کا مزار دہلی میں آج بھی عقیدت کا مرکز ہے، دو مصرعے نقل کیے ہیں۔ پوری رباعی یہ ہے:

سرمد تو حدیثِ کعبہ و دیر مکن
در کوچۂ شک چو گمرہاں سیر مکن
رو، شیوۂ بندگی ز شیطان آموز

یک قبلہ گزین و سجدۂ غیر ممکن

6 سید محمد ہادی لکھنوی، وضعدارانِ لکھنؤ، حصہ اول، صفحہ 37 تا 40۔ یہ کتاب بنیادی طور پر ان مسلمان مردوں کے مندرجہ بالا قسم کے قصوں پر مشتمل ہے جو مصنف سے فوری قبل کے دور میں ہو گزرے تھے۔ ہادی لکھنوی نے اس کتاب کے چار الگ الگ حصے لکھنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن غالباً پہلا حصہ ہی شائع ہو سکا۔ باقی مجوزہ حصوں میں مصنف کے ماضی کے ہندو وضعداروں اور مصنف کے ہم عصر مسلمان اور ہندو وضعداروں کا تذکرہ کیا جانا تھا۔ میں اس کتاب کی طرف توجہ دلانے اور پھر اس کی فوٹو کاپی فراہم کرنے کے لیے پروفیسر نیر مسعود کا ممنون ہوں۔

7 ہادی لکھنوی، وضعدارانِ لکھنؤ، صفحہ 29۔

8 ایضاً، صفحہ 29 تا 31۔

9 ایضاً، صفحہ 8 تا 9۔ آخر کا تبصرہ غیر معمولی ہے۔ اسلامی پارسائی کے اس مروج تصور کے کہ ہر شخص کا خاتمہ واحد سچے مذہب اسلام پر ہونا چاہیے، خلاف جاتے ہوئے، اس میں اصل مقام 'مستقل مزاجی' کو دیا گیا ہے جو وضعداری کے تصور کا حصہ ہے۔ یہ بات غالب (وفات 1869) کے نصف صدی پہلے کے اس شعر سے بہت نمایاں طور پر مماثل ہے:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

10 مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، صفحہ 97 تا 104۔ مصنف کا سنہ پیدائش 1898 ہے اور وہ 1978 کے کچھ برس بعد تک زندہ رہے۔

11 اصل میں 'ترتیب' کی جگہ 'تربیت' چھپا ہے، لیکن آگے کے متن سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ایک غلطی ہے۔

12 مرزا جعفر حسین کے نزدیک لکھنؤ کا معاشرہ وضعداری سے پر تھا، لیکن باورچیوں اور خدمتی طبقے کے دوسرے ارکان کے ان قصوں کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ ضرورت تھی جس نے خوبی کی شکل اختیار کر لی۔ باورچی اگر اپنی خدمات ہر کسی کو پیش کرنے لگتا تو اپنے مالدار تر مربیوں سے محروم ہو سکتا تھا۔

13 مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ، صفحہ 102۔

14 اصل عربی لفظ 'وضع' پہلے فارسی اور پھر فارسی کے راستے جنوبی ایشیا کی ان تمام زبانوں میں رائج ہو گیا جن کو مسلمانوں نے اپنی تہذیب کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔

15 میں نے جن دوسری لغات سے رجوع کیا ان میں غیاث اللغات، چراغِ ہدایت، بہارِ عجم، اور

Scanned with CamScanner

مصطلحات الشعرا شامل ہیں۔

16 جدید ایرانی لغات مثلاً فرہنگِ نفیسی اور لغت نامۂ دہخدا میں اور ایف اسٹین گاس میں بھی یہی صورت سامنے آئی۔ اسٹین گاس کی لغت **A Comprehensive Persian-English Dictionary** (1892) میں مکمل ہوئی لیکن اس کی آخری جلد، جس میں 'وضع' کا لفظ درج ہے، 1900 میں شائع ہوئی۔ اس کے مرتب نے اس کی لغت کی تیاری میں مدد کی تھی۔

17 ان میں سے دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

وضعداری بری بیماری ہے یہ رہے، جان رہے یا نہ رہے (داغ)

یہی تو قاعدہ ہے اے ستمگر وضعداری کا عدو سے ترکِ الفت کر کے بھی ملنا نہ چھوٹے گا (تصویر)

سید احمد دہلوی نے مترادفات کا ایک تیسرا مجموعہ بھی درج کیا ہے: ''سلیقہ، ڈھنگ، اور سگھڑاپا۔'' لیکن اس کی کوئی مثال نہیں دی۔

18 انگریز لغات نگاروں نے قابلِ فہم طور پر فارسی لغات پر ناواجب اعتماد کیا، کیونکہ اس زمانے میں بیشتر ہندوستانی بھی ان لغات کو اردو کے معاملے میں اتنا ہی مستند جانتے تھے۔

19 ہندوستان میں میرے لیے معلومات کے دو سب سے قابلِ اطمینان ذرائع یعنی نیر مسعود اور شمس الرحمن فاروقی بھی کسی ایسے متنی ماخذ تک میری رہنمائی نہ کر سکے، اگرچہ ان کو بھی میری طرح اس قسم کے بہت سے قصے یاد ہیں۔

20 اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ زبان کے موضوع پر انشا نے لکھا ہے، جبکہ دوسرا حصہ خطابت کے بارے میں ان کے اتنے ہی معروف دوست مرزا محمد حسن قتیل کی تحریر ہے۔

21 انشاء اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، صفحہ 123۔ ملحوظ رہے کہ اردو کے ہر اسم کو مذکر بولنا انگریز نوآبادیاتی افسروں میں بھی عام تھا۔

22 عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنؤ، صفحہ 241۔ کیا پاجامے کے گھیردار ہونے سے مقصود یہ تھا کہ حملے کے دوران لوٹ کا مال اس میں بھرا جا سکے؟

23 ملحوظ رہے کہ شرر بانکوں کو واضح طور پر شرفا میں شامل سمجھتے ہیں۔

24 شرر، گذشتہ لکھنؤ، صفحہ 242۔ نصیر الدین حیدر 1827 سے 1837 تک تخت نشین رہے۔

25 یہ طرز آخر کار 'غرارے' پر منتج ہوئی جو بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمان شرفا کی عورتوں کا پسندیدہ لباس بن گیا اور جسے آج کل اخباروں کے فیشن کے کالموں میں مغل نفاست کا ''genuine

Scanned with CamScanner

statement" قرار دیا جاتا ہے۔ شرر نے ایک اور قسم کے پاجامے کا بھی ذکر کیا ہے -- وہ اسے 'گھٹنا' کہتے ہیں۔ میرے بچپن میں یہ لفظ زیادہ تر عورتوں کے اس طرح کے پاجامے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مردوں کے اس طرز کے پاجامے 'چوڑی دار' کہے جاتے تھے اور عموماً تنگ تر بھی ہوتے تھے۔ شرر کا خیال ہے کہ یہ پاجامہ سکھوں کے اس سے بھی زیادہ تنگ پاجامے سے نکلا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسے اودھ کے وہ فوجی اپنے ساتھ لائے جو 1840 کی دہائی میں سکھوں کے خلاف لڑائیوں میں برطانوی فوج میں شامل تھے، اور پھر اس کی انتہائی تنگ صورت لکھنؤ کے وضعدار لوگوں کا محبوب لباس بن گئی۔ (گذشتہ لکھنؤ، صفحہ 242)۔ یہ 1860 کی دہائی میں دہلی کے طرحداروں میں بھی بہت مقبول تھا، جیسا کہ نذیر احمد نے اپنے ناول توبۃ النصوح میں مرزا ظاہردار بیگ کی تصویر کشی میں نمایاں کیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں سماجی قبولیت کے اعتبار سے دہلی میں سکھوں کا درجہ غالباً قندھاریوں سے بھی بہت نیچے تھا۔

26 مرزا محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، صفحہ 139۔

27 اسی ناول میں ایک دوسرے مولوی صاحب ایک نوخیز حسینہ پر بری طرح فریفتہ ہیں۔ ایک دن اچانک اس کے کوٹھے پر ان کا سامنا اپنے بیٹے سے ہو جاتا ہے۔ بیٹا وہاں آنا چھوڑ دیتا ہے لیکن والد صاحب آنا جاری رکھتے ہیں۔ یہ قصہ سن کر راوی تبصرہ کرتا ہے: "جی ہاں، اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضعدار ہوتے تھے۔" امراؤ جان ادا، صفحہ 131۔

28 مرزا محمد ہادی رسوا، شریف زادہ، صفحہ 131۔ وہ 'وضعداری' کا لفظ فدوی میاں کی عادات و اطوار کے بیان میں استعمال کرتے ہیں جنھیں ناول کے ہیرو نے قرض سے چھڑایا تھا۔

29 شرر، گذشتہ لکھنؤ، صفحہ 46-245۔

30 ایضاً، صفحہ 63-262۔

31 مرزا جعفر حسین، بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں، صفحہ 22۔

32 ہادی لکھنوی، وضعداران لکھنؤ، صفحہ 8-7۔ ہادی کے اس تبصرے سے نوآبادیاتی تسلط کی مخالفت کا پہلو نہیں نکلتا، کیونکہ وہ اضافہ کرتے ہیں: "ان [نئی پود کے لوگوں] کے خیال میں پالیسی ساری برائیوں کی پردہ دار ہے، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ اس لفظ کی آڑ میں ناجائز شکار کھیلنا جائز اور داخل عقلمندی ہے، حالانکہ پالیسی کے اصلی مفہوم کی ہوا بھی ان کے دماغ کو نہیں لگی ہے۔۔۔۔ جس بااقبال قوم کی زبان کا یہ لفظ ہے، اس کے یہاں ایک باوقعت اور اعلیٰ موقعے پر ملکی معاملات اور امور سلطنت میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

33 'زوال' کی یہ گفتگو دراصل 1780 کی دہائی میں افغانوں، جاٹوں، روہیلوں اور مراٹھوں کے ہاتھوں باری باری دہلی کی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ شروع ہوگئی تھی، جیسا کہ اس زمانے کی شہرآشوب نظموں سے ظاہر ہے۔ اس کا اثر پچھلی صدی کے نصف اول تک رہا اور آج بھی جنوبی ایشیا کے بہت سے مسلمان حلقوں میں اس کا رنگ پایا جاتا ہے۔

34 مسدس مد و جزرِ اسلام کے عنوان سے یہ نظم 1879 میں شائع ہوئی۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ شریف زادہ (صفحہ 105) میں رسوا نے انگریزی مقولے "Honesty is the Best Policy," کا ترجمہ کیا: ''دیانت بہترین مصلحت ہے۔''

35 حکومت ہند کے سررشتۂ تعلیم کی اعانت سے یہ پورے ملک میں سب سے مقبول اردو لغت بن گئی، اور اس کے بیسیوں ایڈیشن مختلف صورتوں میں شائع ہوتے رہے۔ مکمل صورت میں بھی پینتالیس برس کے عرصے میں یہ بیس مرتبہ چھپی۔

36 دیکھیے شرر، گذشتہ لکھنؤ، صفحہ 242۔

کتابیات

ابوالفضل علامی، *The Ā'īn-I Akbarī* آئینِ اکبری، ترجمہ ایچ بلوکمین، اور تدوین ڈی سی فلٹ، جلد 1، نئی دہلی، 1977، ری پرنٹ۔

عالم، مظفر، *The Languages of Political Islam in India, c. 1200–1800*، نئی دہلی، 2004۔

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، دہلی، 1918، دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن۔

مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، لاہور، 1970۔

سید محمد ہادی لکھنوی، وضعدارانِ لکھنؤ، حصہ اول، لکھنؤ، 1908۔

علی بن عثمان الجویری، کشف المحجوب

مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، نئی دہلی، 1981۔

مرزا جعفر حسین، بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں، لکھنؤ، 1978۔

انشاء اللہ خاں انشا، دریائے لطافت، ترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی، اورنگ آباد، 1935۔

باربرا ڈیلی منکاف (مدیر)، *Moral Conduct and Authority: The Place of Adab in South Asian Islam*، برکلے، 1984۔

مرزا محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، نئی دہلی، 1971، ری پرنٹ۔

مرزا محمد ہادی رسوا شریف زادہ، الہ آباد، 1968، ری پرنٹ۔

اینا ماری شمل، *Mystical Dimensions of Islam*، چیپل ہل، 1975۔

عبدالحلیم شرر، ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (گذشتہ لکھنؤ)، تدوین: محمد اکرام چغتائی،
لاہور، 2006۔

Scanned with CamScanner

سعید الدین

یہ سب تو

میرا کوئی نام نہیں
نہ کوئی وطن
نہ مذہب
نہ باپ نہ ماں ہے کوئی
یوں میرا ہونا
بہتوں کے نزدیک
مشکوک ہو گیا
پھر ہر طرف سے تھو تھو ہونے لگی
مارو اسے
گھسیٹتے پھرو اس کی لاش
ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں
کئی مٹھیاں بھنچیں
لاٹھیاں چلیں
تلواریں سونتی گئیں
بندوقیں داغی گئیں

Scanned with CamScanner

پر ساری تلواریں
لاٹھیاں
اور بندوقوں کی گولیاں
کچھ دور ہوا کو چیر کر
نیچے آن گریں

جس کا کوئی نام نہ ہو
نہ وطن
نہ مذہب
نہ کوئی والی وارث
اسے نشانے پر لانا آسان بھی تو نہیں
یہ سب کچھ تو
ہر ایک میں چھپا ہوا ہے
کچھ فرض کر لینا
حقیقت میں کچھ ہونا تو نہیں ہے
ہاں کسی کی موت فرض کی جاسکتی ہے
کسی بھی لاوارث قبر پر
کسی بھی نام کا کتبہ لگایا جاسکتا ہے

سب حرامی بچے
ایک ہو جائیں
مٹھیاں بھینچ لیں
لاٹھیاں تان لیں

Scanned with CamScanner

تلواریں سونت لیں
بندوقیں اٹھالیں
اور شست بھی باندھ لیں
تو بھی ان کا وار خالی ہی جانا ہے
خالی نہ بھی گیا
تو بھی
ہلاکت تو خود ان کی ہونی ہے
کیونکہ
یہ سب کچھ تو
ہر ایک میں چھپا ہوا ہے

کٹی پہاڑی

ہمارے شہر کی آبادی کے درمیان
کسی بھی سمجھوتے کے امکان کو مسترد کرتے ہوئے
شہر کے شمال مغرب میں
دور تک پھیلی ہوئی پہاڑی میں ایک شگاف ڈال دیا گیا ہے
پہاڑی کو کاٹنے کا یہ اچھوتا خیال
شہر کے کچھ معماروں کے ذہن میں کیا آیا
شہر کے مکانوں کے درودیوار
اس نئی تفریق کے شوروشر سے
تپ کر سرخ ہو گئے

Scanned with CamScanner

اور شہر کے اوپر منڈلانے لگے
قسمت آزماؤں کے عزائم
شہر کو اب نئے زاویوں سے دیکھا جانے لگا
اب اس پہاڑی میں
کئی ایک ایسے مقامات دکھائی دینے لگے ہیں
جہاں سے اسے مزید کاٹا
یا کمزور کیا جا سکتا ہے
پہاڑی کے کٹتے ہی
آس پاس کی آبادیوں نے اپنی حدود کو
نئے سرے سے ترتیب دے لیا ہے
کٹاؤ سے شہر میں ہوا کا دباؤ
غیر مستحکم ہو گیا ہے
گاڑیوں کے روٹ بدلنے لگے
جمی جمائی آبادی
متزلزل ہو گئی
بازاروں اور خریداروں کے رنگ روپ
اور چہرے مہرے تبدیل ہو گئے ہیں
لوگ شاہراہوں
مکانوں
پارکوں
اسکولوں اور عبادت گاہوں کو
یوں دیکھنے لگے
جیسے ان کے بیچ بھی انھیں

Scanned with CamScanner

شگاف دکھائی دینے لگے ہوں
کٹی ہوئی پہاڑی نے
ہم سب کے چہروں کے بیچ
ایک مستقل دراڑ ڈال دی ہے
ان معماروں سے زیادہ
جنھوں نے پہاڑی میں شگاف ڈالا ہے
ہم ہراس شے سے خوفزدہ ہیں
جس میں بظاہر کوئی شگاف یا دراڑ دکھائی نہیں دیتی
پر جس کے درمیان سے
مستقل جھانک رہی ہے
کٹی ہوئی پہاڑی

درباری مغنی

میں ایک دھتکارا ہوا
درباری مغنی ہوں
دربار سے دھتکار دیے جانے سے پہلے
میرے حلق میں سیندور کی ایک پوری شیشی
الٹ دی گئی ہے
اب میرا گلا
محض غذا کی نالی بن کر رہ گیا ہے
مجھے اپنے گلے کے سوز و ساز سے محروم کیے جانے سے زیادہ افسوس

Scanned with CamScanner

اس بات کا ہے
کہ میں اپنے معدے میں اتری ہوئی اشرفیاں
مروارید اور نیلم
شاہی محل میں تھوک کر نہیں آیا
ان سب نے میرے معدے میں اپنے لیے
کوئی گنجائش نکال لی ہے
اب میں کوئی سُرالا پنا چاہوں
تو یہ اشرفیاں
مروارید اور نیلم
میرے معدے میں دہکنے لگتے ہیں
جس طشتری میں مجھے
یہ اشرفیاں، مروارید اور نیلم پیش کیے جاتے تھے
اب اس طشتری میں
محل کے خواجہ سرا کے پالتو کتے کو
راتب دیا جاتا ہے
جس کے معدے میں کوئی چیز
زیادہ دیر نہیں ٹکتی
کبھی کبھی یہ کتا
خواجہ سرا کے پیر چاٹتے چاٹتے
بادشاہ پر بھونکنے بھی لگتا ہے
کاش میں ایک بار ہی ایسا کرسکتا

Scanned with CamScanner

خوبصورت موزے

تم نے میرے پہنچنے سے پہلے
اپنے خوبصورت موزے دھو کر
اپنی بالکنی میں الگنی پر
سوکھنے کے لیے ڈال دیے تھے
ایک پیاسی چڑیا
الگنی پر بیٹھی
اس کے قطروں کو
زمین پر گرنے سے پہلے ہی
اچک لیتی تھی
میری آہٹ پر
وہ پھر سے اُڑ گئی
تم نے بالکنی میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا
موزوں سے ٹپکنے والی بوندوں کو
میں تمھاری ہم آغوشی میں بھی
دیر تک سنتا رہا

جب تیز بھوک لگی ہو

جب تیز بھوک لگی ہو

Scanned with CamScanner

میں اپنے جسم سے کھیلنا شروع کر دیتا ہوں
بہت سادہ سا کھیل ہے یہ
اس کھیل میں ہمارا دل
بڑی آسانی سے
ایک پھولی ہوئی چپاتی میں تبدیل ہو جاتا ہے
اور ہمارا جسم
نوکیلے دانتوں کی ایک قطار میں
شاید آپ کبھی اس تجربے سے نہیں گزرے
شاید کبھی آپ کی آنتیں اینٹھ کر دوہری نہیں ہوئیں
شاید کبھی بھوک سے نڈھال ہو کر
آپ کے کسی دانت کی نوک
آپ کے اپنے ہونٹ میں پیوست نہیں ہوئی
شاید آپ کی زبان نے
اپنے خون کا ذائقہ نہیں چکھا
یہ باتیں آپ کے لیے عجیب ہیں
شاید ناقابلِ یقین بھی
لیکن بڑی آسانی سے ہر بات سمجھ آجاتی ہے
جب آدمی بھوکا ہو
اتنا بھوکا
کہ یہ اندازہ لگانے کے قابل ہی نہ رہے
کہ وہ
روٹی کی پھولی ہوئی چپاتی ہے
یا بھوک

Scanned with CamScanner

کہانیاں

یہاں ٹھیک اس جگہ
جہاں ایک چٹان ایک گہری کھائی پر جھکی ہوئی ہے
یہاں ایک چھتنار درخت تھا
وہ پرندے یہاں آتے تھے
جن کے بارے میں لوگوں میں
عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں
اس چٹان کے پہلو میں
ایک آتش کدہ ہے
جس میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے
جس سے اس کے چاروں اور بیٹھے لوگوں کے چہرے
اس قدر روشن ہو جاتے ہیں
کہ اس چھتنار درخت پر بیٹھے پرندے
خوفزدہ ہو جاتے ہیں
لیکن اب یہاں کوئی چھتنار درخت نہیں
آتش کدہ سرد ہو گیا
اور اس آگ سے روشن چہرے بھی
بجھ گئے
اب صرف کھائی کی طرف جھکی چٹان باقی رہ گئی ہے
یا وہ عجیب وغریب کہانیاں

Scanned with CamScanner

جو کھائی اور جھکی چٹان کے گرد چکر لگا لگا کر
اب بری طرح اکتا چکی ہیں

تنکا

یہ چھوٹی سی ندی تو محض
ندی کی ہلکی سی جھلک ہے
ندی کا پورا پاٹ دیکھنا ہو
تو میرے دل میں اتر کر دیکھو
جہاں سے اس کے سوتے پھوٹتے ہیں
لیکن میرے دل سے
ایک نہیں
کئی ندیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں
کبھی کبھی یہ سوتے خشک بھی ہو جاتے ہیں
اور دل میں دھول سی اڑنے لگتی ہے
دل ایک ریت کے ٹیلے کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے
لیکن یہ ریت تو بس اس کی اوپری سطح ہے
اس کی ریتیلی سطح کے نیچے
ایک دریا ہے
جو عام طور پر تو خاموش رہتا ہے
لیکن کبھی کبھی
ترنگ میں آجائے

تو گانے بھی لگتا ہے
کبھی کبھی اس کا کوئی بول
بے قابو ہو کر
ایک ندی کا تاثر دیتا ہے
اور ایک تنکا
دیر تک
اس کی سطح پر ہلکورے لیتا رہتا ہے

اجازت

وہ کہتے ہیں
میں کبھی زندہ نہیں تھا
اس لیے نہ وہ میری ہنسی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں
نہ آنسوؤں کے بارے میں
یا یہ کہ جب میں چلتا تھا
تو میرے پاؤں زمین پر ٹھیک طرح سے
پڑتے بھی تھے یا نہیں
انھوں نے ہمیشہ مجھے بے جان ہی پایا
ایسے
کہ میری نبض رکی ہوئی تھی
دل ساکت
اور جسم سیاہ پڑ چکا تھا

Scanned with CamScanner

لیکن میری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں
جن سے انھیں خوف آتا تھا
لیکن رفتہ رفتہ
ان کا خوف رفع ہوتا گیا
اس کا ثبوت یہ ہے
کہ وہ اپنی بے کار اشیا
میری طرف اچھال دیتے تھے
کبھی وصلی کا خالی ڈبا
عینک کی ٹوٹی ہوئی کمانی
یا بے تالے کی کوئی چابی
اگر چہ اس بات سے وہ پوری طرح آگاہ تھے
کہ ایسا کرتے ہوئے
وہ ایک لاش کی بے حرمتی کر رہے تھے
لیکن اب وہ اس بات کے گویا عادی ہو گئے تھے
ایسا کرتے ہوئے
انھیں کسی قسم کی جھجک
یا شرمندگی نہیں ہوتی تھی
شاید انھوں نے کسی وقت میری لاش کو
کہیں ٹھکانے لگانے کے بارے میں بھی سوچا ہو
پر ایسا کر نہ پائے ہوں
شاید کسی نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا ہو
شاید وہ میری کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئے ہوں
شاید وہ خود اپنی نبضیں ٹٹولنے

Scanned with CamScanner

اپنی دھڑکنیں سننے
اور اپنے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے
بری طرح خائف ہونے لگے ہوں
اپنے اس خوف پر قابو پانے کے لیے
شاید انھوں نے اپنی بیکار اشیا
میری طرف اچھالنی شروع کر دی ہوں
شاید یوں وہ اپنے لیے
کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈال رہے ہوں
جس میں انھیں
لاشوں کی بے حرمتی کی کھلی چھوٹ دے دی گئی ہو
میں ان کی کسی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کروں گا
کہ میرے مسلک میں
لاشوں کی بے حرمتی کی کوئی گنجائش نہیں
زندوں کی بھی نہیں

ٹریپ

سانپ کا زہر
ہمارے جسم میں داخل ہو کر
مستی میں نعرہ لگاتا ہے
خون کی ہر بوند میں اترتے ہوئے
لطف و انبساط سے

Scanned with CamScanner

ناچنے لگتا ہے
ہمارا بدن
اس کے لیے
تمام شریانوں کے در کھول دیتا ہے
مدافعت کے لیے بنائے گئے تمام مورچے
منہدم ہو جاتے ہیں
چند گھنٹوں میں
سارا جسم تاراج ہو جاتا ہے
تھکن سے چور زہر
ایک نیند لینے کا فیصلہ کرتا ہے
لیکن اس کی نیند جلد ہی ٹوٹ جاتی ہے
ہمارے بدن کا تعفن اس کی برداشت سے باہر ہے
جسم کے اندھیرے میں
سانپ کا زہر
ٹکریں کھاتا پھرتا ہے
اسے جسم سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا
وہ دوڑ دوڑ کر ہانپ جاتا ہے
ایک مردہ بدن میں
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر
بالآخر
خود بھی مر جاتا ہے

نظم

Scanned with CamScanner

ایک کے بعد ایک
کئی موتیں مر کر
اب میں زندہ ہو گیا ہوں
ایک میں ہی نہیں
یہاں میرے ارد گرد
اور بہت سے
کئی بار
موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں
کچھ ایسے بھی ہیں
جو ایک بار مرنے کے بعد
دوبارہ زندہ نہ ہو سکے

کئی موتیں مرنے
یا ہر بار جی اٹھنے پر
ہمارا کوئی اختیار نہیں
ہم کیونکر زندہ رہے
اور ایک بار مرنے کے بعد
کون سی چیز ہمیں پھر سے زندگی کی طرف لے آئی
ہمیں نہیں معلوم
لیکن ایک بات تو طے ہے
انسان دو طرح کے ہیں
ایک بار مرنے والے

Scanned with CamScanner

اور بار بار مرنے والے
یہ بھی طے سمجھیے
کہ ایک بار مرنے والے
مرنے سے پہلے زندہ ضرور تھے
بار بار مرنے والوں کے بارے میں
یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی

معصومیت

ہمارے ہاں بچے کو
جو ابھی پوری طرح کھڑا ہونا بھی نہ سیکھا ہو
پستول ہاتھ میں دے دی جاتی ہے
دو چار بار اسے زمین پر گرا کر
اسے پستول سنبھالنا
اور پھر ہاتھ کی ذرا سی جنبش سے
اسے انگلیوں کے درمیان
پھرکی کی طرح گھمانا بھی آ جاتا ہے
لڑکپن پھلانگنے سے پہلے
اسے دو ایک آدمی گرانا ہوتے ہیں
بڑے ہونے پر اس کے ہاتھوں میں
اصلی بندوق
یا مشین گن تھما دی جاتی ہے

Scanned with CamScanner

اب اس سے توقع کی جاتی ہے
کہ وہ دو ایک افراد کو گرانے پر اکتفا نہیں کرے گا
بلکہ کئی انسانوں کے خون سے
اپنے ہاتھ رنگے گا
مجھے اعتراف ہے
ہمارے ہاں
سب لوگ ایسا نہیں کر پاتے
کچھ تو کھلونا پستول ہی سے
اپنی ناپختہ عمر میں
خود کو ہلاک کر لیتے ہیں
کچھ ایسے بھی ہیں
جو سچ مچ کی پستول کو بھی
کھلونا ہی سمجھتے ہیں
اس لیے انھیں
اس کے لائسنس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی
جنھیں وہ ہلاک کرتے ہیں
اکثر ان میں ان کے قریبی دوست
یا عزیز و اقارب ہوتے ہیں
انھیں ہلاک کرنے کے بعد
یہ دیکھ کر وہ حیران رہ جاتے ہیں
کہ ان کے ہاتھوں میں
سچ مچ کی پستول آ کیسے گئی
اور وہ کب سے

Scanned with CamScanner

کسی کے نشانے پر تھے

چاقو کا دستہ

میں ابھی چھوٹا تھا
کسی نے میرے ہاتھ میں چاقو تھما دیا
میں نے اپنی عمر کی لکیر کو
چھ جگہ سے کاٹ ڈالا
اور محبت کی لکیر
چاقو کی نوک سے کھرچ دی
چاقو کا دستہ مجھے کچھ بے ہنگم سا محسوس ہوا
اسے میں نے
ہتھوڑے کی ضرب سے
چاقو سے علیحدہ کر دیا
ذرا سی دھار لگانے کے بعد
اب اسے دونوں طرف سے استعمال کیا جا سکتا تھا
مجھے یاد نہیں
میں نے اسے کتنی جگہ استعمال کیا ہوگا
البتہ اس سے میری ہتھیلیوں پر
کئی بے ضرورت سی لکیریں پڑ گئیں
اور ایک ہاتھ کی تمام انگلیاں
تلف ہو گئیں

Scanned with CamScanner

ہتھیلی کی بے ضرورت لکیروں نے
میری بعد کی زندگی میں
کئی مشکلات پیدا کیں
سب سے بڑی مشکل
تو خود یہ چاقو تھا
جو اپنی دو طرفہ دھار سے
مجھے زخمی کر رہا تھا
ایک مشکل اور ہے
ایسا ہی ایک چاقو
ایک دن آئینے میں میرے عکس کو
دو مساوی ٹکڑوں میں تقسیم کر گیا
اور میں ٹھیک سے یہ بھی نہ دیکھ سکا
کہ اس کا دستہ کس کے ہاتھ میں تھا

❁❁

Scanned with CamScanner

احمد آزاد

جو میرے مرنے کا تماشا نہیں دیکھنا چاہتی

میں جس دن پیدا ہوا
اسی دن سے مر رہا ہوں

وہ ٹیبل پر پیالے میں
تلخ محلول رکھا تھا
اب نہیں ہے

وہ اک دریا بہتا تھا
اسے خشک کر دیا گیا ہے

وہ چھت سے رسی ٹنگی تھی
ہٹا دی گئی ہے

میں تمام عمر اپنوں کے نرغے میں رہا ہوں
مجھے میرا پیالہ

Scanned with CamScanner

میرا دریا
میری رسی
تھوڑی دیر کے لیے
واپس کیے جائیں
میں اس پیالے کو توڑ کر
اس کی مٹی سے
ایک دل بناؤں گا
جس میں کوئی تلخ یاد نہیں ہوگی

میں دریا میں اپنے خواب ڈال دوں گا
انھیں میری ضرورت نہیں

میں رسی سے
اُس کشتی کو باندھوں گا
جس میں ایک عورت
پھولوں کی ٹوکری لیے
بیٹھی ہے
جو میرے مرنے کا تماشا نہیں دیکھنا چاہتی

خزاں کے آتے آتے

میرے پاس

Scanned with CamScanner

بہت سارے خواب
اور بہت سارے سیب ہیں

ایک افرودیتی کے لیے
ایک سیفو کے لیے
اور ایک اینا کوزی کووا کے لیے
جس نے آئینے کے سامنے
اپنی چھاتیوں کا
ٹینس کی گیند
یا دھرتی سے
موازنہ نہیں کیا ہوگا
میرے تمام خواب
ان کے لیے
جن کے آنسوؤں سے میری نظمیں بنیں
میری محبوبہ کے لیے
میرے پاس نہ کوئی خواب ہے
اور نہ سیب
خزاں کے آتے آتے
میں اُس درخت کے سائے سے
اٹھ کر چلا جاؤں گا
جہاں خواب اور سیب
اُگتے ہیں

Scanned with CamScanner

یہاں لکھنا منع ہے

پاکیزہ ٹھہرائی جانے والی
دیواروں پر لکھا ہے
یہاں لکھنا منع ہے
وہیں لکھ دیتے ہیں لوگ
بے شرمی سے گالیاں
بے ہودہ نعرے
فرسودہ مذہبی احکامات

میں لکھ دوں وہاں
وہ لفظ
جو میرے اندر مر رہے ہیں
پر لکھ نہیں سکتا
دیواریں روکتی ہیں مجھے
روکتی ہیں
میرے اندر
دیواروں کو گرنے سے
ایک جنرل کہتا ہے
یا عوام کا نمائندہ کہتا ہے
چپ رہو

Scanned with CamScanner

یا
گڑگڑاتے ہوئے بولو
میں لکھ دوں
میری ماں کو میری محبوبہ ہونا چاہیے تھا
اور میرے باپ کو
میری آنکھوں سے دور

لکھ دوں
سفاک سبب
اپنے دن میں دراڑ پڑنے کا
جو ایک دن آپ ہی آپ
کھنڈر میں بدل جائے گا

میں لکھ دوں
وہ سب
جو یہاں لکھنا منع ہے

وہی درندہ

وہی درندہ
مجھے جنگل سے شہر لے آیا
یہاں اُس نے

Scanned with CamScanner

مسکرانا سیکھا
وہ جو کرتا رہا
میں دیکھتا رہا
اور اپنے اندر حیرتیں جمع کرتا رہا

اس نے ایک عورت کی چھاتیاں
بھنبھوڑ ڈالیں
جس نے اس کے عضوِ تناسل
اور دل کو تھکا دیا ہے

اس نے آسمان کی طرف دیکھا
اور تھوک نگل لی
وہاں اسے
کوئی نظر نہیں آیا

مجھے پتا نہ چلتا
وہ لفظوں میں چھپ جاتا
وہیں سے
نحوست سے مسکراتا
دکھائی پڑتا
کبھی کبھی
میں نے اس سے
جان چھڑانی چاہی

Scanned with CamScanner

جب میں پھول لے رہا تھا
اُس لڑکی کے لیے
جس کا دل
ایک پھول سے بھی زیادہ
نرم اور ہلکا تھا

میں نے اس سے
جان چھڑانی چاہی
جب دھوپ دیواروں سے
اترنے کا نام نہیں لیتی تھی
اور لمحے اونگھتے تھے
میں ان دھوپ بھری دیواروں میں
اسے دفن کرنا چاہتا تھا

میں نے اس سے جان چھڑانی چاہی
جب میں نے پہلی بار
سچ بولنا سیکھا
یہ اسے پسند نہیں آیا
اس نے کرودھ میں
آئینہ ایجاد کیا
اور میرے سامنے رکھ دیا
میں نے دیکھا
وہی درندہ

Scanned with CamScanner

میں خود

تنہائی

تنہائی
آدمی کی آنکھیں
کھول دیتی ہے

اُن منظروں پر
جو بے یقینی کی دھند میں
لپٹے ہوتے ہیں

ان دوستوں پر
جو محض سائے ہیں
اندھیرے میں لہراتے ہوے

اُن لمحوں پر
جو آدمی کی روح کو
کرب کا آموختہ
سناتے ہیں

ان آسمانوں پر

Scanned with CamScanner

جہاں کوئی نہیں

پرندے

نہ دھواں

بادل

نہ بارش

پہلی محبت کی یاد

نہ خدا

❁❁

Scanned with CamScanner

۶۹

قیمت

۲۸۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner